سبز رتوں کا پہلا پھول

راحت جبیں



بیتے دن

انسانی ذہن بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ ہر بیتے تلخ و شیریں لمحے کو یاد بنا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتا ہے۔ یادیں جو کبھی دھیان کے طاقچے میں چراغ بن کر لو دیتی ہیں تو کبھی کتاب میں رکھے تتلی کے پروں کی طرح اپنا نشان چھوڑ دیتی ہیں۔

میرے نزدیک ''یاد'' کتاب میں بہت پیار سے رکھا ادھ کھلا گلاب ہے۔

گلاب، جو مرجھا جاتا ہے مگر اس کی خوشبو ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔

اس کتاب کو مرتب کرتے ہوئے میری آنکھ میں نمی سی اُتر گئی۔ مجھے لگا، میں نے اپنی زندگی کا ایک باب اس میں بند کر دیا ہے۔ وہ وقت جب سُکھ چین پر اُترتی خزاں اور آنگن میں بکھرے زرد پتے مجھ سے ''سبز موسم چُرا لیے ہم نے'' لکھوا دیتے تھے۔ جب تیز برستی بارش میں ہم بہنیں صحن میں تتلیوں سی اُڑا کرتیں...... اور چولہے پر امی گرما گرم پُوڑے تلتی تو برستا پانی ''میں تمہارا ساون ہوں'' گنگناتا۔

کالج کے وسیع و عریض فوارہ گراؤنڈ میں سکھیوں کے سنگ فرحت عباس شاہ کی شاعری اور اونچے لمبے درختوں سے ہاتھ چھڑا کر سبز گھاس میں گم ہوتی سپید سنبل کی رُوئی ''سبز رُتوں کا پہلا پھول'' تخلیق کرتی۔

سبز دروازوں پر سپید جالی کے پردے لہراتے، سرخ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر شعاع اور خواتین ڈائجسٹ پڑھتے، عامر سلیم، وائٹل سائنز کی دُھنوں پر مرتے، جگجیت کی غزلوں پر سر دُھنتے، جب سبز چوبارے کی کھڑکی کھلتی تو پتہ چلتا، خزاں رخصت کو ہے...... ''سرخ گلابوں کے موسم'' خود بخود میرے چہار سُو بکھر جاتے۔

میں نے یہ کتاب فاخرہ کے نام کی ہے......اور کسی کے نام کر ہی کیسے سکتی تھی......

کہ "سبز رُتوں کا پہلا پھول" اُسی کے سنگ چنا تھا۔

میں شکر گزار ہوں القریش پبلی کیشنز کی، جو اسے کتابی شکل میں لائے۔ اور خصوصاً رامس تنویر احمد کی، جنہوں نے اس کتاب میں موجود کہانیاں ڈھونڈ نکالیں۔ ورنہ شاید میں یہ یادیں مرتب نہ کر پاتی۔

اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیے گا۔

دُعا گو

راحت جبیں

6-12-2011

سبز رتوں کا پہلا پھول

بارش کیا ہے؟

کون سی بارش...... وہ جو اندر برستی ہے؟

سردیوں کی بارش......

سرما کی بارش...... اس نے کھڑکی کھول دی۔ نم ہوا کے جھونکے نے بڑھ کر اس کے گال پر بوسہ دیا اور کمرے کی خاموش فضا میں بکھر گیا۔ آسمان سے برستی موتیوں کی مالا تھی۔ ہوا بادل سے موتیوں کی مالا چھین کر دھرتی پر بکھیر دیتی۔ سارے موتی ایک تواتر سے ٹوٹتے اور گھاس میں گم ہو جاتے۔ سارا آسمان سرمئی گھلے ملے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا اور اب آسمان سے زمین تک بوندوں کی چادر سی گر رہی تھی۔ بنا کسی شور کے، ایک مدھم سی آہٹ، ایک ہلکی سے چھنک کے ساتھ۔

"تمہارے لئے سرما کی جھڑی کیا ہے......؟"

ایک اور جھونکا اپنے پروں پر سوال باندھے اس کے چہرے پر بکھر گیا۔ اس نے ایک بار پھر چڑیوں کے غول کو اپنے بھیگے پروں کے ساتھ شاخیں اوڑھتے دیکھا۔

"بارش آسمان سے زمین کا رشتہ ہے۔

ہوا کی بادل سے شرارت ہے۔

بوندوں کی پتوں سے سرگوشی ہے۔"

"اور......؟"

"گوری کے پاؤں میں پڑی پازیب ہے۔

کسی رازداں سہیلی کی خوبصورت سی بات ہے۔

کسی کنواری کو چھوتی محبوب کی پہلی نظر ہے۔"

"اور......؟"

"صحن میں کھیلتی ننھی سی بچی ہے۔

جنگل میں ناچتا مور ہے۔

زمین کی حسرت' کھلیانوں کی دعا ہے اور......اور خدا کی اس زمین پر ڈالی رحمت کی نظر ہے۔"

ہاں......اسے بارش ایسی ہی لگتی تھی۔ دل میں پھوٹتی اولین چاہت جیسی خوبصورت' انوکھی اور ان اچھوئی اس کا دل چاہتا' ان بوندوں کو ہتھیلیوں میں بھر کر پی جائے۔ ان ہواؤں کو جھومتے درختوں سے چھڑا کر اپنے آنچل سے باندھ لے۔ اس کا وجود ان بوندوں میں گھل مل جائے۔

"کاش میں بادل کا ایک ٹکڑا ہوتی اور پوری دھرتی پر برس جاتی۔"

اس نے دونوں ہتھیلیاں دریچے کی چوکھٹ پر جمائیں اور ذرا سی آگے جھکی۔ چوکھٹ سے لپٹی سرخ پھولوں کی بیل اس کے ماتھے کو چھونے لگی۔ جس پر اٹکے شفاف قطرے اس کے ماتھے کو چھو کر' کسی کی آنکھ میں اتر گئے۔ بس ایک پل لگا تھا اور وہ سارے خوبصورت احساسات و جذبات یک لخت بدل گئے تھے۔ اسے لگا پہاڑوں پر کھلے پھولوں پر برف جم گئی ہے۔

"پتا نہیں بارشوں کا موسم اس گھر کے مکینوں کے اندر کیوں برس جاتا ہے۔"

اس نے لمبے لمبے درختوں کی قطاروں میں بھٹکتے ہوئے آنی کو دیکھا۔ نجانے کون سا دکھ تھا' جو ان کے قدموں سے لپٹ کر کہیں ٹھہرنے نہ دیتا تھا۔ نجانے کون سی آگ تھی' جو اس سرد موسم میں بھی بجھنے میں نہ آتی۔ ان کا تن من سلگائے رکھتی۔ وہ یونہی بھٹکتے بھٹکتے ایک ایک کمرے میں جھانکنے لگتیں۔ ایک ایک فرد کا چہرہ کھوجتیں۔

"کوئی پریشان ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتیں اور فون کے نمبر ڈائل کرنے لگتیں۔

اس نے نظریں چرا کر آسمان کو دیکھا۔ وہ چونک گئی۔ آسمان اپنی ہیئت بدل رہا تھا اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک بڑی سی آنکھ بن گیا۔ سرمئی بادل آنکھ کی شفاف سطح پر بجھے ہوئے خوابوں کی راکھ اڑانے لگے۔ بوندوں کی جگہ آنسو تھے جو تواتر سے برس رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ بڑھائے اور کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ مگر ہوا بپھر گئی تھی۔ کھڑکی کے پٹ سر پٹخنے لگے اور بوندیں پتھروں کی طرح برسنے لگی تھیں۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر اس چھوٹی سی راہداری کے درمیان میں رک گئی۔ سامنے والے بند دروازے کے دوسری طرف سسکیاں بلند ہو رہی تھیں اور بند دروازے سے لپٹ کر روتی تھیں۔

نیچے آنی تھیں' بے چین' مضطرب اور وحشت زدہ۔

سامنے بند دروازے سے لپٹی سسکیاں تھیں۔

اور عقب میں غضب ناک ہوا اور سب لوگ نجانے کہاں تھے۔ رانیہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کہاں جائے۔

* * *

آتش دان میں آگ سلگ رہی تھی اور اس کی روشنی کمرے کی نیم تاریکی سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ ان میں عجیب سی باہمی رفاقت کا سلسلہ تھا کہ نہ تاریکی روشنی پر غالب آ رہی تھی اور نہ ہی روشنی تاریکی کا گلا گھونٹ پا رہی تھی۔ کمرے کے کونوں میں گھسا اندھیرا آنکھیں مل مل کر چٹختی آگ کو دیکھ رہا تھا۔ اسی آتش دان کے پاس آفاق بھائی کی رائٹنگ ٹیبل پڑی تھی۔ آفاق بھائی وہاں نہیں تھے اور ٹیبل پر لیمپ کے پاس وکٹر ہیوگو کا شہرہ آفاق ناول "La misereble" اوندھا پڑا تھا۔ وہ جب بھی نظر اٹھا کر ٹیبل کی طرف دیکھتی۔ بوڑھا پادری ناول کے صفحوں سے نکل کر کرسی پر آ بیٹھتا اور اپنے چہرے پر چھائے سکھ چین وطمانیت کے تبسم کے ساتھ اسے دیکھنے لگتا تھا۔

"آفاق بھائی کہاں ہیں؟"

"سوئٹزر لینڈ گئے ہیں......" عمر نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ وہ اچھل پڑی۔

"ہیں کب......؟"

وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔ اس نے جھنجلا کر کمبل اتار پھینکا۔ تب ہی آنی آ گئیں۔ ٹچ ٹچ کی آواز کے ساتھ ہی کمرہ تیز روشنیوں سے جھلملا اٹھا۔ تاریکی کو کہیں منہ چھپانے کی جگہ نہ ملی۔ تو کھڑکی سے چھلانگ لگا کر لان کے کونے کھدروں میں چھپنے لگی پھر چھت پر چڑھ گئی۔

"کتنی بار کہا ہے۔ اتنی کم روشنی میں ٹی وی مت دیکھا کرو۔" آنی نے رسانیت سے کہا۔

"آنی! کھانا کب تک ملے گا۔ میرا ارادہ چوہوں کے ساتھ دوستی کا ہرگز نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مستقل یہیں رہائش پذیر ہو جائیں......" عمر پیٹ پر ہاتھ مار کر بولا۔ آنی مسکرا دیں۔

"یہی کہنے آئی ہوں' کھانا لگ گیا ہے۔"

"تھینک گاڈ۔" وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر آئے۔ آفاق بھائی اور عالیہ آنٹی پہلے ہی سے وہیں موجود تھے۔ آغا جی کا انتظار تھا۔ رانیہ بیٹھنے لگی۔ جب آنی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"پانی کا جگ اٹھا لاؤ......"

"خیال رہے' پانی کے اندر جگ نہیں' بلکہ جگ کے اندر پانی ہو اور وہ بخیر عافیت ٹیبل تک پہنچ بھی جائے۔" عمر نے چھیڑا۔ وہ پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم خود لے آؤ۔"

"رانیہ! دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا' کتنی بار کہا ہے۔کم بولا کرو۔ دوبدو جواب دیتی ہو بھائیوں کو۔" آنی نے ایک پل میں اسے لتاڑ کر رکھ دیا۔حمزہ کے دانت نکلنے لگے تھے۔خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"آنی! وہ بھی تو......"

"پانی لے کر آؤ۔" انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور ان کے اس لہجے کے بعد رانیہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔سو پاؤں پٹخ کر کچن میں چلی آئی۔آفاق بھائی نے سر اٹھا کر اسے جاتے دیکھا۔پھر حمزہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیوں تنگ کرتے ہو۔"

"میں نے تو مذاق کیا تھا......" وہ لاپروائی سے بولا۔

"مذاق وہ ہوتا ہے جسے خود بھی اور دوسرے بھی انجوائے کریں۔" وہ رسانیت سے بولے۔

"وہ حرکتیں ہی ایسی کرتی ہے۔ یہاں لڑھک گئی' وہاں پٹخ گئی۔" وہ اپنے قافیہ مل جانے پر خود ہی ہنسنے لگا۔مگر اس کے قہقہے کا گلا آغا جی کی کھنکھار نے گھونٹا تھا۔رانیہ نے جگ لا کر درمیان میں رکھا۔حمزہ نے باقاعدہ جھانک کر' اس میں پانی دیکھا تھا۔وہ چڑ کر سامنے رکھے ڈونگے کو گھورنے لگی۔آنی نے ڈونگہ اٹھا کر آغا جی کے سامنے رکھ دیا۔بھنا ہوا چٹپٹا قیمہ تھا۔مٹر پلاؤ' سلاد' رائتہ اور چپاتی۔

"فون کا بل دیکھا ہے؟" سالن ڈالتے ڈالتے آغا جی نے باری باری سب کو گھورا۔

"دیکھا ہے آغا جی! وہیں فون اسٹینڈ پر پڑا ہے۔" رانیہ نے جلدی سے جواب دیا۔

آغا جی نے اسے گھور کر دیکھا اور اس کا دل ٹیبل کے نیچے گھس جانے کو چاہا۔اپنے جلد بول اٹھنے پر شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔اس نے پلیٹ کی سطح پر نظریں یوں گاڑی تھیں گویا اس وقت صرف یہاں پلیٹ اور اس کے سوا کوئی موجود نہیں۔

"میرے پاس کوئی خزانے نہیں جو یوں تم لوگوں کے اللے تللوں میں ضائع کروں۔ فون کو تالا لگاؤ اور چابی مجھے دو۔" یہ حکم اکثر جاری ہوتا تھا۔اور یہ واحد حکم تھا جسے ماننے میں آنی کو تامل تھا اور وہ آنے بہانے ٹال دیتی تھیں۔

"آپ تو سارا دن زمینوں پر ہوتے ہیں۔اگر کوئی ایمرجنسی پڑ جائے تو......" اس وقت بھی وہ آہستگی سے کہہ رہی تھیں۔

"تم نے امریکہ فون کیا تھا؟" آغا جی نے کڑی نگاہوں سے گھورا۔آنی نے خاموشی

سے سر جھکا لیا' رانیہ کو یاد آیا۔پچھلے مہینے موسم کی پہلی بارش ہوئی تھی۔آغا جی گرج چمک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"میں تابی کو بلا کر لاتی ہوں......" رانیہ کا دل اچاٹ ہوگیا تھا۔کوئی نہیں بولا تھا۔وہ جلدی سے دائیں طرف سے اوپر جاتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

دروازہ بند تھا۔اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔مگر اندر چپ کی برف گر رہی تھی۔اسے لگا تابی اس برف میں پوری طرح دھنس گئی ہے۔اس نے گھبرا کر دروازے پر ہاتھ رکھا' وہ بے آواز کھل گیا۔رانیہ نے گردن اندر گھسا دی۔کمرے کی سیلن زدہ فضا میں نیم تاریکی کا راج تھا۔تابی بیڈ پر بیٹھی سامنے والی دیوار کو گھور رہی تھی۔آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں۔یوں لگتا تھا ان آنکھوں میں جاگنے والے سارے منظر' نمکین پانیوں کی زرد جھیل کی زد میں آکر ڈوب گئے ہیں۔

رانیہ نے گھبرا کر پورا دروازہ کھول دیا اور زور سے پکاری۔

"تابی۔"

"کیا ہے......؟"

"کھانا کھا لو......"

"مجھے بھوک نہیں......"

"اس طرح تو مر جاؤ گی تابی......" اس نے کہتے ہی زبان دانتوں تلے دبالی۔سچ کہتے تھے سب کہ وہ بولنے سے پہلے کبھی نہیں سوچتی۔

"چلو نا......" اس کے لہجے میں اصرار تھا۔تابی نے نفی میں سر ہلا دیا تو اسے مایوس ہی پلٹ جانا پڑا۔سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔کسی نے بھی نہیں پوچھا کہ تابی آرہی ہے یا نہیں۔رانیہ نے بھی تھوڑا قیمہ نکال کر چپاتی ہاتھ میں لے لی۔کھانے کے بعد آغا جی چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔حمزہ اور عمر نے پھر سے ٹی وی کھول لیا۔آفاق بھائی نے رائٹنگ ٹیبل سنبھالی۔عالیہ آنٹی عشاء کی نماز پڑھنے چلی گئیں۔آنی نے اسے برتن سمیٹنے پر لگا دیا۔جب انہیں دھونے لگی تو انہوں نے روک دیا۔

"تم تابندہ کو کھانا دے آؤ۔"

"آنی! وہ نہیں کھاتی ہیں۔آپ لے جائیں۔"

"وہ مجھ سے نہیں لے گی۔" آنی آہستگی سے بولیں۔تو وہ نل بند کر کے ان کی طرف پلٹی۔پھر جھجکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تابی آپ سے خفا ہیں۔"

''ہاں......'' سالن پتیلی میں منتقل کرتے ہوئے وہ رک سی گئیں۔

''کیوں......؟''

آنی نے پلٹ کر اسے سخت نگاہوں سے دیکھا۔

''کتنی بار کہا ہے بلاوجہ سوالات مت کیا کرو۔''

رانیہ نے تیزی سے ٹرے میں چاول' سلاد' رائتہ اور چپاتی رکھی۔ اس سے قبل کہ وہ ٹرے اٹھا کر نکل جاتی۔ آنی جھنجھلا کر بولی تھیں۔

''ایک لگاؤں گی۔ دماغ کہاں رہتا ہے۔''

رانیہ پہلے حیران پھر پریشان ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے پلیٹ میں سالن نکال کر پلیٹ ٹرے میں پٹخ دی۔ وہ شرمندہ سی اوپر چلی آئی۔ حسب عادت کچھ دیر دروازے سے باہر رکنے کے بجائے فوراً اندر داخل ہوگئی۔ وہ اب تھک کر لیٹ گئی تھی۔

''تابی! اٹھیں' کھانا کھالیں۔''

''میں نے کہا تھا نا' مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''آغا جی نے بھجوایا ہے۔ تم نہیں کھاؤ گی تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔'' اس نے دانستہ آغا جی کا نام لیا۔ آنی سے تو وہ خفا تھی۔ حسب توقع وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور جب پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکالے۔ تب وہ اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

''تابی! تم نیچے کیوں نہیں آتی ہو۔''

تابندہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بس حلق میں چاول اٹک گئے تھے۔

''تم......لوگوں سے ڈرتی ہونا۔'' رانیہ نے ڈرتے ڈرتے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

''تم جاؤ یہاں سے...... برتن میں خود رکھ دوں گی کچن میں۔'' اس کا لہجہ بہت خراب تھا۔ رانیہ منہ بنا کر اٹھ آئی۔

''سب کے سامنے آنے کی ہمت نہیں۔ اس وقت آئیں گی۔ جب سب اپنے اپنے کمروں میں گھس جائیں گے۔ تب باہر نکلیں گی۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

آنی سارے کام ختم کر کے آچکی تھیں اور اب دونوں ہاتھ گود میں دھرے نجانے کن سوچوں میں گم تھیں۔

''لاؤنج سے فون سیٹ اٹھالاؤ۔''

''آنی۔'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر آنی نے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کلستی نیچے اتر آئی۔ عمر اور حمزہ جا چکے تھے۔ آتش دان میں آگ بجھنے لگی تھی اور آفاق بھائی

لیمپ جلائے کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھے...... انہوں نے سر اٹھا کر رانیہ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تار نکال کر فون سیٹ اٹھایا۔

''اتنی ڈانٹ کھا کر بھی آنی کو صبر نہیں آتا۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو کبھی فون کو ہاتھ بھی نہ لگاتی۔'' ریسیور پھسل کر اس کے گھٹنے سے ٹکرایا۔

''افوہ......'' ریسیور اٹھا کر پلٹی تو تار اسٹینڈ سے لپٹ گیا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' فون گود میں لے کر بیٹھ گئی اور کھینچ کھینچ کر تار نکالنے لگی۔

''آرام سے بھئی۔'' آفاق بھائی کی نرم آواز آئی تھی۔

''امریکہ فون کریں گی آنی......'' اس نے گویا شکایت کی۔

''تو......؟'' وہ مدھم سا مسکرائے۔

''ابھی کھانے پر کتنی ڈانٹ پڑی تھی۔ میں نے ضرورتاً بھی کسی فرینڈ کو لوکل کال کرنی ہو تو آنی سر پر کھڑی ہوتی ہیں کہ بس کرو......بس کرو......'' اس نے تار نکال لیا تھا۔

''سارا غصہ اسی بات کا ہے۔'' ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ رانیہ نے انہیں کبھی کھل کر ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی خوشی کا اندازہ بس ان کی مسکراہٹ سے ہی ہوتا تھا۔ ہلکی مسکراہٹ...... گہری مسکراہٹ...... پھر اس سے بھی گہری...... جب ان کی آنکھیں بھی مسکراتی تھیں۔

''بھائی! آنی کو صرف بارش میں ہی فون کرنا کیوں یاد آتا ہے...... صبح سے ماموں اور پھپھو کو بھی فون کر چکی ہیں۔''

''فون دے آؤ۔ ورنہ آنی ڈانٹیں گی۔'' وہ کتاب کے صفحے پلٹنے لگی' اور اس کا سوال بھی یونہی کسی صفحے میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اوپر آگئی۔ فون آنی کے پاس رکھ کر پلگ لگا دیا۔ ابھی اپنا تکیہ درست کر رہی تھی۔ جب آنی نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں پیپر نہیں دینے......''

''دینا ہیں......'' اسے پتا تھا اب اگلا حکم کیا جاری ہوگا۔ سو اندر ہی اندر اپنے غصے کو دباتے ہوئے الماری کھول کر کتابیں نکالنے لگی۔

''آفاق کے پاس چلی جاؤ۔''

حکم کی تعمیل کے سوال کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر آفاق بھائی ہنس دیئے۔

* * *

رانیہ کتابیں اٹھا کر باہر نکل آئی۔ رات دیر تک برسنے والے بادل نہ جانے کس دیس کا رخ کر گئے تھے۔ آسمان بالکل صاف اور دھوپ کسلمندی سے برہنہ تن درختوں کی شاخوں پر

جھول رہی تھی۔ ہوا ساری رات شور مچانے کے بعد اب اپنے ہی بازوؤں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ ٹوٹی ہوئی شاخیں، چڑیوں کے گھونسلے، تتلیوں کے پر، سرخ روش پر زرد و گیلے پتوں کا فرش بچھ گیا تھا۔

"رات اتنی بارش ہوئی تھی۔"

رانیہ کی آواز پر آفاق نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دیئے۔ صبح سے آنی ملازمہ کو ساتھ لگائے گھر صاف کروا رہی تھیں اور رانیہ کو ساتھ لگایا تھا۔ جب بھی وہ سر پر کھڑے ہو کر کام کرواتیں، رانیہ سے ڈھیروں ڈھیر غلطیاں ہوتی تھیں اور کسی بھی غلطی کو نظر انداز کرنا آنی کی سرشت میں نہ تھا۔ ایسے میں وہ پزل ہو کر مزید گڑبڑ کر دیتی۔ اب بھی ڈھیر ساری ڈانٹ کھانے کے بعد انہوں نے رانیہ کو کتابوں سمیت دفع ہو جانے کو کہا تھا اور رانیہ نے بھی ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

"آفاق بھائی کے پاس چلی جاؤں"

ان کی اجازت پاتے ہی وہ باہر بھاگ آئی تھی۔

کسی کیاری میں سے بابا ملا برآمد ہوا۔ تہبند، کرتے پر لمبا لنڈے کا اوورکوٹ، سر پر مفلر لپیٹے ہوئے۔ وہ ہمیشہ جھک کر چلتا تو اس کی لمبی سفید داڑھی سینے کو چھوتی رہتی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکڑی رہتیں۔ اس کے کُب کی بنا پر عمر کہتا تھا۔

"بابے کی اٹھنی گم ہو گئی تھی۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ حال ہو گیا۔"

وہ بار بار اس سے پوچھتا۔

"بابا! تمہاری اٹھنی نہیں ملی۔"

جواباً بابا مُلّا اسے بری طرح گھورتا۔ وہ زیادہ تنگ کرتا تو ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے لگ جاتا۔ بابا ملا کون تھا، کہاں سے آیا تھا۔ کچھ خبر نہیں۔ بس وہ برسوں سے یہاں ملازم تھا اور عیسائی تھا۔ سارا دن ان ہی پھول پتوں کے درمیان گزار دیتا۔ محبتوں سے سینچتا تھا۔ ان تناور درختوں کو اس نے بیجوں کی شکل میں بویا تھا۔ آج اس کی کمر جھک گئی تھی اور یہ درخت سینہ تانے، بازو پھیلائے آسمان چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ حقہ گڑگڑاتے ہوئے وہ ہمیشہ ایک بات بہت حسرت سے کہا کرتا تھا۔

"کاش مرنے کے بعد میرا وجود ان کیاریوں میں بیج بن کر بکھر جائے۔"

تب رانیہ بہت غور سے کیاریوں کو دیکھتی۔ مٹی ہٹتی اور اسے لگتا۔ ہر طرف بابے ہی بابے اگ آتے ہیں۔ لمبی ڈاڑھیوں اور جھکی ہوئی گردنوں والے۔ وہ جھرجھری لے کر رہ جاتی۔

"ہاں، تم کو رات کو کمبل اوڑھ کر سو گئی ہو گی۔ تمہیں کیا خبر رات کو کیسا طوفان آیا تھا۔"

بابا ملا کھرپی لہراتے ہوئے بولا۔ وہ رات کو جلد ہی سو گئی تھی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہیں تھی۔ اس کے ساتھ والے بیڈ پر پڑے وجود میں کیسے کیسے طوفان اٹھے تھے۔ بلو آئی تھی اور لمبے تنکوں والی جھاڑو کے ساتھ روش پر گرے پتے سمیٹنے لگی۔ رانیہ اب بابا سے یہ سوال جواب کر رہی تھی۔ آفاق دیکھ رہے تھے۔ جب آنی سامنے نہ ہوتیں تو رانیہ کی زبان خوب چلتی تھی۔ ایک آزادی کا احساس اس کی ہر ہر حرکت سے ظاہر ہوتا۔ انہوں نے سر جھٹک کر نظروں کا رخ پھیرا۔ تو نظر کا پنچھی اُڑ کر اوپر والی کھڑکی کی چوکھٹ پر جا بیٹھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ انہوں نے بہت دنوں کے بعد تابندہ کو دیکھا تھا۔ تابندہ نے انہیں دیکھا پھر کھڑکی یوں بند کی تھی۔ جیسے کبھی کھلی ہی نہ ہو۔ پنچھی مایوس ہو کر پلٹا اور دل کی منڈیر پر بیٹھ کر احتجاج کرنے لگا تھا۔ جیسے اپنا قصور پوچھتا ہوا۔

"آفاق بھائی......!" رانیہ نے کتابیں ان کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

"تمہیں آنی نے کیسے بھیج دیا۔"

"آپ کے پاس پڑھنے بھیجا ہے۔"

"تو کتاب کھولو......"

"پڑھ لوں گی نا......" ایسے لاڈ وہ صرف آفاق کو ہی دکھا سکتی تھی۔ ساتھ ہی ایک جھکی ہوئی ٹہنی توڑ لی۔

"خبردار...... خبردار......" بابا ملا اپنا ڈنڈا اٹھا کر غصے سے بولا۔ اس نے ٹہنی چھوڑی پھر شکایتی انداز میں کہنے لگی۔

"آفاق بھائی۔ ! یہ لان ہمارا ہے نا۔"

"ہاں......"

"تو پھر بابا اتنا رعب کیوں جماتے ہیں۔ مجال ہے جو کبھی ایک پھول بھی توڑنے دیا ہو۔"

"وہ کر سکتے ہیں۔ بہت محبت سے سینچا ہے ان پودوں کو بابا نے۔ اتنی محبت تو کوئی اپنی اولاد سے بھی نہیں کر سکتا، جتنی بابا نے ان پیڑ پودوں سے کی ہے۔"

وہ خاموشی سے بابا کو کام کرتے دیکھتی رہی۔

"کیا سوچنے لگیں......"

"مجھے لگتا ہے۔ ہمارے گھر پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ اس کی بے تکی بات پر حیران ہوئے۔

"اتنا سب کچھ ہو گیا......" اس کا لہجہ اداس سا تھا۔

آفاق بھائی چند لمحے کچھ کہہ نہ پائے پھر ایک کھوکھلی سی ہنسی ہنس دیئے۔

"اس میں آسیب کا کیا ذکر' کچھ حادثے ہونا ہوتے ہیں۔"

"لیکن یہ سارے ہمارے گھر کے ساتھ ہی کیوں ہوا۔"

"یہاں تو ہر دوسرا شخص کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب صرف ہمارے ساتھ ہی ہو رہا ہے۔ خیر...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کب......؟"

"تم ان باتوں میں وقت ضائع مت کرو جانو! وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

"لیکن جو نقصان ہو گیا ہے......" رانیہ کی مدھم آواز پر وہ ساکت سے رہ گئے۔ پھر زیر لب بڑبڑائے۔

"ہاں' جو نقصان ہو گیا ہے۔ اس کی تلافی کہاں ممکن ہے۔"

پھر اس تکلیف دہ احساس سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولے تھے۔

"اپنی کتابیں کھولو رانیہ......"

وہ کچھ لمحے یونہی ان کے عقب میں کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر ٹکا کر وہ ذرا سا جھکی۔

"آفاق بھائی۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

آفاق نے روکنا چاہا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ وہ آفاق کی نظروں کے سامنے کیاریاں پھلانگتی روش کے دوسری طرف ہار سنگھار کے ٹنڈ منڈ پیڑوں کے پیچھے غائب ہو گئی تھی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بابا سے باتیں کرنے لگے۔

* * *

گھنٹی ٹوٹ کر لٹک رہی تھی۔ اس نے برستے آسمان کو دیکھا۔ لکڑی کا جھولتا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے سرخ روش پر ٹوٹے ہوئے پتے ہوا اور بارش کے ساتھ محو رقص تھے۔ ایک اجنبی کو دیکھا تو ہوا پتوں کا ہاتھ چھوڑ کر ایک پل کو ٹھٹکی۔ پتے بے دم ہو کر روش پر گر گئے۔ وہ احتجاجاً اس کے قدموں تلے آ کر چرچرانے لگے۔ مگر یہ وہ پتے تھے جو ابھی ابھی شاخوں سے ٹوٹے تھے۔ ورنہ بہت سے ایسے تھے جو بارش میں بھیگ کر احتجاج بھی نہ کر سکے تھے۔ وہ کاریڈور میں آ کر بال جھٹکنے لگا۔ ایئر پورٹ تک بارش کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بس گھنے سرمئی بادلوں کی چادر پورے آسمان پر پھیلی تھی۔ وہ ٹیکسی لے کر روانہ ہوا تو ہوا کی شرارت سے اس چادر پر سلوٹیں سی پڑ گئیں اور جب ٹیکسی شہر سے باہر اس قدیم مگر خوبصورت بنگلے کے

سامنے رکی تھی۔ تو ہوا نے بادلوں کا دامن نچوڑ دیا تھا۔

اپنے کوٹ سے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے اس کی سیاہ آنکھوں میں کوفت سی تھی۔

اسے بارش کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ تب ہی جالی دار دروازہ کھول کر ایک خاتون باہر نکلیں پھر ٹھٹک گئیں۔ وہ انہیں دیکھ کر چند قدم آگے ہوا۔

"میں......"

"معاذ!" ان کے لبوں نے تڑپ کر سرگوشی کی۔ وہ مسکرا دیا۔ آنی کے بازو بے تابانہ اسے اپنی آغوش میں لینے کو پھیلے۔ مگر وہ وہیں کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"آپ......؟" اس کا "آپ" بے حد استفہامیہ تھا۔ آنی کے بازو پہلو میں گر گئے۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں بھرا اور بے حد احتیاط سے اس کی بھیگی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ کر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

"میں آنی ہوں......"

"آئی۔ سی......" وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ "مجھے ڈاؤٹ تو ہوا تھا مگر میں نے سوچا...... آپ کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ممی کے پاس آپ کی تصویر بھی نہیں تھی...... مگر......" وہ ایک لمحے کو رکا۔ "آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا۔"

"میں نے تمہیں دیکھا ہے۔" وہ اب بھی اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھیں۔

"کب...... کیا ممی آپ کو میری تصویریں بھجواتی رہی ہیں۔"

وہ چونکیں۔ پھر مسکرا دیں۔

"تم اردو اچھی بول لیتے ہو۔ اندر آؤ......" وہ اسے لئے اندر چلی آئیں۔ ہال کمرہ نیم تاریک تھا۔ مگر آتش دان میں آگ اب بھی سلگ رہی تھی۔ رائٹنگ ٹیبل پر آفاق بھائی موجود تھے اور ان کے قریب رانیہ کشن پر بیٹھی کتاب ہاتھ میں لئے اونگھ رہی تھی۔

آفاق نے چونک کر نووارد کو دیکھا۔

"یہ آفاق ہے' میرے دیور کا بیٹا۔"

آنی کی آواز پر رانیہ ہڑبڑا کر جاگی۔ کتاب سنبھالتے ہوئے وہ ہوشیار بننے کی کوشش میں بے ساختہ بولی۔

"آنی! میں پڑھ رہی ہوں۔"

جہاں آنی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا تھا۔ وہیں نووارد کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بہتر ہے تم کچھ دیر سو جاؤ اچھی لڑکی!" وہ انگلش میں گویا ہوا۔ رانیہ شرمندگی سے سرخ پڑ گئی۔

"یہ معاذ ہے۔" آپی نے آفاق سے تعارف کروایا۔ آفاق بھرپور انداز میں مسکرائے اور وہیں بیٹھے بیٹھے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔ معاذ کو عجیب سا لگا لیکن اس نے مصافحہ کیا تھا۔

"یہ......" اس نے کتاب کا کونا کھرچتی شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھی رانیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ رانیہ ہے......"

"ہیلو......"

رانیہ نے جھجک کر سامنے پھیلے ہاتھ کو دیکھا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تابندہ کو بتاتی ہوں۔" کتاب وہیں چھوڑ کر وہ اوپر بھاگ گئی۔ معاذ خجل سا ہو گیا تھا۔

"تم کپڑے بدل لو۔ بھیگ گئے ہو۔ میں چائے بناتی ہوں۔" آپی نے رسانیت سے کہا۔ معاذ کو خود بھی الجھن ہو رہی تھی۔

"تابی! تمہیں پتا ہے کون آیا ہے۔" وہ پرجوش تھی اس کے کمرے میں گھس گئی۔ کھڑکی سے باہر جھانکتی تابندہ نے پلٹ کر اس کے تمتماتے چہرے کو دیکھا۔

"کون آیا ہے......؟"

"معاذ آئے ہیں۔"

"کون معاذ......؟" وہ بے دھیانی میں بولی۔ رانیہ نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"امریکہ والی خالہ کے بیٹے۔ تمہیں یاد ہی نہیں ہے۔ ایک اکلوتے تو ان کے بیٹے ہیں۔"

"اچھا......" اس کا لہجہ بے تاثر سا تھا۔

"تم ان سے ملو گی نہیں......؟"

"وہ آپی سے ملنے آئے ہیں۔ ہم سے نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" اسے تابی کا سپاٹ انداز اچھا نہیں لگا۔

"جاؤ رانیہ! تنگ نہیں کرو......" اس کی بیزار سی آواز پر رانیہ کچھ مایوسی اور غصے میں پلٹ گئی۔

* * *

رات کے کھانے پر معاذ کی ملاقات سب ہی سے ہو گئی تھی۔

"تابندہ کو بلا لاؤ......" آپی نے رانیہ سے کہا تھا۔

"وہ آتی تو ہے نہیں......" اس کی زبان معاذ کے سامنے ہی پھسل گئی۔

"کیوں۔ وہ سب کے ساتھ کھانا نہیں کھاتیں۔" معاذ نے چونک کر پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

"پ...... پتا نہیں......"

وہ سامنے رکھی خالی پلیٹ میں جھانکنے لگی۔ پھر کرسی کھسکا کر اوپر آ گئی۔

"تم ٹیبل پر کھانا تو نہیں کھاؤ گی۔" روٹھا روٹھا سا لہجہ تھا۔ تابی مسکرا دی۔

"تم چلو۔ میں آتی ہوں۔"

"ہیں۔" اس کا منہ کھل گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ ابھی ابھی عالیہ آنٹی اسے سمجھا بجھا کر گئی تھیں۔ تابی کو دیکھ کر آفاق کے لبوں پر گہری مسکراہٹ ابھر آئی۔ جس کا ساتھ ان کی آنکھوں نے بھی دیا۔ وہ دروازے میں ہی رک گئے تھے۔ پھر ان کی اسٹک کی ٹک ٹک نے معاذ کو ششدر سا کر دیا اور وہ تاسف سے اس خوبرو شخص کو دیکھنے لگا۔ تابی نے بس رسمی سا ہیلو کہا تھا۔ پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیسے کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ آپی ایک ایک ڈش نہ صرف معاذ کے سامنے رکھ رہی تھیں۔ بلکہ تابندہ کی بھی اسی طرح خاطر کر رہی تھیں۔ مگر اس نے پہلی بار ہی ڈونگا ان کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا اور سپاٹ سے لہجے میں بولی تھی۔

"مجھے جو لینا ہوگا۔ میں لے لوں گی۔"

ان کا چہرہ ایک پل کو متغیر سا ہوا۔ پھر ان کی پوری توجہ معاذ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ کھانے کے بعد جب آپی کافی بنانے لگیں تو معاذ نے ان سب کو تحائف دیئے تھے۔ جب رانیہ کو خوبصورت سا کارڈیگن اور ڈھیر ساری چاکلیٹ دیں تو وہ ایک دم خوش ہو کر بولی تھی۔

"یہ واقعی میرے لئے ہیں۔"

اس کے انداز میں بچوں کی سی سادگی اور بے ساختگی تھی۔ معاذ نے مسکرا کر غور سے اسے دیکھا تھا۔ وہ جھینپ گئی۔

"میں آپی کو دکھاتی ہوں۔"

"تم ابھی تک بچی ہو۔" معاذ نے سر تا پا اسے دیکھ کر کہا۔ رانیہ کو اس کا ریمارک پسند نہیں آیا۔ اپنے خیال میں وہ خاصی بڑی بلکہ سمجھدار ہو چکی تھی۔

"آپی! دیکھیں، معاذ بھائی میرے لئے کیا لائے ہیں۔"

آپی نے ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ پھر درشت لہجے میں بولیں۔

"اب کیا یونہی سینے سے لگائے رکھو گی۔ چھوڑو ان کو اور یہ کافی لے کر جاؤ۔"

اس نے پیکٹ وہیں کچن ٹیبل پر رکھے اور ان کے ہاتھ سے ٹرے تھام لی۔

* * *

معاذ کو یہاں آئے صرف دو دن ہوئے تھے اور وہ بالکل بیزار ہوگیا تھا۔ یہاں کے لوگ اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ عجیب الجھے' بیزار' خاموش' گم صم اور سنکی سے۔ عالیہ آنٹی ہمہ وقت ہاتھ میں تسبیح لئے دنیا سے کٹی نظر آتیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے آفاق' وہیں رائٹنگ ٹیبل پر سر جھکائے نجانے سارا دن کیا پڑھتے اور لکھتے رہتے تھے۔ ہر بات کے جواب میں ان کے پاس محض ایک خاموش سی مسکراہٹ ہوتی۔ تابندہ اسے پہلے دن کے بعد نظر ہی نہیں آئی تھی اور اس دن بھی اس کا انداز روکھا پھیکا اور لئے دیئے والا تھا۔ پھر آنی تھیں جو معاذ سے بات کرتیں تو پلکیں جھپکنا بھول جاتی تھیں۔ معاذ کو ان کی بولتی نگاہوں سے الجھن ہوتی۔ آغا جی تنک مزاج اکھڑے اکھڑے سے انسان تھے۔ عمر اور حمزہ کا سارا دن گھر سے باہر گزرتا۔ معاذ کی ان سے دوستی نہیں ہوسکی۔ ایک رانیہ تھی جس کی آنکھوں میں زندگی اپنے مکمل روپ کے ساتھ مسکراتی۔ مگر وہ اپنے بے ساختہ انداز میں بات کرتے کرتے ایک دم یوں چپ ہو جاتی گویا کسی نے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ پھر گھبرا کر بھاگ جاتی۔ یوں لگتا تھا یہاں کوئی بھی نارمل نہیں۔ ہر کوئی اپنے اندر کسی نہ کسی آواز کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اتنے سارے افراد کے ہوتے ہوئے بھی پورے ماحول پر سکوت کا پنچھی پر پھیلائے اونگھتا رہتا۔ ساری آوازیں' سارے لفظ' سارے جذبے اس کے بدرنگ پروں میں تنکوں کی طرح الجھ کر رہ گئے تھے۔ معاذ کا دل چاہتا ایک بار تو وہ اپنے پر جھٹکے۔ اچانک اسے خیال آیا۔ تابندہ کا گفٹ اس کے پاس اب تک رکھا ہوا ہے۔

"آنی! تابندہ کہاں ہے......؟"

"اپنے کمرے میں ہوگی......" انہوں نے فریج سے قیمہ نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا کمرہ کون سا ہے؟"

"سیڑھیوں سے اوپر والا۔"

وہ پیکٹ ہاتھ میں پکڑے اوپر آگیا۔

"آجاؤ......" اس کے دستک دینے پر آواز آئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چکرا سا گیا۔ نیم تاریک کمرہ' گھٹن' ساری کھڑکیاں بند' ہر چیز بے ترتیب' تابی کی نگاہوں میں حیرت سی ابھری۔

"یہ لوگ واقعی نارمل نہیں ہیں......" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"مجھ سے کچھ کہا......" تابندہ کا لہجہ سپاٹ سا تھا۔ معاذ قصداً مسکرایا۔

"تم سے کیا کہنا ہے تابی ڈیئر......" تابی کی سپاٹ نگاہوں میں خفگی کا تاثر ابھرتا دیکھ کر

وہ ایک پل کو خاموش ہوا "سوری میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ اب میں پاکستان میں ہوں۔ حالانکہ ممی نے مجھے کافی بریف کیا تھا۔ بہرحال......" امریکن اسٹائل میں کندھے اچکاتے ہوئے اس نے گفٹ تابی کی طرف بڑھایا۔

"تمہارے لئے لایا تھا......"

تابی نے کچھ بھی کہے بغیر پیکٹ تھام لیا اور میز پر رکھ دیا۔ خاصی بدتہذیبی کی بات تھی مگر معاذ کیلئے اب کچھ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسا کر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ تابندہ کو الجھن سی ہونے لگی۔

"یہ جاتا کیوں نہیں......"

معاذ کی نظریں بک ریک پر رک گئیں۔ ذرا سا جھک کر اس نے کتابوں کے نام پڑھے۔ پھر ستائشی انداز میں سیٹی بجائی۔

"تمہیں انگلش لٹریچر میں دلچسپی ہے......؟"

"کبھی تھی......" میز کی خالی سطح پر نظریں جما کر وہ بڑبڑائی۔

"تھی......؟" معاذ پنجوں کے بل اس کی طرف گھوما۔ تابی نے فوراً خود کو کمپوز کیا۔

"گفٹ کے لئے شکریہ۔"

دوسرے لفظوں میں وہ اسے دفع ہو جانے کو کہہ رہی تھی۔ معاذ بدمزہ ہوگیا۔ کچھ لمحے ٹٹولتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ نظریں چرائے بند کھڑکی کو گھورتی رہی۔ وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

"معاذ! چائے پیو گے۔" آنی نے پوچھا۔

"ضرور......" وہ کچن میں آگیا۔ "کیا بنا رہی ہیں......؟"

"بریانی......"

"میری فیورٹ ڈش......" وہ فریج کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ آنی نے پلٹ کر اس کی سمت دیکھا جبکہ وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ پکاتے پکاتے تھکتی نہیں ہیں۔"

"تمہارے لئے پکانا اچھا لگتا ہے۔" ان کے اندر کئی اور خواہشیں جنم لینے لگیں۔ معاذ فریج بند کرکے ان کی طرف پلٹا۔

"میرے لئے اتنا مت کیا کریں۔"

وہ اسے دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا دیں۔ ان کی انگلیوں نے اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ پھر آہستگی سے اس کی تھوڑی کے سیاہ تل کو چھوا۔

"میں ترس گئی تھی کسی بہت ہی اپنے کیلئے۔ گزشتہ چوبیس برس سے میرے پاس کوئی میرا اپنا نہیں آیا تھا۔ میں ان اجنبی دیواروں اور اجنبی لوگوں میں سانس لے رہی تھی۔ اب تو اپنا آپ بھی کھو گیا تھا۔ مجھے اپنے ہونے کا احساس چاہئے تھا۔ جو تمہارے آنے سے ملا ہے۔ تم آئے ہو مجھے لگا میں پھر سے سانس لینے لگی ہوں۔"

وہ خود کلامی کی کیفیت میں بول رہی تھیں۔ معاذ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔ پھر اسی انداز میں ہنس دیا۔

"سوری آنی! میری اردو اب اتنی اچھی بھی نہیں ہے۔"

وہ بری طرح چونکیں۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ابلتے پانی میں چائے کی پتی ڈالنے لگیں۔ ان کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ معاذ پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ممی کے ساتھ کوئی پرابلم ہے آنی......"

"کیسی پرابلم......؟" معاذ کے پوچھنے پر وہ چونک گئیں۔

"یونہی مجھے لگا۔ وہ پاکستان آنے سے کتراتی ہیں۔ چوبیس سالوں میں ایک بار بھی پاکستان نہیں آئیں۔ کوئی جھگڑا ہے آپ دونوں کے درمیان؟" وہ بے حد سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" آنی نے آہستگی سے کہا اور مکمل طور پر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ گویا اب کوئی بات نہیں کریں گی۔ معاذ کپ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ رانیہ بابا ملا سے لڑ رہی تھی۔

"یسوع مسیح کی قسم' یہ لڑکی بالکل احمق ہے۔ کتنی بار کہا ہے ابھی بیج بونے کا موسم نہیں آیا" وہ جھنجھلا کر چیخا۔

"بابا! میں تو......"

"اب تم نے میرے کام میں دخل دیا تو میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔"

"مجھے پتا چل گیا ہے بابا۔ تمہارا کب کیوں نکلا ہے......" وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"خبردار......خبردار......" بابا ملا نے سچ مچ ڈنڈا اٹھالیا۔ اپنے کب کا ذکر اسے سخت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ پلٹی پھر معاذ کو لان چیئر پر بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"لگتا ہے یہ اولڈ مین تمہیں زیادہ پسند نہیں کرتا......"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بابا مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔" اس نے آرام سے کہا۔

"اچھا......" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں' وہ مجھے پھول توڑنے نہیں دیتا لیکن میرے لئے اپنے ہاتھوں سے گلدستہ بناتا ہے۔" اس نے ثبوت دیا۔

"چلو مان لیا۔ تم اسکول نہیں جاتیں۔"

"اسکول......" وہ صدمے سے چلائی پھر ناگواری سے ناک چڑھا کر بولی۔ "میں کالج جاتی ہوں۔ جس دن آپ آئے تھے اس سے دوسرے دن میرا آخری پیپر تھا۔"

"رئیلی۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ مگر آنکھیں متبسم تھیں۔ گویا اس سے مذاق کر رہا تھا۔ رانیہ کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ پھر وہ کچھ بھی کہے بغیر اندر چلی گئی۔

* * *

عمر اور حمزہ کالج ٹرپ کے ساتھ سوات گئے تھے۔

"مت جائیں نا۔ معاذ بھائی کیا سوچیں گے۔"

رانیہ نے کہا تھا۔

"برف پگھلنے لگی ہے' چشموں کو راستہ مل گیا ہے۔ میں پہاڑوں میں بہار کا پہلا شگوفہ کھلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔" حمزہ نے کہا تھا۔ آنی کی توجہ مکمل طور پر معاذ کی طرف تھی۔ سو رانیہ تھوڑی آزادی محسوس کر رہی تھی۔ آفاق بھائی کی الماری سے ڈاکٹر ژواگو نکال کر وہ پچھلی گول سیڑھیوں پر آ بیٹھی جو اوپر جاتی تھیں۔ پچھلا برآمدہ پرانے سامان' لٹکتی بیلوں' ٹوٹی شاخوں اور خشک پتوں سے بھرا رہتا تھا۔ پچھلا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ رانیہ کو یہاں تک گھوم کر آنا پڑتا اور اب وہ سب سے چھپ کر ڈاکٹر ژواگو نکال کر یہاں آگئی تھی۔ مگر چوتھے صفحے پر ہی بیزار ہوگئی۔ مخصوص روسی نام اس کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

"یہ ناول اس قابل تو نہیں کہ اسے نوبل پرائز دے دیا جائے۔" اس نے اکتا کر ناول رکھ دیا۔

"ہیلو گرل! یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔" چین تو معاذ کو بھی نہ تھا۔

"اکیلی تو نہیں ہوں۔" وہ مسکرائی۔ معاذ اس سے نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہوئے اس نے کتاب اٹھالی۔

"ڈاکٹر ژواگو۔ میرا فیورٹ ناول ہے۔"

"اس میں ایسا کیا ہے۔" رانیہ کو حیرت ہوئی۔ معاذ اسے انقلاب روس اور اس کے بعد کی ابتری اور ناول کے مصنف "بورس پیٹرنک" کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ کچھ لمحے سنتی رہی۔ مگر وہ روانی میں انگلش زیادہ بولنے لگا تھا۔ رانیہ کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ اٹھ کر جانا چاہتی تھی مگر سامنے معاذ پھیل کر بیٹھا تھا۔

"معاذ بھائی! اب چلیں ......" بیزار ہو کر وہ بول اٹھی تو معاذ کو احساس ہوا وہ بھینس کے آگے بین بجا رہا تھا' وہ ہنس دیا۔

"تم بور ہو رہی ہو۔ سوری۔ میں تمہاری تنہائی میں مخل ہوا...... مگر تم اتنی ویرانی میں تنہا کیوں آ جاتی ہو......"

"تنہا تو نہیں ہوں۔ یہاں میری مانو بلی آ جاتی ہے۔ آج نہیں آئی۔ ان درختوں پر ڈھیر ساری چڑیوں کے گھونسلے ہیں۔ ان میں انڈے بھی ہیں۔ یہ ویرانی تو بہار کے بعد ختم ہو جائے گی۔ یہاں ہر طرف پھول کھل جائیں گے۔ تتلیاں آئیں گی' لمبی دم والی چڑیا اور کوئل بھی۔ ان درختوں میں شہد کی مکھیوں کا چھتہ بھی ہے۔ بابا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ جب اس میں شہد بن جائے گا تو وہ مجھے نکال کر دیں گے۔" وہ پرجوش ہوتے ہوتے ایک دم ڈر گئی۔

"معاذ بھائی! آپ یہ سب آنی سے مت کہیے گا۔ انہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگتا۔"

معاذ کے چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔

"رانیہ! تم کتابیں پڑھتی ہو۔"

"بالکل پڑھتی ہوں۔" وہ آرام سے بولی۔

"میوزک......"

"بہت سنتی ہوں......"

"تمہاری بیسٹ فرینڈ کون ہے......"

"آفاق بھائی......"

"تمہاری فیورٹ سنگر اور رائٹر کون ہے......؟"

رانیہ گڑبڑا سی گئی۔ معاذ نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"تم جھوٹ کیوں بول رہی ہو؟"

"نہیں تو......" وہ پزل ہو کر دونوں ہاتھ مسلنے لگی۔ معاذ نے دوبارہ اپنا سوال سخت لہجے میں دہرایا تو گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"راستہ چھوڑیں۔ آنی ڈھونڈ رہی ہوں گی۔"

معاذ نے رستہ دے دیا تھا۔ وہ اندر چلی گئی۔ مگر معاذ بہت دیر وہیں بیٹھا کچھ سوچتا رہا تھا جبکہ رانیہ آفاق کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ لکھتے لکھتے رک گئے۔

"کیا ہوا......؟"

"مجھے معاذ اچھے نہیں لگے۔" گھاس کی پتیاں نوچتے ہوئے اس نے خفگی سے بتایا۔

"کیوں......؟" انہوں نے لکھے گئے صفحات سمیٹے۔ انہیں کلپ لگا کر فائل میں رکھ

دیا۔

"وہ کہتے ہیں۔ میں جھوٹ بولتی ہوں۔"

"تم نے اس سے کیا کہا تھا۔"

"بس یہی کہ میں کتابیں پڑھتی ہوں اور بہت سا میوزک سنتی ہوں اور میرے بیسٹ فرینڈ آفاق بھائی ہیں۔"

"آخری بات کے علاوہ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"تو میں ان سے کیا کہتی۔" رانیہ نے سر اٹھا کر آفاق کو دیکھا۔ "یہی کہ آنی مجھے کتابیں نہیں پڑھنے دیتیں کیونکہ ان کے خیال میں کتابیں دماغ خراب کرتی ہیں اور مجھے گانے بھی سننے نہیں دیتیں جبکہ حمزہ اور عمر کے کمرے میں ریموٹ کنٹرولڈ اسٹیریو ہے۔ ان کے کمرے میں ڈھیر سارے فنکاروں اور کرکٹرز کے پوسٹرز لگے ہیں اور جب میں نے عمر کی منتیں کر کے "کیٹ ونسلیٹ" کا پوسٹر لیا کہ اپنے کمرے میں لگاؤں گی تو آنی نے اس کے ایک سو بیس ٹکڑے کر کے جلا دیا تھا اور جب ایک بار میری فرینڈز نے مجھے "سونو نگم" کا کیسٹ دیا تھا کہ گھر جا کر سننا تو آنی نے اس کیسٹ کو توڑ کر مجھے تھپڑ دے مارا تھا اور یہ بھی کہ میری کوئی دوست نہیں صرف آفاق بھائی میرے بیسٹ فرینڈ ہیں۔ کتنی سبکی ہوتی ...... کتنی شرمندگی ......" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو سے چبھنے لگے۔

"بیٹا! یہ تو بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ والدین کی تربیت کا انداز......"

"صرف میری...... عمر اور حمزہ کی نہیں۔ وہ کتابیں بھی پڑھتے ہیں اور میوزک بھی سنتے ہیں۔ وہ نہیں بگڑ سکتے۔ وہ خولہ' مریم' عالیہ اور میری ساری کالج فیلوز...... ان کے بگڑنے اور دماغ خراب ہونے کا کوئی چانس نہیں ہے...... صرف رانیہ بگڑ سکتی ہے...... صرف رانیہ کا دماغ خراب ہو سکتا ہے......" وہ معصوم لہجے میں سوال کر رہی تھی۔ مگر اس کا سوال بہت چبھتا ہوا اور گہرا تھا۔

"ہیلن کیلر" نے تو تین دنوں کی روئیداد لکھی ہے۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ میں ایک دن ...... صرف ایک دن آزادی سے گزارنے کو ملے تو میں کیسے گزاروں گی تو جانتے ہیں آفاق بھائی میں کیسے گزاروں گی۔"

وہ پوچھ رہی تھی اور آفاق گردن جھکائے صاف صفحے پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہے تھے۔

"ایک گیت سن کر' اپنی کسی سہیلی کو فون کر کے جب کوئی میرے گرد یہ دیکھنے کو نہ کھڑا ہو کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اپنے کمرے میں ایک پوسٹر بھی لگاؤں گی۔ خواہ اگلے دن وہ اتار دیا جائے۔ ایک اچھی سی کتاب بھی پڑھوں گی اور......"

اپنے عقب میں آہٹ سن کر وہ ایک دم پلٹی اور معاذ کو دیکھ کر جم گئی۔ وہی سبکی ...... وہی شرمندگی ...... جس سے بچنے کیلئے وہ جھوٹ کا آنچل اوڑھ رہی تھی۔ معاذ نے نظروں کا زاویہ بدل کر آفاق کو دیکھا تو وہ اس کے قریب سے نکل کر اوپر بھاگ گئی۔

"آنی کو یوں اس کی چھوٹی چھوٹی آزادیاں سلب نہیں کرنی چاہئے تھیں۔ رانیہ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا......" معاذ زیرلب بڑبڑایا۔ "شاید آپ میں سے کسی کو نہیں خبر کہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے اندر کتنی گڑبڑ مچا رہی ہیں۔ اس کی پرسنیلٹی ختم ہو رہی ہے۔ اس کے اندر کا خلا کیسے بھرے گا مسٹر آفاق! کہیں وہ اپنی ذات کا اعتماد نہ کھو دے۔"

آفاق نے سر جھٹک کر معاذ کو دیکھا۔ ان کے چہرے کے جامد تاثرات چٹخ گئے۔

"ہم سب اپنی ذات کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ مسٹر معاذ! ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوا۔"

* * *

وہ آنی کے ساتھ کچن میں کام کروا رہی تھی اور حسب معمول آنی کی ڈانٹ اس کے ہاتھ پاؤں پھلا رہی تھی۔ سو کوئی بھی کام ٹھیک ہونے کے بجائے بگڑتا ہی جا رہا تھا اور آنی کے غصے کا گراف بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر معاذ کی موجودگی ...... وہ پانی لینے آیا تھا اور اب وہیں کھڑا بے حد دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر دلچسپی کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ شاید رانیہ کی آنکھوں میں امڈتی نمی دیکھ لی تھی۔

"کیا کر رہی ہیں آنی آپ۔ تربیت کا یہ کون سا انداز ہے۔" وہ انگلش میں گویا ہوا۔

"یہ لڑکی ساری عمر کچھ نہیں سیکھ سکے گی۔" آنی جھنجلا گئی تھیں۔

"اس طرح تو واقعی نہیں سیکھ سکے گی۔" معاذ نے ہمدردی سے اس معصوم لڑکی کو دیکھا۔ جس کی پوری توجہ پیاز سے زیادہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پینے کی طرف تھی۔ پیاز سیاہ ہونے لگی۔

"نظر نہیں آ رہا ہے......" آنی نے سخت لہجے میں ٹوکا تو اس نے پانی کا چھینٹا دیا۔

"سبزی ڈالو...... اس سے پہلے چمچ ضرور ہلا دو......"

"آپ ایک کام اس کے سپرد کر کے بھول کیوں نہیں جاتیں۔"

"تا کہ وہ سب خراب کر دے۔"

"ایک بار خراب کرے گی تو اگلی بار سیکھ جائے گی ...... غلطی نہیں کرے گی تو اسے درست کرنا کیسے سیکھے گی۔"

آنی کو غصہ آ گیا۔ اس کے ہاتھ سے چمچ چھین لیا۔

"جاؤ یہاں سے......"

رانیہ باہر نکل گئی۔ بابا ملا کیاریاں بنا رہا تھا۔

"آنی کو مجھ سے بالکل پیار نہیں ہے......" وہ غصے و بے بسی سے بڑبڑائی

"میرا بھی یہی خیال ہے......" معاذ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ رانیہ نے لب بھینچ لئے۔

"تم مجھ سے اب تک خفا ہو......"

"نہیں تو......" اس نے ستون سے لپٹی بیل کی ایک خشک ٹہنی توڑ لی۔ پھر گھبرا کر بابا کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

"لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں......"

"آپ پامسٹ ہیں۔" رانیہ نے رخ بدل کر معاذ کو دیکھا اور معاذ نے اس کی بھیگی پلکوں کو۔

"ہاں......"

رانیہ نے دوپٹے سے ہاتھ صاف کر کے ہتھیلی اس کے سامنے کی۔ وہ کچھ لمحے سامنے پھیلی گلابی ہتھیلی پر قسمت کی لکیر دیکھتا رہا اور وہ منتظر سی اس کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی۔

"تمہاری قسمت کی لکیر بہت اچھی ہے۔"

"اور......" رانیہ کے لہجے میں اشتیاق سا تھا۔ معاذ نے اس کی نم پلکوں کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

"لیکن تم زندگی میں کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتیں۔ ہاں قسمت خود تم پر مہربان ہوگی۔"

رانیہ نے ہاتھ ہٹا لیا اور ناک چڑھا کر بولی۔

"آپ کو ہاتھ دیکھنا نہیں آتا......"

معاذ ہنس دیا۔ پھر صلح جو لہجے میں بولا۔

"اچھی لڑکی! آؤ دوستی کر لیں۔"

"میری آپ سے دوستی کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ تو مرد ہیں۔"

"تو مردوں سے دوستی نہیں ہو سکتی؟" معاذ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"امریکہ میں ہوتی ہوگی۔ پاکستان میں نہیں ہو سکتی۔" اس نے اپنے تئیں معاذ کو لاجواب کیا۔

"تو پھر آفاق تمہارے بیسٹ فرینڈ کیسے ہوئے......؟" معاذ نے جرح کی۔ وہ لاجواب ہو گئی۔ پھر تنک کر بولی۔

"وہ آفاق بھائی ہیں۔ میری ہر بات سنتے ہیں اور یقین بھی کرتے ہیں خواہ میں

جھوٹ ہی کیوں نہ کہہ رہی ہوں"

معاذ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"پرامس......" اس نے ہاتھ پھیلایا۔ "میں بھی تمہاری ہر بات پر یقین کروں گا' خواہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" رانیہ نے ہاتھ ملانے سے گریز ہی کیا۔ معاذ مسکرا دیا۔ پھر پوچھنے لگا۔

"آفاق تمہاری بات صرف سنتے ہیں یا سمجھتے بھی ہیں"

"سمجھتے ہیں' اسی لئے تو یقین کرتے ہیں۔" رانیہ جواب دے کر اندر آ گئی۔ مگر اس نے یہی بات پہلے آفاق پھر تابی سے پوچھی تھی۔ وہ دونوں مسکرا دیئے تھے۔ آفاق کی مسکراہٹ بالکل پھیکی اور بے رنگ تھی اور تابی کی مسکراہٹ ایک دم گہری اور معنی خیز تھی۔ مگر رانیہ ان دونوں مسکراہٹوں کا نہ فرق جان سکی تھی اور نہ مطلب۔

* * *

معاذ اس کے لئے کچھ کیسٹس اور واک مین لایا تھا اور چند بہت اچھی کتابیں بھی۔

"نہیں' آنی بہت ڈانٹیں گی۔" وہ لینے میں متامل تھی۔

"نہیں ڈانٹیں گی یار' لے لو......" معاذ نے زور دیا تو وہ آفاق کو دیکھنے لگی۔ وہ مسکرا دیئے۔

"لے لو رانیہ! سارا دن فارغ پھرتی ہو۔ کسی انسٹی ٹیوٹ میں تو آنی تمہیں بھیجیں گی نہیں۔ وقت اچھا کٹ جائے گا۔"

"اگر آنی نے ڈانٹا تو میں کہہ دوں گی۔ آفاق بھائی نے مجبور کیا تھا۔" وہ لینا بھی چاہتی تھی اور ڈرتی بھی تھی۔

"ایک دم ڈرپوک ہو۔" معاذ جھنجلا گیا۔ "آنی......آنی......"

آنی ہاتھ میں تولیہ لیے ادھر ہی آ گئیں۔

"کیا چیز ہے یہ لڑکی...... میں اس کیلئے کچھ چیزیں لایا ہوں اور یہ لینے سے انکاری ہے۔"

آنی نے رانیہ کو دیکھا۔ پھر رسانیت سے بولیں۔

"رکھ لو......" اور واپس پلٹ گئیں۔

"بس اتنی سی بات تھی۔" معاذ نے رانیہ سے کہا تو اس نے خوشی خوشی وہ چیزیں سنبھال لیں۔

"میں تابی کو دکھا کر آتی ہوں"

معاذ آفاق کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم چلے جاؤ گے تو رانیہ بہت مس کرے گی تمہیں۔"

"اور میں بھی...... وہ ایک اچھی اور معصوم لڑکی ہے۔ محبتوں اور توجہ کی طالب......" پھر بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگا "آپ کیا لکھتے رہتے ہیں......؟"

"ایک ناول ہے......"

"آپ رائٹر ہیں......واؤ......" معاذ کیلئے یہ اطلاع نئی تھی۔

"نہیں...... یہ میرا پہلا ناول ہے۔ مگر انجام سمجھ میں نہیں آتا۔" آفاق نے ایک الجھی الجھی سی سانس کھینچی۔

"کہانی کیا ہے......؟"

آفاق کی نگاہوں میں کرب آمیز اداسی اتر آئی۔ بولے تو لہجہ سپاٹ تھا۔

"ایک معذور شخص کی کہانی ہے۔ جو محبت جیسے جذبے کو اپنا حق تو سمجھتا ہے۔ مگر اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکتا۔"

معاذ کچھ لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر ان کی طرف جھکا۔

"وہ کسے اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا ہے۔"

اور آفاق پلکیں جھپکنا بھول گئے تھے۔

* * *

معاذ کی ممی کا فون آیا تھا۔ معاذ نے بات کر کے ریسیور آنی کو تھما دیا۔

"معاذ ٹھیک ہے نا......" ایمن نے بے تابی سے پوچھا۔

"تم نے ابھی تو بات کی ہے......" آنی نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں۔" وہ خاموش سی ہو گئیں۔ "اسے اب واپس بھجوا دو۔"

"ابھی......ابھی سے......" آنی کے لہجے میں بے تابی در آئی۔ "کچھ دن اور رہنے دو ایمن۔"

"نہیں۔" ایمن قطعی لہجے میں بولیں۔ "اس کا سمسٹر اسٹارٹ ہونے والا ہے۔"

"وہ بہت عرصے کے بعد آیا ہے۔" ان کا لہجہ ملتجی تھا۔

"میں اسے اب بھی نہ بھجواتی مگر اس کی ضد تھی۔ معاذ پاکستان زیادہ عرصہ رکے' یہ ہم دونوں کیلئے بہتر نہیں۔"

آنی نے خاموشی سے ریسیور رکھ کر آنکھ میں آئی نمی صاف کی۔ کچن میں آ کر معاذ کیلئے گرم دودھ نکالا۔ اس کے کمرے میں آئیں تو وہ بستر پر دراز آنکھیں موندے پڑا تھا۔

وہ کچھ لمحے اس کی بند پلکوں کو دیکھتی رہیں۔ ان کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"آئیں آنی! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنی بیڈ کے کنارے ٹک گئیں۔

"تم بالکل اپنے باپ پر گئے ہو۔" ان کے لبوں نے سرگوشی سی کی۔

"کہاں آنی! سب کہتے ہیں کہ میں ڈیڈ سے بالکل نہیں ملتا۔" اس نے گلاس پکڑا۔ وہ کھڑی ہوگئیں۔

"بیٹھیں ناں آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" وہ جب بھی دودھ لے کر آتی تھیں۔ معاذ یہی کہتا تھا اور وہ کام کا بہانا بنا کر ہمیشہ ٹال دیتی تھیں مگر آج دوبارہ بیٹھ گئیں۔ معاذ نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"اتنا چپ کیوں رہتی ہیں آپ......؟"

اس کے سوال کا جواب ایک گہری چپ کی صورت آیا۔

"ہر وقت مصروف رہتی ہیں۔ میرے پاس بیٹھنے کا بھی وقت نہیں۔ حالانکہ میں تو آپ سے ملنے آیا تھا۔ اتنی باتیں سنی تھیں آپ کی اور دیکھا نہیں تھا۔" معاذ نے ان کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔ وہ ساکت تھیں۔

"یو آر سو سویٹ آنی...... میرے تصور سے بھی زیادہ......"

"تم واپس جا رہے ہو......؟" آنی نے بمشکل پوچھا۔

"ہاں......" معاذ نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم کہیں گھومنے بھی نہیں گئے۔ عمر وغیرہ کے ساتھ سوات ہو آتے۔" وہ اپنے ہاتھ کی پشت پر نظریں گاڑے کہہ رہی تھیں۔

"آپ لوگوں سے ملنا تھا مل لیا۔ اگلی بار آؤں گا تو پورا پاکستان گھوموں گا۔"

"اگلی بار آؤ گے......؟" انہوں نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں...... آپ بلائیں گی تو ضرور آؤں گا۔"

"میں تو تمہیں نہیں بلا سکتی۔ خود آنا چاہو تو ضرور آنا۔" وہ آہستگی سے بولی تھیں۔ معاذ نے عجیب سی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"آپ مجھ سے دوبارہ ملنا نہیں چاہتیں۔"

"میں تو چاہوں گی، تم یہیں رہ جاؤ......" وہ ایک طویل سانس لے کر ذرا سا مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"یہ تھوڑا مشکل ہے......" وہ کان کھجاتے ہوئے بولا۔

"دودھ پی لو۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" آنی کھڑی ہوگئیں۔

"آنی! تابندہ کے ساتھ کیا پرابلم ہے......" دودھ کا گلاس اٹھاتے اٹھاتے معاذ نے اچانک پوچھا۔ وہ ٹھٹک گئیں پھر سنبھل کر بولیں۔

"رات بہت ہوگئی ہے۔ تابندہ کا پرابلم صبح ڈسکس کر لیں گے۔"

"او کے......" معاذ نے آگے ہو کر ان کی پیشانی چوم لی۔ "گڈ نائٹ آنی......"

وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ اس نے دودھ کا گلاس خالی کر دیا۔ تب انہوں نے چونک کر گلاس اپنے ہاتھ میں لیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

* * *

موسم بدل رہا تھا۔

فطرت اس کائنات کو نیا اور خوبصورت روپ دینے کو بے تاب تھی۔ بند کھڑکی پر ہوا دستک دیتی تھی۔

بارش کی خوشبو، بند کھڑکیاں نہیں روک سکتیں۔

کھڑکیاں کھولو، اوائل بہار کی آہٹیں سنو......

موسم بدلنے والا ہے۔

آلوچے کی شاخوں پر نئے شگوفے کھلنے لگے ہیں۔

ٹنڈ منڈ درختوں کی برہنہ تن شاخوں پر ننھی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔

چٹکتی کلیوں کی صدا سنو

یہ تمہیں بلاتی ہیں۔ وہ صبح رنگ لڑکی جو اپنے آنچل کو ست رنگی کلیوں سے بھر لیتی تھی۔ کہاں ہے؟

بہار کی علامت، ایک ادھ کھلا گلاب۔

بہار کی علامت، دور دیس سے بہار کا تعاقب کرتی تتلی۔

بہار کی علامت، کوئل کی پہلی کوک

بہار کی علامت، وہ شفق رنگ لڑکی، کہاں ہے؟

آؤ میں تمہیں اپنے بازوؤں میں بھر لوں، خوشبو کو اوڑھیں اور ان خوش رنگ فضاؤں میں رقص کریں۔

وہ سنتی، پھر ان ہی سرگوشیوں کو اوڑھ کر سوچتی۔

"بارش جن کے اندر برستی ہو اور جن کے نصیب خزاں گزیدہ موسموں کی طرح ہوں،

وہاں بہار کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اب یہاں کلیاں نہیں چٹکتیں' کانٹوں کی فصل اگتی ہے۔ اس دل میں اب خوشبو نہیں راکھ اڑتی ہے۔ میں نے زندگی کو خوش رنگ تتلی سمجھ کر ہتھیلیوں پر سنبھالا تھا۔ اب دیکھتی ہوں تو ایک بے جان مردہ تتلی ہے اور کچھ رنگ ......رنگ بھی کیسے...... کچے رنگ......"

اور ہوا کی آنکھوں میں حیرت نئے موسموں کی طرح اترتی ہے اور وہ حیران ہو کر سوچتی ہے۔

"ایسا بھی کوئی موسم ہے جو مستقل ٹھہرے۔"

کسی نے کھڑکی کھول دی تھی۔ ہوا' بادل' خوشبو' اوائل بہار کی سرگوشیاں کمرے کے کونے کونے میں گھس کر شرارت سے ہنسنے لگیں۔

"بند کھڑکی نئے موسموں کا راستہ نہیں روک سکتی نادان لڑکی۔"

اس نے آنکھیں کھولیں اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر جھنجلا گئی۔

"یہ کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"کھڑکی بند کر دو......" تابی کے لہجے میں تلخی رچی تھی۔ وہ چوکھٹ پر دونوں ہاتھ جمائے باہر جھانک رہا تھا' اس کی طرف پلٹ کر سادگی سے پوچھنے لگا۔

"اس سے کیا ہوگا......؟" تابی نے لب بھینچ لئے۔

"تمہیں تازہ ہوا بری لگتی ہے؟" پھر اسے خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔

"کمرے میں گھٹن سی ہو رہی تھی۔ اب اچھا لگ رہا ہے۔"

(جن کے اندر دھواں ہی دھواں ہو' انہیں کمرے کی گھٹن کیا کہے گی)

وہ میز پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ معاذ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا پھر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"زندگی اتنی بری تو نہیں تابی......"

"ہاں' اس سے زیادہ بری ہے۔"

"زندگی سے کیوں ڈرتی ہو......؟" وہ اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"میں نہیں ڈرتی......" تابی کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"لوگوں سے......؟"

"نہیں......" وہ جز بز ہو گئی۔

"ان کی باتوں سے......"

"میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" وہ بپھر کر بولی۔ معاذ سکون سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا

رہا۔ وہ جھنجلا کر کھڑی ہو گئی۔

"پھر کیوں سب سے چھپ جانا چاہتی ہو۔ صرف اس لئے کہ تم کسی کا سامنا نہیں کر سکتیں۔"

"معاذ! تم چلے جاؤ یہاں سے۔" اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ اتر آئی۔

"تم دنیا کی پہلی طلاق یافتہ عورت نہیں ہو تابی......" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ تابی کو سفاک لگا۔ وہ بے جان سی ہو کر کرسی پر گر گئی۔

"طلاق اتنی بری چیز نہیں ہے تابی! وہ زندگی اس سے کہیں بری ہے جو دو انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ وفا' خلوص' محبت اور اعتبار سے عاری زندگی۔ آپ ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے ہوں۔ پھر بھی مجبوری کے بندھن بھی بندھے رہیں۔ یہ تو نجات ہے تابی! ایک ناپسندیدہ اور تکلیف دہ بندھن سے چھٹکارا پانے کا سیدھا راستہ۔" اس کا لہجہ سادہ' الجھا ہوا اور پر اثر تھا۔

آنسو قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں سے برسنے لگے جو التجا کرتے تھے کہ وہ ان زخموں کو مت کریدے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسکنے لگی۔

"چہرہ چھپانے سے کیا ہوگا تابی۔ فیس کرو اس ساری سچویشن کو۔ زندگی بند کمرے میں نہیں گزر سکتی۔ بڑے بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔"

"سب مجھے الزام دیں گے......" وہ ڈری ہوئی تھی۔

"سو واٹ...... تمہارے لئے تمہارا اپنا وجود اہم ہونا چاہئے۔ تمہاری سوچیں' تمہارے خواب' لوگوں کو کہنے دو...... تمہارا دل مضبوط اور مطمئن ہونا چاہئے۔ زندگی آج بھی خوبصورت ہے۔ راستے آج بھی کھلے ہیں۔ آگے بڑھو' اپنے لئے راستہ تلاش کرو۔" معاذ کا لہجہ پر سکون اور سادہ تھا۔ تابندہ نے ہاتھ ہٹا لئے اور دوپٹے سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

"خدا گواہ ہے معاذ! میں نے نباہ کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ شخص۔ اسے عورت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو دنیا بھول جانا چاہتا تھا۔ ولی ہونا چاہتا تھا۔ اپنے نفس پر قابو پا کر فنا ہو جانا چاہتا تھا...... میں اس کے لئے ایک تجربہ تھی' بس اس کی دسترس میں تھی مگر وہ...... اس نے کہا عورت شیطان کی آلۂ کار ہے...... ایک بہکاوا ہے...... راستہ روک دیتی ہے...... بھٹکا دیتی ہے ...... میں کیا کرتی معاذ......!! اسے میری ضرورت ہی نہیں تھی۔"

کتنے عرصے کے رکے آنسو بہہ نکلے تھے۔ معاذ نے اسے روکا نہیں۔ وہ روتی رہی اور کہتی رہی۔ معاذ لب بھینچے سنتا رہا۔ یہاں تک وہ تھک کر خاموش ہو گئی۔ معاذ کھڑا ہو گیا۔ پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ تابندہ خود سے لڑنے لگی۔

"اس نے یہ سب معاذ سے کیوں کہا؟"

* * *

معاذ قالین پر بیٹھا پسٹل صاف کر رہا تھا۔ لمبا برش، کپڑا، تیل وہ بڑے انہماک سے ایک ایک پرزے میں سے برسوں کی جمی گرد اور میل صاف کر رہا تھا۔

"یہ کس کا ہے معاذ بھائی......؟" رانیہ نے پوچھا۔

"آغا جی کا......" اس نے بنا سر اٹھائے جواب دیا۔

"یہ چیز حفاظت کیلئے ہوتی ہے اور یہاں فالتو پرزے کی طرح پڑا ہے۔"

رانیہ صوفے پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ معاذ نے صاف کر کے کچھ جگہوں پر برش سے تیل لگایا۔ پھر بند کر کے ٹریگر دبایا۔ وہ کڑچ کڑچ کی آواز دے رہا تھا۔ پھر مطمئن ہو کر رانیہ کی سمت دیکھا۔

"تمہیں پسٹل چلانا آتا ہے......"

"مجھے، بالکل نہیں...... میں نے تو کبھی اسے ہاتھ میں بھی نہیں لیا۔"

"چلو، تمہیں پسٹل چلانا سکھاتے ہیں۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔ رانیہ نے اٹھنا چاہا۔ اس نے دوبارہ کھینچ کر بٹھا لیا اور اسے پستول کے حصوں کے متعلق بتانے لگا۔ "یہ میگزین، یہ سیفٹی کیچ یہ......" کندھا سے کندھا جوڑے وہ اس کی سمت جھکا پستول اس کے سامنے کئے بتا رہا تھا۔ رانیہ کچھ پزل سی ہوگئی۔ آنی ٹھٹک کر دروازے میں رکیں، کچھ لمحے دیکھتی رہیں۔ معاذ نے سیدھا ہو کر پسٹل رانیہ کے ہاتھ میں دے دیا تو وہ اسی خاموشی سے واپس پلٹ گئیں۔

"پہلے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہیں" معاذ نے کہا مگر رانیہ سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ معاذ نے دو تین بار ہٹا کر دکھایا۔ رانیہ حیرت سے اس کے مضبوط ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں سیفٹی کیچ کاغذ کا بن جاتا تھا اور رانیہ کی دفعہ پتھر۔

"مجھ سے نہیں ہٹتا۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"بہت ہی نازک اور کمزور ہاتھ ہیں تمہارے۔ پہلے تمہیں انگلیاں مضبوط کرنے کی ایکسر سائز سکھانا ہوگی۔" معاذ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ رانیہ چڑ کر کھڑی ہوگئی۔

"مجھے نہیں سیکھنی......"

"جا کہاں رہی ہو۔ مجھے ایک کپ کافی ہی پلا دو......" وہ ٹانگیں پھیلا کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"مجھے تو کافی بنانا نہیں آتی......" رانیہ تھوڑی شرمندہ ہوئی۔ معاذ مسکرا دیا۔

"کچن کیبنٹ میں انسٹنٹ کافی کا ڈبہ رکھا ہے۔ اسے بنانے میں زیادہ مشکل پیش

نہیں آتی۔" رانیہ کچن میں آ گئی۔ آنی دودھ ابال رہی تھیں۔

"معاذ بھائی کافی مانگ رہے ہیں۔"

جب تک آنی نے کافی بنائی۔ وہ وہیں کھڑی گاجر کھاتی رہی تھی۔ انہوں نے کافی سے بھرا مگ چھوٹی ٹرے میں رکھا۔ ٹرے اسے تھماتے ہوئے بولیں۔

"معاذ کے ساتھ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جی!" رانیہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ وہ خلاف توقع اسے سخت سست نہ کہہ سکیں کہ وہ ایک بار بات کو سن اور سمجھ کیوں نہیں لیتی بلکہ رخ بدل کر ابلتے ہوئے دودھ کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

"تم نے بنائی ہے۔" معاذ عالیہ آنٹی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس سے پوچھنے لگا۔

"جی......" وہ پلٹ گئی۔ معاذ مسکرا دیا مگر وعدے کے مطابق اسے رانیہ کی بات پر اعتبار کرنا ہی تھا۔ رانیہ بددل سی ہو کر باہر نکل گئی۔ لمبی سفید ڈاڑھی والا کبڑا بابا اسے پکار رہا تھا۔

"دیکھو بیٹا! کیاریوں میں کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں؟" رانیہ کو غصہ تھا۔ بابا نے اسے بیج نہیں بونے دیے تھے۔ وہ ہار سنگھار کے پیڑوں کے پیچھے غائب ہوگئی۔ یہ کافی بڑا حصہ یونہی بے کار پڑا تھا۔ لمبے لمبے درختوں اور خودرو جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ بے حد پر سکون اور خاموش۔ رانیہ کو لگتا وہ کسی جنگل میں سفر کر رہی ہے۔ بہت دیر تک وہ یونہی ادھر ادھر گھومتی پھوٹتی کونپلوں کو دیکھتی رہی۔ دھرتی اپنا پیراہن بدلنے کو تھی۔ بہار ذرا سا مسکرائی تھی۔

وہ آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔ اسے لگا، وہ ایک قدیم کہانی کا خوبصورت کردار ہے اور یہ جنگل اس کا گھر۔ اس کی سماعتیں پھولوں کے چٹکنے کی صدا سنتی تھیں۔ ہوا کی پتیوں سے سرگوشیاں، تتلی کے پروں کی آہٹیں...... بلبل کے گیت...... کوئل کی کوکو...... اور...... اور کسی کے قدموں کی چاپ......خشک چرچراتے پتے......ٹوٹی شاخیں۔

چاپ اس کے قریب آ کر گم صم ہوگئی۔

رانیہ نے اس چاپ کو ہوا کی شرارت جانی۔ اپنا دھیان پھر سے آوازوں کی سمت کر لیا۔ وہ سب چیزوں کو تخیل کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔

پھول، تتلیاں، کوئل، پتے، ہوا اور...... اور معاذ......

"معاذ......!" اس نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے معاذ کو بیٹھے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ معاذ کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدلے۔ وہ قصداً مسکرایا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا، میں آیا ہوں۔"

"یہ تمہیں تمہاری خوشبو سے پہچاننے لگی ہے۔" ہوا ہنسی۔ وہ دونوں ہوا کی سرگوشی سن نہیں سکے۔ ننھی کونپل اندر پھوٹی تھی۔ ابھی خوشبو پھیلنے کا موسم نہیں آیا تھا۔ ابھی تو بہار آغاز سفر میں تھی۔ رانیہ نے ایک طویل سانس کھینچی۔ وہ اجنبی مگر مانوس خوشبو اب بھی آ رہی تھی اور وہ بے حد حیرت سے معاذ سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ کون سی خوشبو لگاتے ہیں معاذ بھائی......؟"

"کوئی بھی نہیں......" وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"بہت سکون ہے یہاں......مگر اتنی زیادہ خاموشی میں تمہیں وحشت نہیں ہوتی۔"

"ہاں بہت سکون ہے یہاں...... میں ہوں اور......" پھول' خوشبو' ہوا اور تتلیوں کا ذکر کرتے کرتے اس کی نگاہ بھٹک کر معاذ تک گئی تو سر جھٹک کر بولی۔

"معاذ بھائی! آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔"

"ہوں" وہ چونکا۔ "ہاں......"

رانیہ کو وہ کچھ چپ چپ سا لگا۔ مگر وہ اسے ساتھ لئے ایک کونے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر ایک سوکھے درخت کے پاس بیٹھ کر خشک پتے ہٹانے لگی۔

"یہ دیکھیں......"

معاذ اس کے نزدیک پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ ایک ننھی سی خودرو بیل تھی۔ جو بڑھ کر کھوکھلے تنے سے لپٹ گئی تھی۔ چھوٹی سی بیل پر تین سرخ پھول کھلے تھے۔

"محبت......!" معاذ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیا مطلب......؟" رانیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

"ایک انگلش پوئم یاد آ گئی تھی۔ جس میں شاعر نے محبت کو ایک ایسی ہی خودرو بیل سے تشبیہ دی تھی۔ جس نے اس کے بنجر وجود کو سبز خوشبو سے بھر دیا تھا۔"

معاذ نے ہاتھ بڑھا کر ایک پھول توڑا اور اس کی سمت بڑھا دیا۔

"سبز رتوں کا پہلا پھول......"

رانیہ کے کچھ نہ بولنے پر وہ خود پلٹ گیا۔ رانیہ نے اس ننھی سی بیل کو دیکھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے پھول کو۔ اس کی انگلیوں نے آہستگی سے پھول کی نرم پتیوں کو چھوا۔

"محبت......" اس کے لب بے آواز گنگنائے۔ رانیہ کو لگا۔ سرخ رنگ اس کی انگلیوں پر اتر آیا ہے مگر اس نے سر جھٹک کر اس نامعلوم احساس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تھی ہوا کے لبوں پر خوشبو بھری مسکان تھی۔

پھول کو نرمی مٹھی میں چھپائے وہ گھر کے اندر آئی۔ اس سے قبل کہ سیڑھیاں چڑھ

جاتی۔ آنی اسے بازو سے کھینچ کر لاؤنج میں لے آئیں۔ آفاق نے بے حد حیرت سے غصب ناک ہوتی آنی کو دیکھا۔

"کیا کر رہی تھیں تم وہاں؟"

"آنی!" وہ سہم گئی۔ "میں تو......"

ان کا بھرپور تھپڑ رانیہ کے گال پر پڑا۔ وہ صوفے پر گری۔ آفاق اسٹک سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا کر رہی تھیں تم وہاں معاذ کے ساتھ۔" وہ دبے دبے آتشیں لہجے میں چیخیں۔

"آنی! کیا کر رہی ہیں......" انہوں نے ایک دم سامنے آ کر آنی کا دوبارہ اٹھا ہاتھ روکا۔

"اس سے پوچھو' یہ معاذ کے ساتھ وہاں کیا کر رہی تھی...... میری ذرا سی نظر چوکی نہیں کہ یہ لگی ہے نئے گل کھلانے یہ......" وہ غیض وغضب سے کانپ رہی تھیں۔

"بس کریں آنی......" آفاق کا لہجہ سخت تھا۔ انہوں نے روتی ہوئی رانیہ کو بازو میں سمیٹا۔ "مت کریں اس کے معصوم ذہن کو اس طرح آلودہ......"

"معصوم...... یہ صرف نظر آتی ہے معصوم......" انہوں نے رانیہ کے پاؤں کو ٹھوکر لگائی۔ "لیکن اس سے کہہ دو۔ اب میں نے اسے معاذ کے ساتھ تنہا دیکھا تو گلا گھونٹ دوں گی۔"

"آپ چلی جائیں یہاں سے......" آفاق سخت غصے میں تھے۔ آنی پلٹ کر اوپر چلی گئیں۔

"آفاق بھائی! میں تو صرف معاذ بھائی کو بیل دکھا رہی تھی......"

"میں جانتا ہوں......" انہوں نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا۔ "آنسو صاف کرو اور معاذ سے بلکہ کسی سے بھی کچھ مت کہنا۔"

"میں تو ان سے بات بھی نہیں کروں گی۔ ورنہ آنی تو مجھے سچ مچ مار ڈالیں گی......" وہ ڈر گئی تھی۔

آفاق لب بھینچ کر رہ گئے۔

* * *

عمر اور حمزہ واپس آ گئے تھے۔ ان کے پاس سنانے کو کئی کہانیاں تھیں۔ مگر سننے والا کوئی نہیں۔ وہ آپس میں ہنستے رہتے۔ ان کی آوازیں سن کر سکوت کا بوڑھا پنچھی جھنجھلا جاتا۔ وہ گھر سے باہر چلے جاتے تو پرسکون ہو جاتا۔ معاذ رانیہ سے پوچھتا۔

"بلبل! خاموش کیوں ہو گئی ہو؟"

وہ کچن میں گھس جاتی۔ معاذ کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس کی تابندہ کے ساتھ ڈسکشنز بڑھ گئی تھیں۔ وہ جانے سے قبل اس لڑکی کو زندگی جینا سکھانا چاہتا تھا۔

"باہر نکلو' اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاؤ۔ اس طرح خود کو ضائع مت کرو تابی۔ خود کو اتنا مضبوط کرو کہ زندگی میں کوئی بھی حادثہ تمہیں ہلا نہ سکے۔"

وہ اسے کھینچ کر باہر لے آتا۔ سب لوگوں کے درمیان۔ آغا جی خوش ہو جاتے۔ وہ تابندہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ خوش تو آنی بھی ہوتی تھیں مگر تابی ان سے کوئی بات نہ کرتی۔ رانیہ شکوہ کناں نگاہوں سے آفاق کو دیکھتی۔

"آنی تابی کو کیوں منع نہیں کرتیں کہ وہ معاذ سے بات نہ کرے۔"

وہ مسکرا دیتے۔ ان کی مسکراہٹ بے حد عجیب ہو گئی تھی۔ رانیہ کو وحشت سی ہوتی۔

ان ہی دنوں ایک اپائنٹمنٹ لیٹر آ گیا۔ آفاق کو جاب مل گئی تھی۔ پہلی بار کسی نے ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہا تھا ان کی معذوری سے ہٹ کر۔ عالیہ آنٹی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اب اپنا ناول بھی مکمل کر ہی لیجئے آفاق۔" معاذ نے انہیں مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سنجیدہ سے ہو گئے تھے۔

"کہانی رخ بدل گئی ہے......"

معاذ کی ممی کا پھر فون آیا تھا۔ اب کے انہوں نے معاذ کو سختی سے واپس آنے کو کہا تھا۔

* * *

رات جا رہی ہے' چاند ڈھل رہا ہے
دھیرے دھیرے آسماں رنگ بدل رہا ہے
میرے دل کی راہوں میں' پلکوں کی چھاؤں میں
کوئی میرے ساتھ چل رہا ہے
میرے ساتھ کون چل رہا ہے؟

وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکائے کائنات کے سناٹے میں پھیلی رات کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دیکھ رہی تھی۔ بک ریک سے کتابیں نکال کر ان پر جمی گرد صاف کرتے ہوئے تابی نے کئی بار اسے دیکھا۔ نم ہوا کے جھونکے اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اس کی نگاہیں بادلوں کی اوٹ میں چھپے چاند کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ستاروں کی روشنی مدھم تھی۔ تابی کو وہ کچھ اداس نظر آئی۔

اونگھتے ہیں پیڑوں پہ قافلے بہاروں کے
کروٹیں بدلتے ہیں جسم رہگزاروں کے

سرمئی گھٹاؤں میں' بدلیوں کی بانہوں میں
ہر تارہ آنکھیں مل رہا ہے' چاند ڈھل رہا ہے

"تابی! تمہیں معاذ کیسے لگتے ہیں......؟"

تابندہ یہ جان کر وہ معاذ کے بارے میں سوچ رہی ہے' ششدر سی رہ گئی۔

"مجھے وہ بہت اچھے لگتے ہیں اور میرا دل چاہتا ہے' وہ کبھی واپس نہ جائیں۔"

رانیہ معاذ کے جانے سے اداس تھی۔ تابندہ اس کے قریب آ گئی۔ کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھمایا۔

"تمہیں معاذ کیوں اچھے لگتے ہیں رانیہ......؟"

"کیونکہ وہ میری بات سنتے ہیں اور اس پر یقین بھی کرتے ہیں خواہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ ابھی تک اسی مقام پر کھڑی تھی جہاں سے آفاق اور معاذ کی محبت ایک سی نظر آتی تھی۔ ابھی آگہی کا عذاب جسم و جاں پر نہیں اترا تھا۔

"تمہیں ہر وہ شخص اچھا لگتا ہے جو تمہارے جھوٹ پر یقین کرے۔"

تابی اس کے اندر اتر جانا چاہتی تھی۔ اس کے دل کے کونے کونے میں جھانک کر اپنے اندر ابھرتے خیال کی نفی کرنا چاہتی تھی۔

"اعتبار اچھا لگتا ہے تابی! جب کوئی ہم پر کرے۔"

وہ بڑے ضبط سے بولی تھی اور تابی کو لگا' رانیہ کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے۔

"آنی نے تم سے کچھ کہا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں وہی کرچیاں تلاشنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جنہیں نکالتے نکالتے وہ خود لہولہو ہوئی تھی۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" وہ اسکے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹی۔ "اچھے لوگ جانے کی بات کریں تو دکھ تو ہوتا ہے۔ معاذ بھائی نے میری چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کی تھیں۔ وہی خواہشیں جو پوری ہو جائیں تو پتا بھی نہیں چلتا۔ نہ ہوں تو ساری عمر حسرتیں بن کر دل میں بس جاتی ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی ہماری بات' کسی خواہش کو اہم جانے' دوسرے معنوں میں وہ ہمیں اہم سمجھ رہا ہوتا ہے۔"

وہ اب کتابیں پڑھنے لگی تھی اور بڑی بڑی باتیں سیکھنے لگی تھی۔

"معاذ بھائی بہت زیادہ اچھے ہیں۔ مجھے اچھے لگتے ہیں اگرچہ وہ کہتے ہیں...... میں جھوٹ بولتی ہوں اور میں زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتی...... مگر دیکھو' انہوں نے تمہیں کتنا بدل ڈالا۔ ورنہ تم تو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی تھیں۔ اب تم نے کتابیں بھی کھول لی ہیں۔"

"آنے والوں کو واپس تو جانا ہی ہوتا ہے رانیہ!"

"تو پھر وہ آتے کیوں ہیں......"

تابی کا دل چاہا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ مگر وہ خشک آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"تابی! تم سے ایک سوال پوچھوں......" وہ بے حد جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور تابی جانتی تھی کہ وہ کیا پوچھے گی۔ اس نے کھینچ کر رانیہ کو ساتھ لگا لیا۔

"کچھ مت پوچھنا رانیہ! کچھ مت پوچھنا۔"

اس کا اپنا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور رانیہ حیرت زدہ تھی۔ اس شام تابی نے معاذ سے کہا۔

"تم واپس چلے جاؤ۔"

"واپس تو مجھے جانا ہی ہے۔ مگر نکالا کس خوشی میں جا رہا ہوں۔" وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"رانیہ تم سے بہت اٹیچ ہو رہی ہے......"

"میں بھی اس سے بہت اٹیچ ہو گیا ہوں۔ وہ بہت معصوم اور اچھی لڑکی ہے۔"

"ہاں، وہ بہت معصوم ہے۔ اس کی معصومیت برقرار رہنے دو۔ وہ ابھی تمہیں پسند کرتی ہے اور اس کے بعد......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لب کاٹنے لگی۔

"اس کے بعد......؟" معاذ نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"وہ تمہاری عادی ہوتی جا رہی ہے معاذ!"

"اس کے بعد......" معاذ کا انداز ہنوز وہی تھا۔ تابی نے جھنجھلا کر رخ بدلا۔

"محبت جرم ہے اس معاشرے میں۔ اور مجھے ڈر ہے وہ لڑکی اس جذبے کی اسیر نہ ہو جائے۔ رانیہ محبتوں اور توجہ کو ترسی ہوئی ہے۔ جو بھی اس کا ہاتھ پکڑے گا۔ اس پر اعتبار کرے گی۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ چل دے گی۔ خواہ وہ تم ہو یا کوئی اور...... ہم جیسی لڑکیاں۔ جنہیں محبت اپنے سے وابستہ لوگوں اور رشتوں سے نہیں ملتی۔ وہ اسے یونہی غیروں کی آنکھوں میں ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ بہت بھیانک انجام ہوتا ہے۔ یہاں تو محبت کا نام لینے پر سنگسار کر دیا جاتا ہے۔"

"تمہارا آنی سے کیا جھگڑا ہے......؟" وہ بات کو کہیں کا کہیں لے گیا۔ تابی کے لبوں پر طنز بھری مسکراہٹ پھیلی۔

"کچی عمر تھی۔ ذرا سا تجسس۔ ماں کو سہیلی سمجھ بیٹھی تھی۔ بس پوچھ لیا۔ ماں محبت کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے یہ نہیں بتایا...... محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ ضرور سکھا دیا۔ محبت کا نام لینے کی سزا کیا ہوتی ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میں نہیں چاہتی یہی سوال رانیہ مجھ سے پوچھے۔ میں اسے دوسری تابی نہیں بننے دوں گی۔ ابھی تو وہ سمجھتی ہے کہ وہ تم سے اور آفاق سے ایک جیسی محبت کرتی ہے۔ کل کو اس کا فرق جان لینے کی کوشش کی تو کیا ہوگا۔"

"تابی! تم سے ایک بات پوچھوں......؟" معاذ پنجوں کے بل اس کی سمت گھوما۔

"پوچھو......؟" تابی کی سوالیہ نظریں معاذ کی طرف اٹھیں۔ معاذ نے دونوں ہاتھ میز پر ٹکا کر جھکتے ہوئے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم محبت کا مفہوم کیوں جاننا چاہتی تھیں۔؟"

دروازے کے باہر کھڑی رانیہ تابی کا جواب نہیں سن سکی تھی۔ شاید اس نے جواب دیا ہی نہ تھا لیکن اس رات رانیہ نے سوچا تھا۔

"کیا اسے معاذ سے محبت ہو سکتی ہے؟"

اندر سے ملنے والے جواب نے اسے پسینہ پسینہ کر دیا۔ وہ اتنا ڈری کہ بنا آنی کی طرف دیکھے کمبل میں چھپ گئی تھی۔

* * *

پرسوں اسے واپس چلے جانا تھا۔ جہاں آنی کے وجود میں بے کلی سمائی تھی۔ وہیں رانیہ کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس کی پلکوں پر نمی مستقل ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی اور وہ سب سے چھپتی پھر رہی تھی۔ حتیٰ کہ معاذ سے بھی۔

"کیا یہ لڑکی......" معاذ دوراہے پر کھڑا تھا۔ اس نے ممی سے بات کی تھی۔ وہ خاموش رہ گئیں۔ پھر بس اتنا ہی کہا۔

"تم واپس آجاؤ' میں نے تمہارے لئے لڑکی پسند کر لی ہے۔"

وہ پاکستان میں نہیں پلا بڑھا تھا۔ جہاں اولاد کے فیصلے والدین کرتے ہیں۔ اس نے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا کہ فیصلہ وہ کر چکا ہے۔

"سوری مام! میں شادی تو رانیہ سے ہی کروں گا۔"

انہوں نے فون کھٹ سے بند کر دیا۔ معاذ مطمئن تھا۔ وہ لڑکی اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ اس کے اندر سما گئی تھی۔ پاپا اس کے ساتھ تھے اور ممی کو منانا اتنا مشکل کام نہ تھا۔ بس اسے ایک بار امریکہ جانا تھا۔

"ممی نے ابھی تک رانیہ کو دیکھا نہیں۔"

رات بہت ہو گئی تھی اور نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ وہ کافی بنانے کے ارادے سے

نیچے آیا۔ پھر آخری سیڑھی پر ہی رک گیا۔ لاؤنج خالی تھا مگر رائٹنگ ٹیبل پر آفاق کی جگہ رانیہ بیٹھی تھی۔ سر رائٹنگ ٹیبل پر رکھے کسی کتاب کے عنوان پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اندھیرا اس کے چاروں طرف پھیلا تھا۔ بس لیمپ کی ہلکی سی روشنی تھی جو اس کے بالوں اور آدھے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔ معاذ کچن میں چلا گیا۔ دو مگ کافی کے بنا کر لوٹا۔ تو وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

"رانیہ! سو گئی ہو!" اس کی مدہم آواز پر رانیہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"رو رہی ہو......" وہ اس کے سامنے میز پر بیٹھ گیا۔

"نہیں تو......"

معاذ نے غور سے اسے دیکھا پھر مسکرا کر پوچھنے لگا۔ "کیا سفید جھوٹ پر بھی یقین کرنا ہوگا۔"

رانیہ خاموشی سے آنسو صاف کرنے لگی۔ پھر کھڑی ہوگئی، مگر معاذ جب تک راستہ نہ چھوڑتا وہ جا نہیں سکتی تھی۔

"بیٹھ جاؤ رانیہ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"آنی خفا ہوتی ہیں......"

"اور تھپڑ بھی مارتی ہیں......" معاذ نے ٹٹولتی نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" رانیہ کو شرمندگی نے گھیر لیا۔ معاذ نے جواب کی جگہ مگ اس کی سمت بڑھا دیا۔

"بیٹھ جاؤ۔ آنی اب کچھ نہیں کہیں گی۔" وہ خود اٹھ کر فلور کشن پر بیٹھ گیا۔ رانیہ کو بیٹھنا پڑا۔

"آپ جا رہے ہیں؟" بہت دیر کی خاموشی کے بعد رانیہ نے پوچھا تھا اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"تم اسی لئے رو رہی تھیں......"

رانیہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا پھر خاموش ہوگئی۔ جو آپ کے جھوٹ پر بھی اعتبار کرتا ہو اس کے سامنے جھوٹ بولنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"میں واپس آؤں گا رانیہ......" رانیہ نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

"تمہارے لئے۔"

رانیہ کا دل ایک پل کو دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔ "تم زندگی میں کبھی کوئی بڑا کام نہیں کرسکتیں۔ مگر قسمت خود تم پر مہربان ہوگی۔"

"کیا قسمت مجھ پر مہربان ہوگئی ہے......" وہ متحیر سی سوچ رہی تھی۔

"میں نے جھوٹ کہا تھا کہ تم زندگی میں کبھی کوئی بڑا کام نہیں کرسکتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی بڑا کام کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی تابی بن جاؤ۔ زندگی میں کوئی مسئلہ ہو اور تم دنیا سے چھپ کر کمرے میں بند ہو جاؤ۔ تمہیں دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھنا ہوگا۔ یہ پھول، کلیاں، تتلیاں، جگنو، زندگی کا خوبصورت حصہ ہیں۔ زندگی نہیں۔ میں واپس آؤں تو......"

"مت دو اس کے ہاتھ میں کوئی خواب......" آنی کی آواز پر جہاں رانیہ گڑبڑا کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہیں معاذ نے بے حد سکون سے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"رانیہ! اوپر جاؤ......" آنی کا لہجہ و انداز ناقابل فہم تھے۔ اس نے گھبرا کر معاذ کو دیکھا۔ پھر مگ ٹیبل پر رکھ کر اوپر چلی گئی۔ آنی تیر کی طرح اس کے سامنے آئیں۔

"تم واپس جا ہی رہے ہو تو اسے اپنا پابند کیوں کر رہے ہو۔"

"کیونکہ مجھے اس کے لئے واپس آنا ہے۔" معاذ کا انداز ہنوز پرسکون تھا۔ وہ بپھر گئیں۔

"جھوٹ...... بکواس...... دھوکا...... فریب...... تم کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گے، معاذ کبھی نہیں۔"

"آپ کو اتنا یقین کیوں ہے......؟"

"جس خواب کو سچ ہونا ہی نہیں......"

"آپ کو کس نے کہا اس خواب کو سچ نہیں ہونا......" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیونکہ تم......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"جملہ پورا کریں آنی!"

"تمہاری ماں اس رشتے پر راضی نہیں ہے۔" آنی جھنجھلا گئیں۔

"میں واپس جاؤں گا تو انہیں منا لوں گا۔" اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔

"بکواس کرتے ہو تم...... تم انہیں کبھی نہیں منا سکو گے......" وہ چیخ اٹھیں۔ معاذ نے ان کے کانپتے وجود کو دیکھا۔ "اور میں اپنی بیٹی کو انتظار کی سولی پر لٹکنے نہیں دوں گی۔ اس کی سکون سے گزرتی زندگی کو کانٹوں کا سفر مت بناؤ۔"

"آپ کو یقین کیوں نہیں آتا آنی...... ٹھیک ہے۔" معاذ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں رانیہ سے ابھی اور اسی وقت نکاح کرنے کو تیار ہوں۔"

"شٹ اپ!" وہ حلق کے بل چلائیں۔ پھر انگلی اٹھا کر وارننگ کے انداز میں بولیں۔ "اب میری بیٹی کا نام تمہاری زبان پر نہ آئے۔ پرسوں تم جا رہے ہو۔ بہتر ہے، جانے سے

قبل رانیہ سے کہہ دو کہ تم کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ یہ تمہارے لئے بھی بہتر ہے اور رانیہ کے لئے بھی۔“

وہ پلٹیں۔ پھر ٹھٹک گئیں۔ آخری سیڑھی پر تابندہ کھڑی تھی۔ وہ قدم قدم چلتی ان کے سامنے آئی۔

”میں سمجھتی تھی۔ ماں صرف ماں ہوتی ہے۔ نہ سگی نہ سوتیلی۔ مگر آپ نے تو ثابت کر دیا۔ سوتیلی ہمیشہ سوتیلی رہتی ہے کبھی ماں نہیں بنتی۔“

”تابندہ!“ وہ لڑکھڑا گئیں۔ انہوں نے اپنی آدھی عمر ان بچوں کو دی تھی۔ ایک ایک پل...... ایک ایک لمحہ...... کہیں کوئی کھوٹ، کہیں کوئی جھوٹ نہیں۔ چوبیس برس کے بعد سوتیلی کے طعنے نے ان کے قدم اکھاڑ دیئے۔

”معاذ رانیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ اس کے اتنا خلاف کیوں ہیں جبکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ رانیہ بھی اسے چاہنے لگی ہے۔“

”یہ چاہت ایک جھوٹ ہے، دھوکا ہے تابی......“ ان کی آواز کمزور اور لرزتی ہوئی تھی۔

”آپ کے پاس ایسا کون سا پیمانہ ہے جس پر آپ جھوٹ اور سچ کو پرکھتی ہیں۔ معاذ کے ماتھے پر لکھا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

”تابندہ! تم......“ معاذ نے کچھ کہنا چاہا مگر تابندہ نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔

”نہیں معاذ! مجھے ان سے بات کرنے دو۔ انہوں نے ہم سے کھلی دشمنی کی ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا۔ میں نے صبر کر لیا۔ لیکن...... رانیہ...... وہ معصوم لڑکی جس کے سامنے یہ دن کو بھی رات کہتیں تو وہ مان لیتی تھی۔ اس کے ساتھ یہ سلوک......

”تابی! میں نے تم لوگوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔“ وہ کراہیں۔

”یہی دھوکا...... یہی دھوکا تو کھایا آغا جی نے۔ کہ سب کچھ آپ پر چھوڑ کر بے فکر ہو گئے۔ کاش وہ جان سکتے کہ آپ کی اصلیت کیا ہے۔“ وہ شعلے کی طرح بھڑک رہی تھی۔ آنی کا وجود بھڑ بھڑ جلنے لگا۔ ”مجھے صرف اتنا بتائیں، محبت سے اتنی خائف کیوں ہیں آپ......؟ کیا سمجھوں میں...... کس کا بدلہ آپ ہم سے لے رہی ہیں...... کس کے کیئے کی سزا ہے جو ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔ بتائیں آنی...... ماضی کا کوئی دھوکا، کسی کی بے وفائی یا......“

”شٹ اپ تابندہ......“ معاذ ایک دم ان دونوں کے درمیان آیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کنپٹی کی رگ پھڑک رہی تھی۔ تابندہ اس کی آنکھوں میں امڈ آئے غصے سے خائف ہو کر خاموش ہو گئی۔

”تم حد سے بڑھ گئی ہو۔“

”مجھے حد سے بڑھنے پر کس نے مجبور کیا مسٹر معاذ......؟“ وہ زہرخند لہجے میں پوچھنے لگی۔

”تم جا سکتی ہو۔ یہ میرا اور آنی کا معاملہ ہے۔“ وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔

”یہ رانیہ کا معاملہ ہے اور میں رانیہ کو اپنی طرح برباد ہونے نہیں دوں گی، یہ سمجھا دینا اپنی آنی کو......“ وہ ایک تلخ سی نگاہ ان پر ڈال کر اوپر چڑھ گئی۔ معاذ نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی سعی کی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرے تو وہ آگ کی طرح تپتا محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آنی گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھی تھیں۔ وہ اس نیم تاریکی میں ان کا لرزتا وجود دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ان کے قریب بیٹھ کر کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آئی ایم ساری آنی! تابندہ کو یہ سب......“

آنی نے سیدھے ہو کر معاذ کو دیکھا۔ اس کی پیشانی، اس کے لب، اس کی آنکھیں، ٹھوڑی کا تل۔

کسے معلوم، کون اس راز کی صدیوں پرانی کیفیت سے آشنا ہے؟
یہ میرے چاروں طرف کیوں ایک سکوت بے صدا ہے؟
میں کس سے کہوں؟
میری اجڑی ہوئی آنکھوں کے خالی روزنوں کے اس طرف کیا ہے؟
خلا ہے یا ستارے پھانکتی اندھی ہوا ہے؟
کس پر کھل سکا ہے؟
جسم کے خالی کھنڈر میں کون اب تک بس رہا ہے؟
تم مجھے دیکھو
میں اپنے آپ سے ڈرتی ہوں شب کو
جب اندھیرا بولتا ہے
دل کا سناٹا پرانی داستانوں سے اٹے بھیدوں کی گرہیں کھولتا ہے۔
جب لہو کی آگ میں لت پت کواڑوں سے الجھتی ہیں مری چیخیں
کوئی سنتا نہیں مجھ کو
بکھرتے ٹوٹتے خوابوں میں جب تقسیم ہوتی ہوں۔
کوئی چنتا نہیں مجھ کو

”آنی! کیا ہو گیا ہے آپ کو...... کچھ تو بولیں، کچھ تو بتائیں......؟“

تو ایسا ہے کہ تم اپنی مہکتی نیند سے کھیلو۔ (نہ دکھ جھیلو)
میری تنہائی کے اسرار مت پوچھو
کہیں ایسا نہ ہو' تم بھی خود اپنے کو گنوا بیٹھو
مری خواہش اور اپنے درمیان بھیدوں بھری دیوار رہنے دو۔
مجھے صدیوں پرانی داستانوں کی طرح اندھی ہوا کے ساتھ۔
پراسرار...... رہنے دو۔

ان کی آنکھوں میں منجمد ہو جانے والے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ وہ کسی ایک تاثر' کسی بھی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر رہا تو گھبرا کر بول اٹھا۔

''آنی......'' اس کی آواز کی ضرب سے ان کے منجمد اعصاب آئینے کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے تو ایک کراہ سی لبوں پر ٹوٹ گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ رخ بدل گئیں۔

''آنی!''

''جاؤ معاذ......'' ان کی مدھم کپکپاتی آواز معاذ کو بے حد اجنبی محسوس ہوئی۔

''مگر میں......''

''معاذ پلیز......''

ان کے اندر ہواؤں کا شور بڑھ رہا تھا۔ مانوس آوازیں اندھے کنوئیں میں سر پٹخ پٹخ کر سسکیاں بھرنے لگیں۔ کھڑاک کھڑاک کھڑکیاں کھلتیں اور بند ہوتی تھیں اور وہ ڈرتی تھیں کہیں معاذ جھانک نہ لے۔ یہ کھلتی' بند ہوتی کھڑکیاں انہیں ماضی کی کچھ جھلکیاں نہ دکھا دیں۔ وہ سارے منظر جو ان کے اندر آگ سلگائے رکھتے تھے۔

ان کے عقب میں دروازہ آہستگی سے بند ہوا۔

تب ہی یادوں کی بے مہر ہوا نے ان کے اندر کئی برسوں کے بند' زنگ آلود دروازے کھڑاک کھڑاک کھول دیئے تھے۔

''سنو آئینہ! میں تھوڑا پزل ہو رہا ہوں۔''

آئینہ نے فائل سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر بے اختیار ہنس دی۔

''تم تو واقعی......''

''تمہیں ہنسی آ رہی ہے۔'' عمران نے اسے خفگی سے دیکھا۔ پھر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''تمہاری امی کیا پوچھیں گی۔؟''

''یہی خاندان' گھر اور تمہاری جاب وغیرہ کے بارے میں۔'' اس نے فائل بند کر کے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ پھر اپنی چیزیں پرس میں رکھنے لگی۔

''اور......''

''بھئی' مجھے کیا پتا۔ اب انہوں نے کوئی سوال نامہ تو لکھ کر رکھا نہیں ہے جو میں ایک ایک سوال کر کے تمہیں بتاتی جاؤں۔'' وہ مسکرا دی۔ اس وقت پزل پزل سا عمران معمول سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیئے سے جلنے لگے۔

عمران اس کے ساتھ ہی آفس سے باہر آیا۔

''آئینہ! کہیں وہ مجھے ریجیکٹ تو نہ کر دیں گی......'' فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ تشویش سے پوچھنے لگا۔ آئینہ نے ذرا سا رک کر اسے سرتاپا دیکھا۔

''کرنا تو نہیں چاہئے۔'' لبوں پر دبی دبی سی مسکان تھی۔ گویا خود اپنی ہی چوائس پر شاباش دی جا رہی تھی۔

''اگر انہوں نے میرے والدین کے بارے میں......'' وہ اپنی تسلی کر رہا تھا۔

''جب مجھے کوئی اعتراض نہیں تو انہیں بھی نہیں ہوگا۔'' وہ خاصی پراعتماد تھی۔

''آئینہ! تم تو میرا ساتھ دو گی نا۔ خواہ کیسے بھی حالات ہوں۔''

''عمران! تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

''نہیں' وعدہ کرو۔ کبھی ساتھ نہیں چھوڑو گی۔''

وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آئینہ نے کچھ حیران سا ہو کر اسے دیکھا اور مسکرا دی اور بے حد خاموشی سے ایک وعدہ وفا کی ڈوری میں لپیٹ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ تب اسے خبر نہ تھی۔ سڑک کے کنارے کئے گئے وعدے ہمیشہ ہواؤں کا رزق بنتے ہیں اور جن کی ہتھیلیوں کو یہ امانت سونپی جاتی ہے' وہ انہیں وہیں کسی سڑک کنارے رکھ کر بھول جاتے ہیں۔

''اچھا دیکھو۔'' آئینہ نے دور سے آتی بس کو دیکھا۔ ''ٹھیک چار بجے پہنچ جانا۔''

''اوکے۔'' وہ ہاتھ ہلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ آئینہ گھر پہنچی تو امی گھر پر نہیں تھیں۔ جبکہ اس کی پڑوسن اور سہیلی زیبی چپس تل رہی تھی۔

''یہ تم یہاں کیا کر رہی ہو اور امی کہاں ہیں......؟'' آئینہ نے حیرت سے پوچھا

''میں اپنی خاطر داری کر رہی ہوں اور آنٹی تمہارے کزن کے گھر گئی ہیں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''محسن بھائی کے گھر...... خیر تو ہے' صبح تک تو کوئی ارادہ نہیں تھا ان کا۔'' آئینہ ایک دم کوفت کا شکار ہو گئی۔ عمران کو آنا تھا اور اسے ابھی امی کے ساتھ بہت کچھ ڈسکس کرنا تھا۔

"ہاں' فون آیا تھا محسن بھائی کا۔ ثمینہ آپی کی طبیعت ٹھیک نہیں شاید۔" اس نے چپس پلیٹ میں نکالے اور چولہا بند کر کے کھڑی ہوگئی۔ "اچھا بھئی' میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اب جا رہی ہوں کیونکہ مجھے فلم دیکھنا ہے۔ کھانا خالہ پکا گئی ہیں۔"

وہ پلیٹ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ آئینہ اپنی سوچوں میں اسے رکنے کا بھی نہیں کہہ سکی۔

"خیر شام تک تو آ ہی جائیں گی......" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ برائے نام کھانا کھانے کے بعد اس نے ازسرنو گھر چمکایا۔ کچھ چیزیں گھر میں بنائیں۔ کچھ زیبی کے بھائی سے بیکری سے منگوائیں۔ امی واپس آئیں تو بے حد پریشان تھیں۔

"ثمینہ کی حالت خاصی خراب ہے۔ ڈاکٹر نے مکمل بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے' چوتھے کی آمد۔ گھر میں نہ کوئی ساس نہ نند۔ بے چاری کرے تو کیا کرے۔ ڈاکٹر نے تو صاف کہہ دیا ہے' بیڈ سے نیچے پیر نہیں اتارنا۔ ورنہ ماں اور بچہ دونوں جان سے جا سکتے ہیں۔ بے چاری بہت رو رہی تھی۔"

وہ تھوڑا پریشان تو ہوئی۔ مگر دھیان اب بھی پورے کا پورا عمران میں اٹکا تھا۔ وہ منتظر تھی۔ امی موضوع بدلیں تو وہ انہیں عمران کے بارے میں بتائے۔

"گوجرانوالہ سے اپنی ماں کو بلوایا ہے۔ اس نے۔ میں بھی آتی جاتی رہوں گی......"

تب ہی ان کی نظر آئینہ کے ہاتھ میں پکڑے ڈسٹر پر پڑی۔

"تم آتے ہی صفائی کیوں کرنے لگیں۔ کھانا کھا لیا تھا۔؟"

"کھا لیا تھا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ پھر صوفے کی بیک پر کپڑا پھیرتے ہوئے بتانے لگی۔

"امی! آج عمران آئیں گے۔"

"ہاں!" وہ چونکیں۔ پھر بے حد دھیان سے چم چم کرتے ڈرائنگ روم کو دیکھا۔ پھر بیٹی کے چہرے پر بکھرے رنگوں اور آنکھوں میں جگر جگر کرتی روشنیوں کو دیکھا۔

"وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے......" آئینہ نظریں جھکائے کہہ رہی تھی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئیں۔ پھر رسانیت سے پوچھنے لگیں۔

"ماں باپ ساتھ ہوں گے......؟"

وہ ایک پل کو گڑبڑائی۔ "نہیں۔ فی الحال تو اکیلا ہی آئے گا۔"

انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا پھر خاموشی سے کھڑی ہوگئیں۔

"ٹھیک ہے' چائے کا اچھا سا انتظام کر لینا۔"

وہ اندر چلی گئیں۔

"بس......" وہ بے تحاشا خوش تھی۔ "آپ ایک بار اس سے مل لیں۔ اپنے سارے سوال بھول جائیں گی۔ ہاں...... وہ ایسا ہی ہے۔"

وہ تتلی کی طرح اڑ رہی تھی۔

"محبت کتنا خوبصورت احساس ہے۔" شفق اس کے چہرے پر اتر آئی تھی اور آنکھ کنارے خوبصورت سپنے قطار باندھے کھڑے تھے۔ جب عمران اس سے ٹکرایا تھا تو اپنی فائلیں سمیٹتے ہوئے کس بری طرح اس پر برس پڑی تھی اور وہ حیران حیران سا "میری بات تو سنیں۔" کہہ کر رہ گیا تھا۔ جبکہ آئینہ اپنی سنا کر پلٹ گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا' وہ اسی کے آفس میں تعینات ہوا ہے۔ عمران نے اس کی سیٹ پر آ کر معذرت کی تھی۔ آئینہ شرمندہ سی ہوگئی۔ اس کا قصور اتنا زیادہ تو نہ تھا۔ وہ مسکرا دی پھر بھول گئی۔ مگر وہ نہیں بھولا تھا۔ عمران کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتیں۔ بات کرتے ہوئے اسے دیکھتا تو اپنی بات بھی بھول جاتا۔ اس کی نگاہوں کی وارفتگی آئینہ کو پزل کر دیتی۔ وہ لاشعوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہونے لگی۔ اس کے اندر چاہے جانے کی خواہش انگڑائی لے کر جاگنے لگی۔ تب ہی وہ بے بس سا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور مرد کبھی بے بس نہیں ہوتا۔ ہاں تاثر یہی دیتا ہے اور مقابل کو بے بس کر دیتا ہے۔ وہ کندن ہوتی تو اس کی ایک نگاہ پر کبھی نہ پگھلتی۔ مضبوط ہوتی تو یوں اس کے خوبصورت لفظوں پر بکھر نہ جاتی۔ کتنی ہیں جو ہر روز آگ کے اس دریا کو عبور کر کے ویسی کی ویسی اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ آتی ہیں۔ ان کی محبتیں' ان کی چاہتیں' سینت سینت کر رکھے جذبے سب کے سب امانت ہوتے ہیں اور ان میں رتی بھر خیانت نہیں ہوتی۔ ہاں...... وہ کمزور نکلی تھی۔ راستے کے پتھر کو نشان منزل سمجھ بیٹھی تھی۔ تو انجام کیا ہوتا؟

امی عصر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ جب عمران آیا۔ دروازہ آئینہ نے ہی کھولا تھا۔

"تم آدھا گھنٹہ لیٹ آئے ہو۔" وہ خفگی سے گویا ہوئی۔

"یار! تھوڑی بہت تیاری بھی تو کرنی تھی۔ کیسا لگ رہا ہوں......؟"

بلیو جینز' وائٹ شرٹ اور بلیو کارڈیگن میں جمے جمائے بالوں اور نکھرے فریش چہرے کے ساتھ وہ سامنے تھا۔ اس نے مسکرا کر راستہ چھوڑا۔ امی آئیں تو وہ کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔

"پتا نہیں امی کیا کہیں......" وہ کچھ کنفیوز سی ہوگئی۔ چائے بنا کر آئی تو عمران خاموش سا بیٹھا تھا۔ امی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آئینہ چائے بنانے لگی تو امی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"تم جاؤ۔ میں بنا دوں گی۔"

آئینہ نے عمران کو دیکھا۔ وہ اب بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے باہر

نکل آئی۔ مگر اندر کہیں خطرے کی گھنٹی سی بجی تھی۔ وہ جانتی تھی امی اعتراض کریں گی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہینڈل کر لوں گی۔" اس نے خود کو تسلی دی اور کچن کے دروازے میں کھڑی ڈرائنگ روم کے بند دروازے کو گھورنے لگی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عمران باہر نکلا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آئینہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رکا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا۔ تم نے مجھے یہاں انسلٹ کرنے کو بلوایا تھا۔"

"عمران ......!" آئینہ نے پکارا مگر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ وہ پلٹی تو امی کھڑی تھیں۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی آئینہ۔" ان کا لہجہ بکھرا بکھرا سا تھا۔

"امی! آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا......" آئینہ کا لہجہ بھیگ گیا اور اس کا جملہ ...... امی سن سی ہو گئیں۔ اس نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا اور بھاگتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔

* * *

"اب کیا ہوگا عمران؟" وہ رو پڑی۔

"تم روؤ تو مت ...... آئینہ پلیز ...... سنبھالو خود کو۔ تم جانتی ہو یہ آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" وہ مضطرب سا ہو کر اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

"یہ آنسو میری ماں کو نظر کیوں نہیں آتے عمران ......"

"ایسے مت کہو آئینہ! ماں ہیں وہ......" عمران نے رسانیت سے کہا۔ وہ تڑپ اٹھی۔

"کیسی ماں ہیں اپنی بیٹی کی خوشیوں کی دشمن ہو رہی ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتیں کہ اب آئینہ کسی اور شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"کیا کوئی اور پرپوزل ہے......" وہ بری طرح چونکا۔ تو آئینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو آنٹی تمہاری شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔" عمران الجھن آمیز لہجے میں پوچھنے لگا۔ وہ کچھ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھو آئینہ! میں جانتا ہوں تم اپنے گھر کی واحد کفیل ہو۔ مگر میں تمہیں منع تو نہیں کر رہا۔ تم شادی کے بعد بھی جاب کر کے اپنی والدہ کا خرچ اٹھا سکتی ہو اور اگر نہیں بھی کرنا چاہو۔ تو آئینہ......" اس کے لہجے میں افسردگی سی در آئی۔ "میں نے اپنا گھر تمہاری خاطر چھوڑ دیا۔ اپنے والدین، بہن بھائی، دولت جائیداد سب تمہاری خاطر چھوڑا ہے۔ اب اس دنیا میں تمہارے اور آنٹی کے سوا میرا کون ہے۔ وہ ہمارے گھر میں ہماری بزرگ بن کر رہ سکتی ہیں۔ یقین جانو۔ میں

ان کی عزت اپنی ماں سے بڑھ کر کروں گا۔"

"عمران ...... تم ...... تمہارا مطلب ہے امی ......" اس کے منہ سے لفظ نہ نکل سکے۔

"نہیں آئینہ۔" عمران نے اسے فوراً ٹوکا۔ "ان سے بدگمان مت ہو۔ بس تھوڑا سا حقیقت پسند ہو کر سوچو۔ وہ تمہاری شادی کے بعد کیا کریں گی۔ تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ باپ نہیں ہے ایک بڑی بہن جو شادی کے بعد امریکہ جا بسی۔ لیکن میں نے کہا ناں ...... میں انہیں اپنی والدہ کی جگہ سمجھوں گا۔ شاید ان کے دل میں ایسا ہی کوئی خدشہ ہو۔ ورنہ میرے پرپوزل کو ٹھکرانے کی یہ وجہ تو ایسی معقول نہیں کہ میرے والدین راضی نہیں۔ جبکہ ہم ان کے بغیر بھی اپنی زندگی بنا سکتے ہیں۔ میں جاب کرتا ہوں۔ تم بھی جاب کرتی ہو۔ یہاں میرا اپنا فلیٹ ہے۔ میں نے آنٹی سے کہا تھا۔ میں اپنا فلیٹ تمہارے نام کر دوں گا اور ...... اور کیا کروں میں۔ اپنے جذبے اپنی محبتیں، اپنا پورا وجود تو پہلے ہی تمہارے نام کر چکا ہوں اور کیا سکیورٹی دوں میں انہیں، میرے پاس اور ہے کیا......" وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا اور آئینہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

"تم ان سے بات تو کرو آئینہ۔ انہیں بتاؤ۔ عمران تمہارے بغیر جی نہیں سکے گا۔ تم تو میری روح کا گمشدہ حصہ ہو۔ میری تکمیل ہو۔ کیسے بھول پاؤں گا میں تمہیں۔ میں تو تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آؤ شادی کر لیں۔ خود غرضی ہوگی یہ میری۔ جو دکھ میرے حصے میں آئے ہیں، انہیں تمہارا مقدر کیوں بناؤں۔"

"اور یہ پرخلوص شخص ......" آئینہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے تفاخر سے اسے دیکھا۔ وہ اس کیلئے ساری دنیا ٹھکرا آیا تھا۔ کیا وہ اس کیلئے اپنی ماں کو نہیں منا سکتی "اور جی پاؤ گی آئینہ۔ تم اسے کھو کر۔"

اس کا دل یہ سوچ کر ہی دھڑکنا بھول گیا۔

"نہیں عمران! میں بات کروں گی امی سے۔ وہ مان جائیں گی۔ انہیں ماننا ہوگا۔"

وہ سرخرو ہو گیا تھا اور اب آئینہ کی محبت امتحان میں تھی۔ مگر ان کی ناں ہاں میں نہیں بدلی۔

"وہ اپنے والدین کو لے آئے، میں تمہیں آج ہی رخصت کر دوں گی۔" ان کا لہجہ ٹھوس تھا۔

"وہ انہیں چھوڑ چکا ہے میری خاطر......"

"پھر بھی وہ قابل اعتبار ہے؟" ماں نے چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ کو اس کے جذبوں میں کھوٹ کیوں نظر آتا ہے۔ وہ میرے لئے سب کو چھوڑ چکا ہے۔ میں پھر بھی اس پر اعتبار نہ کروں ...... جبکہ میں جانتی ہوں وہ مجھے خوش رکھ سکتا ہے یا پھر

آپ مجھے خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔"

اس کے باغیانہ و گستاخانہ لہجے پر انہوں نے بے یقینی سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا اس کی بینائی چھن گئی ہے۔" بے ریا محبتوں پر کھوکھلے اور جھوٹے لفظ کیوں غالب آگئے۔

"کہاں کمی رہ گئی میری تربیت میں۔؟"

وہ بولیں تو لہجہ بے حد عجیب تھا۔

"تمہیں اپنی ماں پر اعتبار نہیں آئینہ۔"

آئینہ کی سماعتیں بس عمران کو سنتی تھیں۔ ڈوبتے جہاز پر کھڑے مسافر کی آخری پکار جیسی ماں کی آواز بس خلا سے ٹکرا کر واپس لوٹ گئی۔ انہوں نے اپنی ایک عمر کی ریاضت و محبت کو داؤ پر لگا کر پوچھا تھا۔ کون بیٹھی تھی جو نفی میں جواب دیتی۔ مگر اس نے یہ بد نصیبی اپنے ہاتھوں کمائی تھی۔ بولی تو بس یہ......

"عمران کہتا ہے' اسے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر میں جاب کر کے آپ کا خرچ اٹھالوں۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارے ساتھ......"

"آئینہ......" وہ چیخ اٹھی۔ دوسرے پل بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا تھا۔

"تو سمجھتی ہے کہ میں......" ان کا کمزور وجود کانپ گیا۔ گال پر ہاتھ رکھ کر وہ سیدھی ہوئی۔ بے یقینی سے انہیں دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"عمران ٹھیک کہتا ہے۔ آپ کو میری خوشیوں کی کوئی پروا نہیں۔"

"دفع ہو جاؤ آئینہ! دفع ہو جاؤ یہاں سے......" وہ بے دم ہو کر صوفے پر گر گئیں۔

ایک پل کو آئینہ کا دل تاسف میں گھر گیا۔ دوسرے پل وہ کمرہ چھوڑ گئی تھی۔

* * *

اسے کہنا کہ پلکوں پر نہ ٹانکے خواب کی جھالر
سمندر کے کنارے گھر بنا کر کچھ نہیں ملتا
یہ اچھا ہے کہ آپس کے بھرم نہ ٹوٹنے پائیں
کبھی بھی دوستوں کو آزما کر کچھ نہیں ملتا

مگر جب آنکھوں میں بینائی جل جائے تو سارے منظر دھندلا جاتے ہیں۔ کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔ ہر نصیحت' ہر دلیل بے وزن ہو جاتی ہے۔

اس نے عمران پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے اپنے سارے خواب' سارے ارمان اسے

سونپ دیئے اس نے بہتے پانیوں پر گھر بنانے کی کوشش کی تھی اور نہیں جانتی تھی یہ گھر جب ٹوٹ کر تنکا تنکا بکھرتے ہیں تو ان کا مقدر ہمیشہ مہیب تاریکیوں میں ڈوبے اجنبی وان دیکھے جزیرے ٹھہرتے ہیں۔ جہاں سوائے ویرانیوں کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

کورٹ سے باہر نکل کر وہ ایک پل کو ٹھٹکی۔

"شاید آسمان کا رنگ بدل گیا یا شاید یہ زمین ہی کوئی اور ہے۔"

وہ بے حد خوش تھی یا بے حد اداس۔ اپنے احساسات خود بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ہاں عمران بہت خوش تھا۔ گنگناتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"بیٹھیے مسز عمران!"

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی اور بہت سارا راستہ یونہی خاموشی میں کٹ گیا۔ تب ہی عمران نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"تم خوش نہیں ہو آئینہ......"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" آئینہ نے چپکے سے اپنے آنسو پونچھے۔ عمران نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ نظریں سامنے جماتے ہوئے بولا تو لہجہ کچھ مایوس و متاسفانہ تھا۔

"میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ یہ سب اس طرح ہو۔ یقین جانو آئینہ! میں نے تم سے صرف محبت ہی نہیں تمہاری عزت بھی کی ہے۔ تم میرے ساتھ سر اٹھا کر چلو۔ کہیں کوئی پشیمانی' کوئی دکھ تمہارے ساتھ نہ ہو۔ میں تو یہی چاہتا تھا مگر حالات......" وہ طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"لیکن آئینہ! یہ بھی تو سوچو۔ کیا ہم ایک دوسرے کو کھو کر جی پاتے۔"

"اسی لئے تو اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"پھر تمہارا دکھ اکیلا تو نہیں ہے۔ تمہیں تو صرف ماں کی خفگی مول لینی ہے اور میں...... میں نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا لیکن دیکھو' کہیں کوئی پچھتاوا' کوئی پشیمانی نہیں کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔" اس کے لہجہ و انداز میں وارفتگی و شدت تھی' وہ پھر سے شرمندہ ہو گئی۔

"کیا کچھ نہیں کیا اس شخص نے مجھ جیسی معمولی سی لڑکی کیلئے اور میں......"

"آئی۔ ایم۔ سوری عمران!" اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر وہ شرمندگی سے گویا ہوئی۔

عمران نے ایک نظر اس کے ہاتھ پر ڈالی پھر مسکرا دیا۔ ان کے درمیان قائم ہونے والے اس شرعی و قانونی رشتے نے آئینہ کے انداز بدل دیئے تھے۔ ورنہ ان معاملات میں خاصی محتاط واقع ہوئی تھی وہ۔

"اٹس او کے۔" عمران نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ پھر سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

''امی کو کب بتاؤ گی......؟''

''ہاں......موقع دیکھتے ہی بتادوں گی۔'' امی کا ردعمل سوچ کر وہ خائف سی ہوگئی۔

''وہ برا بھلا کہیں گی۔ خاموشی سے سن لینا۔ ہم نے کچھ ٹھیک بھی تو نہیں کیا۔''

''عمران......'' آئینہ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر بے اختیار گویا ہوئی۔ ''تم واقعی بہت اچھے ہو۔''

''میری تعریفیں بند کرو۔ چلو' تمہیں تمہارا گھر دکھاتا ہوں۔'' گاڑی کا رخ بدل گیا تھا۔

''میرا گھر......؟'' آئینہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میرا فلیٹ' جو اب تمہارا بھی ہے۔ تم وہاں قدم رکھو گی تو وہ خالی فلیٹ گھر بن جائے گا۔ تمہیں نہیں معلوم آئینہ' میں نے اس وقت کا کتنا انتظار کیا ہے۔''

''میرا گھر......'' آئینہ نے زیر لب دہرایا۔ اور ایک خوبصورت سے احساس میں گھر گئی۔

* * *

وہ گھر آئی تو محسن بھائی بیٹھے تھے۔ امی ان کیلئے چائے بنا رہی تھیں۔

''کیسی ہو آئینہ......''

''ٹھیک ہوں۔ بھابی کیسی ہیں۔''

''طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس کی۔ اس لئے مامی کو لینے آیا ہوں۔'' وہ بہت الجھے الجھے اور پریشان سے نظر آئے۔

''آئینہ! تم چلوگی ساتھ؟'' امی چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئیں۔ وہ بے اختیار ہی نظریں چرا گئی۔ اس سے قبل کہ کوئی بہانا سوچتی۔ امی بول اٹھیں۔

''چلو ٹھیک ہے۔ گھر میں کسی کو تو رہنا ہے۔ یوں بھی آفس سے تھکی ہوئی آئی ہے۔''

آخری جملہ انہوں نے محسن بھائی سے کہا۔ وہ نجانے کیوں گھبرا کر اٹھ گئی۔

''امی! میں چینج کرلوں۔''

کمرے میں آکر وہ بہت دیر یونہی بیٹھی رہی۔ کچھ دیر کے بعد امی چادر اوڑھتی اندر آئیں۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے آئینہ۔'' اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ایک ہلکی سی تشویش ان کے لہجے میں چھلکی۔ آئینہ نے اس دن کے بعد عمران کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ سمجھیں' شاید ان کی بات آئینہ کی سمجھ میں آگئی۔ وہ انگارہ چھونے کی تمنا کر رہی تھی اور وہ انگارہ

اس کی ہتھیلی پر نہیں دھر سکتی تھیں۔ البتہ آئینہ کے لئے اچھے رشتے کی تلاش انہوں نے آئینہ سے بالا بالا ہی شروع کر دی تھی۔ ایک دو جگہ امید ہوئی تھی۔ شاید اسی لئے اس دن والی آئینہ کی گستاخی نظر انداز کر دی تھی۔

''میں تو ٹھیک ہوں' کیا ہوا......؟'' آئینہ نے کلپ سے باہر نکلتی لٹوں کو ہاتھ سے سنوارتے ہوئے گڑبڑا کر پوچھا۔ وہ اب بھی ان سے نظریں چرا رہی تھی۔

''کپڑے نہیں بدلے ابھی تک۔''

''بس میں اٹھ رہی تھی۔''

''کھانا کھا لینا اور دروازہ ٹھیک سے بند کرلو۔ میں کوشش کروں گی کہ جلدی آجاؤں۔''

''اور اگر آپ کو معلوم ہوجائے کہ میں کیا کر آئی ہوں۔ تو......''

وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گئی۔ آج جو کچھ ہوا' وہ ہونا نہیں چاہئے تھا مگر وہ نہ تو عمران کو روک سکی اور شاید خود کو بھی۔ کچھ دن وہ اسی الجھن میں رہی۔ مگر عمران کے والہانہ پن اور بے انتہا چاہتوں نے اسے بہلا لیا۔ وہ فلیٹ اس نے اس طرح سجایا تھا۔ جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ آفس سے واپسی پر وہ کچھ گھنٹوں کیلئے وہاں ضرور رکتے۔ امی سے اس نے آفس ٹائمنگ بڑھ جانے کا بہانا کر دیا تھا۔

ان ہی دنوں امریکہ سے ایمن اور فراز آگئے۔ ایمن کی شادی کو آٹھ برس ہوگئے تھے اور ابھی تک وہ دونوں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے۔ امی کا دھیان ایمن کی پریشانی کی طرف منتقل ہوگیا۔ وہ بھی آفس سے جلدی گھر آنے لگی۔ ایمن ماں کی طرح سیدھی نہیں تھی جو اس کے بہانوں سے بہل جاتی۔ عمران منہ پھلائے رکھتا۔ جھنجھلا جاتا۔ اس کی بے قراری پر آئینہ کو ہنسی آجاتی۔

اس دن عمران آفس کے باہر ہی مل گیا۔

''کیا ہوا' اندر نہیں جانا یا آفس والوں نے نکال دیا ہے۔''

وہ اسے بازو سے کھینچ کر بائیک تک لے گیا۔

''فوراً بیٹھو......''

آئینہ اس ڈر سے کہ کوئی دیکھ نہ لے فوراً بیٹھ گئی۔

''جب سے تمہاری سسٹر تشریف لائی ہیں۔ میں تو تمہیں دیکھنے کو ترس گیا۔'' وہ بڑبڑایا تھا۔ وہ دن ایک یادگار دن تھا۔ وہ دونوں گھومے تھے۔ فلیٹ پر جاکر پزا اور کافی پی اور خوب انجوائے کیا۔ عمران نے اسے ایک سونے کی انگوٹھی گفٹ کی۔

''یہ سب کس لئے......؟'' آئینہ کو حیرت ہو رہی تھی۔

"کل تنخواہ ملی تھی محترمہ! اب یہ پیسے اپنی بیگم پر نہیں لٹائیں گے تو کس پر لٹائیں گے۔"

"تم آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔"

"اتنے دنوں کے بعد جو ملی ہو۔" وہ مخمور لہجے میں گویا ہوا۔

آفس سے واپسی کے وقت پر وہ گھر میں موجود تھی۔ امی کی نظر انگوٹھی پر پڑی تو اس نے اطمینان سے کہہ دیا تھا کچھ پیسے ہر مہینے بچا کر خریدی ہے۔

"آفس میں سب لڑکیاں چھوٹی موٹی جیولری پہنتی ہیں۔"

امی مطمئن ہو گئیں۔ اس پل آئینہ کے ذہن میں خیال سا آیا کہ ماؤں کو اتنا سیدھا نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اس نے سر جھٹک دیا۔ امی کی سادہ لوحی اس کے تو حق میں ہی جاتی تھی۔

* * *

خلاف معمول عمران کچھ چپ سا تھا۔ جتنی مرتبہ وہ اس کے سامنے سے گزری۔ وہ سر جھکائے فائل پر لکیریں کھینچتا ہی نظر آیا۔ نہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ نہ ہی کوئی ذومعنی جملہ کہا۔ لنچ بریک تک آئینہ نے بمشکل ضبط کیا۔ جیسے ہی آفس خالی ہوا' وہ فوراً اس کے پاس آئی تھی۔

"کیا ہوا' عمران......؟"

"ہوں......" وہ چونکا۔ پھر مضمحل سا مسکرایا۔ "کچھ نہیں یار! سر میں کچھ درد ہے۔" اس نے انگلیوں کی پوروں سے کنپٹی سہلائی۔

"ٹیبلیٹ لے لو۔ میرے پاس ہے۔" آئینہ اٹھنے لگی۔ عمران نے روک دیا۔ "نہیں ......ایک کپ چائے لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔" پھر دانستہ مسکرایا۔ "تم پریشان مت ہو۔"

لیکن وہ پریشان ہو گئی تھی۔ عمران دن بدن الجھتا جا رہا تھا اور اسے بھی الجھاتا جا رہا تھا۔

"پرابلم کیا ہے عمران......؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔ وہ پریشان تھا تو مطمئن آئینہ بھی نہ تھی۔ راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھی۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے۔ کتنی بار کہوں گا۔" وہ جھنجھلا گیا۔ آئینہ سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بیگ اٹھا کر کھڑی ہونے لگی۔ عمران نے اس کا بیگ پکڑ لیا۔

"بیٹھ جاؤ آئینہ......!"

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ عمران کچھ لمحے گلاس ہاتھ میں گھماتا رہا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"امی بیمار ہیں......"

"اوہ......"

"مجھے بلا رہی ہیں۔"

"تو۔ تم جاؤ نا......" وہ ایک دم بولی۔ عمران نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر آئینہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

"میں نے تمہیں روکا تو نہیں عمران......" اسے دکھ ہوا تھا۔

"تم نے نہیں میں نے خود کو روکا ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا خود سے۔ اس گھر میں تب ہی قدم رکھوں گا۔ جب آئینہ میرے ساتھ ہو گی۔"

"میں چلوں تمہارے ساتھ......؟" آئینہ نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"امی بیمار ہیں۔ اس صورت میں تمہارا وہاں جانا ان کیلئے شاک ہو گا۔"

وہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر آئینہ نے اسے زبردستی بھیج دیا۔

"تم بہت اچھی ہو آئینہ......! میں موقعہ دیکھتے ہی ابو سے بات کروں گا۔" جاتے ہوئے اس نے وعدہ کیا تھا۔

"میں بھی کوشش کروں گی۔ ایمن سے بات کر سکوں۔"

لیکن وہ ایمن سے بات نہ کر سکی۔ ہمت ہی نہ ہوتی۔ بس عمران کی امی کیلئے دعائیں کرتی رہتی۔

پھر پورا ہفتہ گزر گیا...... وہ پریشان ہو گئی۔

"کہیں اس کی امی......" دل میں عجیب طرح کے وسوسے اٹھے۔ تو وہ گھبرا کر فلیٹ چلی گئی۔ وہاں تالا پڑا تھا۔ ظاہر ہے' عمران کی غیر موجودگی میں آئینہ کو اس فلیٹ کی ضرورت ہی کیا تھی۔

چودہ دن کے بعد اس کا کولیگ اویس ایک معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"مس آئینہ! عمران نے استعفیٰ دے دیا ہے بغیر کوئی معقول وجہ بتائے۔ آپ بتا سکتی ہیں۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بہت دوستی تھی نا آپ لوگوں کے درمیان۔"

آئینہ کو لگا' وہ چکرا کر گر جائے گی۔

* * *

مرے بدن سے گریز کرتی ہوا سے کہنا
وجود کے ہر مسام میں جو غلاظتیں ہیں
یہ ذلتیں ہیں کئی برسوں کی

ہوا سے کہنا
کہ نوحہ پڑھتی تمام صبحیں، سلگتی شامیں
مری کہانی سنا رہی ہیں
حیات کا اب جواز کیا ہے......!
کہ سر سے آکاش اڑ گیا ہے
قدم زمیں پر لرز رہے ہیں

چھ ماہ قبل وہ کورٹ سے باہر نکلی تھی تو اسے لگا تھا۔ آسمان پر دھنک کے ساتوں رنگ بکھرے ہیں۔ ہوا خوشبو اوڑھے محو رقص ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ان رنگوں کو چھوئے گی تو وہ اس کی ہتھیلی کی حنا بن جائیں گے۔ زمین واقعی اس کے قدموں کے نیچے تھی اور عمران کا ہاتھ تھامے اپنی محبتوں کے رنگوں سے نیا افق سجانے چلی تھی اور آج...... اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی پریگنینسی رپورٹ کو دیکھا اور ڈر گئی۔ آسمان کے سارے رنگ اندیشوں اور بدنامی کی گرد میں چھپ گئے تھے۔ زمین ریت کی طرح قدموں کے نیچے سے سرکتی جا رہی تھی۔ وہ گویا کسی خلا میں معلق تھی۔ گاڑیوں کے ہارن، لوگوں کی آوازیں، نیون سائن، دکانوں میں جلتی روشنیاں اور قدموں کی چاپ، ہر چیز میں ایک جان لینے کی کیفیت تھی۔ لوگوں کے چہروں پر استہزائیہ مسکراہٹ امڈ آئی۔ اسے لگا وہ سب اسے سنگسار کرنے آ رہے ہیں۔

"میرا کوئی قصور نہیں ...... میں نے تو محبت کی تھی۔" وہ چیخنا چاہتی تھی۔ ایک دم کسی نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"کہاں گم ہو؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا...... میں نے تو......" وہ ایک دم چپ ہو کر، سامنے کھڑے شخص کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"کتنی دیر سے ہارن دے رہا ہوں......" وہ جھنجھلائے ہوئے تھے۔

"فراز بھائی......" وہ انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

"یہاں کیا کر رہی ہو۔" انہوں نے پلٹ کر مشہور گائناکالوجسٹ ڈاکٹر زبیدہ جمال کے کلینک کو دیکھا۔ آئینہ گڑبڑا گئی۔ پتا نہیں فراز بھائی نے اسے کلینک سے نکلتے دیکھا تھا یا اسے سامنے کھڑے دیکھ کر پوچھا تھا۔ مگر وہ بری طرح ڈر گئی۔ رپورٹ اس نے موڑ کر تیزی سے پرس میں گھسیڑ دی۔

"وہ میری کولیگ کی رپورٹس لینی تھیں۔ وہ نہیں آسکی تو میں......"

فراز نے اس کی زرد رنگت، کپکپاتے لب، ماتھے پر آیا پسینہ دیکھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں......" وہ باوجود کوشش کے مسکرا نہ سکی تو دوپٹے سے پسینہ صاف کرنے لگی۔

"نہیں۔ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ چلو، تمہیں گھر چھوڑ دوں۔ میں تو اتفاقاً یہاں سے گزر رہا تھا تو تم پر نظر پڑ گئی۔"

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ ہولی۔ سارا رستہ وہ پرس کو دونوں ہاتھوں میں دبوچے بیٹھی رہی۔ فراز بھائی نے ایک دو باتیں کیں۔ کوئی توجہ نہ پا کر خاموش ہو گئے۔

"کمال کرتے ہیں فراز آپ بھی۔ گھر سے نکلتے ہیں تو بس لوٹنا بھول جاتے ہیں۔" گھر میں گھستے ہی ایمن خفا ہونے لگی۔

"اتنے برسوں کے بعد تو وطن آیا ہے۔ سو لوگوں سے ملنا ملانا، دوست احباب......" امی نے محبت سے اپنے داماد کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر ان کے نزدیک صوفے پر جا بیٹھے۔

"مگر یہ بات ان محترمہ کو کون سمجھائے۔ ہمیشہ شک ہی کرتی رہتی ہیں۔"

"ہاں تو آپ مردوں کا کیا اعتبار......" تب ہی ایمن کی نگاہ آئینہ پر پڑی۔ تو بے اختیار پوچھنے لگی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے......؟"

امی نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"اچھا چینج کرو۔ پھر میں کھانا نکالتی ہوں۔"

"جی۔" وہ سراسیمہ سی اندر جانے کو پلٹی کہ ایک دم در و دیوار گھوم گئے۔ پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے صوفے کا سہارا لینا چاہا اور اسی پر ڈھیر ہو گئی۔

"آئینہ...... آئینہ۔" امی اور ایمن ایک دم اس کی طرف لپکیں۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں......" اس نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

"لاپروائی بھی تو اتنی کرتی ہو۔ کبھی جو تمہیں ڈھنگ سے کچھ کھاتے پیتے دیکھا ہو۔" ایمن اسے لتاڑنے لگی۔ اس نے سر جھٹک کر سامنے دیکھا اور ہفت آسمان گھوم گئے۔ فراز بھائی اس کا پرس کھول رہے تھے۔ وہ چیخ کر انہیں روکنا چاہتی تھی۔ مگر گنگ سی پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔ ایمن نے اس کی نظروں کے تعاقب میں فراز کو دیکھا۔ وہ رپورٹ کھول کر پڑھ رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات لحظہ بہ لحظہ بدلنے لگے۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کر آئینہ اور پھر ایمن کو دیکھا۔

"کیا ہوا فراز ......؟" ایمن نے بے حد حیرت سے پوچھا تھا۔ انہوں نے خا
سے رپورٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ ایمن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کاغذ ہاتھ میں لیا۔ دوسرے
اس کی رنگت زرد پڑ گئی۔ چیخ روکنے کی کوشش میں اس کا ہاتھ اپنے لبوں پر جم گیا۔
"آ......آئینہ......" رپورٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ آئینہ نے ا
بارامی کو جھک کر رپورٹ اٹھاتے دیکھا تھا۔ پھر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

* * *

ایک قیامت تھی جو اس گھر کے مکینوں پر اتری تھی۔ امی بستر سے جا لگی تھیں۔ ان
کوسنے، بددعائیں، کیا قیامت کی گھڑی تھی جس پل ماں کی دعا، بددعا میں ڈھل گئی۔ ان کی
پیٹ آئینہ کی چپ نہ توڑ سکی۔ ماں نے اس کا نام آئینہ رکھا تھا۔ وہ آئینے ہی کی طرح کرچی کر
ہوئی تھی اور اب اپنا ہی چہرہ دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔
ایمن ڈر ڈر کر فراز کا چہرہ دیکھتی۔ پتا نہیں کب اس کے منہ سے کیا نکل جائے۔
کچھ اس کے سامنے ہی تو ہوا تھا اور وہ سگریٹ پھونکتے نجانے کیا سوچتے رہتے۔
"اس سے ملو جا کر۔ گھر بلاؤ......اپنے اس گناہ......"
"کوئی گناہ نہیں کیا میں نے۔ شادی کی تھی۔" اس نے آہستگی سے بات کاٹی۔ ا
ششدر سی اسے دیکھے گئی۔
"آئینہ......تم......؟"
"میں نے ملوایا تھا امی کو اس سے مگر......"
"بس کرو۔" ایمن ترخ کر بولی۔ "بتا چکی ہیں امی مجھے سب کچھ۔ ماں کو بھی ا
جیسا بے وقوف سمجھ لیا ہے تم نے۔ آئینہ! تمہیں ایک پل کو بھی اپنے مرے ہوئے باپ کی ع
کا خیال نہیں آیا۔ اپنی ماں کی بیوگی پر اتنا سا ترس بھی نہ آیا۔ انہوں نے اپنی ساری عمر ہم د
کے نام کر دی اور تم نے یہ صلہ دیا ان کی ریاضتوں اور محبتوں کا......آئینہ......آئینہ! میرا دل
ہے تمہارا گلا گھونٹ دوں یا گولی مار دوں۔ تم جیسی لڑکیوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔"
سے کانپ رہی تھی۔ "او میرے خدا......" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر کرسی پر گر گئی۔ "
سوچ رہے ہوں گے۔ ہم اتنے گھٹیا لوگ ہیں۔ آنی......! تم نے تو ہمیں کسی کو منہ دکھا
قابل نہیں چھوڑا......کیسے فیس کریں گے ہم لوگوں کو......کیسے چھپائیں یہ سب......"
وہ آنے والے وقت کو سوچ کر ہی کانپ کانپ گئی۔
"ایمن! عمران کو آنے تو دو......وہ"
"کہاں......کہاں گیا ہے وہ......؟"

آئینہ نظریں چرا گئی۔
"اپنے گھر گیا ہے۔ کچھ دنوں تک آ جائے گا۔" اس کے اپنے الفاظ، اپنا لہجہ ہی بے یقین تھا۔ "اسے واپس آنا ہوتا تو یوں بنا بتائے غائب ہوتا......" ایک اندیشے نے اس کے ڈگمگاتے یقین کو ڈنک مارا۔ تو وہ لرز گئی۔
"نہیں......وہ آئے گا۔ کوئی حادثہ، کوئی اہم واقعہ اس کا راستہ روکے ہوگا۔"
اس نے یقین کی ڈور سے لرزتے، کانپتے دل کو باندھا لیکن ایمن کی سرسراتی خوفزدہ آواز نے اس گرہ کو کھول کر رکھ دیا۔
"اگر وہ نہ آیا آئینہ......؟"
"نہیں۔" وہ تڑپ گئی۔ "ایسے مت کہو......میں مر جاؤں گی ایمن۔"
"ہم سب ہی مر جائیں گے۔" ایمن کی سرگوشی پر ایک گہری چپ آ گری۔ کچھ ڈرے سہمے لمحے ان دونوں کے بیچ کپکپاتے رہے۔ تب ہی فراز کی آواز نے اس گہری چپ کو توڑا۔
"آئینہ......" وہ نظریں اٹھا کر انہیں دیکھ نہ سکی بس نچلا لب کاٹتی رہی۔
"مجھے اس کے متعلق ساری معلومات اور اس کا ایڈریس وغیرہ دو......دیکھتا ہوں، کیا ہو سکتا ہے۔"
آئینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔
"خدا کرے سب ٹھیک ہو جائے۔" ایمن زیر لب بڑبڑائی تھی۔
"ایمن! میں عمران سے خود......"
"تم نے جو کچھ کرنا تھا کر چکی ہو۔ معاملہ اب تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ فراز جو کر رہے ہیں۔ انہیں کرنے دو۔ یہ کیا کم ہے کہ وہ تمہارا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں۔"
ایمن کے لہجے میں موجود سختی نے اسے خاموش کروا دیا۔

* * *

باہر سے آتی آوازیں بے موسمی بارش کی طرح ٹپ ٹپ اس کے کانوں میں گر رہی تھیں۔ ایمن امی سے دوا کھانے پر اصرار کر رہی تھی۔
"کیا کروں گی جی کر......" امی کی آواز میں اپنے علاج سے مایوس ہو جانے والے مریض کی مایوسی تھی۔ پھر فراز سے مخاطب ہوئیں۔ "کیا کہتا ہے وہ لڑکا......؟"
"فراز بھائی عمران سے ملے ہیں۔" آئینہ کا پورا وجود سماعت میں بن گیا۔
"وہ مجھے ملا ہی نہیں......" فراز بھائی کی سرگوشی جیسی آواز کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھی۔

"اب کیا ہوگا......؟" ایمن کی پریشان سی آواز ابھری۔

"میں اس کے فلیٹ پر گیا تھا۔ فلیٹ کرایے کا تھا اور اس میں موجود سامان بھی"

آئینہ کا دل ڈوب گیا۔

"پھر میں اس کے گھر گیا۔" وہ ایک پل کو خاموش ہوگئے۔ جیسے اگلا جملہ کہنے کیلئے خود کو تیار کررہے ہوں۔ "وہ شادی کرچکا ہے اور وہ لڑکی اسے اپنے ساتھ جرمنی لے گئی ہے۔" ان کی آواز بے حد مدھم تھی۔ مگر گویا آسمان اس کے سر پر آگرا۔ لڑکھڑاتے ہوئے اس نے دروازے کا سہارا لیا۔

"عمران ایسا نہیں کرسکتا۔" اس کا دل بے یقینی سے کرلا کر رہ گیا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ فراز بھائی باقی تفصیلات بتارہے تھے۔ آنسو ایک تواتر سے اس کے گال بھگونے لگے۔

"تم جانتی ہو' یہ آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنا فلیٹ تمہارے نام کردوں گا......اپنا پورا وجود تو پہلے ہی تمہارے نام کرچکا ہوں۔"

"عمران تمہارے بغیر جی نہیں سکے گا۔"

"تم تو میری روح کا گمشدہ حصہ ہو۔ میری تکمیل ہو۔ کیسے بھول پاؤں گا میں تمہیں"

"یا اللہ......" اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ "اس کے جذبوں میں کھوٹ تھا تو مجھے محسوس کیوں نہیں ہوا۔ اتنا بڑا دھوکا......اتنی ذلت۔"

"اس کے گھر والے اس شادی سے بے خبر ہیں اور سب سے بڑا جھوٹ جو اس نے آئینہ سے بولا کہ وہ گھر چھوڑ چکا ہے۔" فراز بھائی بتارہے تھے۔

"تمہیں تو صرف ماں کی خفگی مول لینی ہے اور میں...... میں نے تمہارے لئے کچھ چھوڑ دیا۔"

"نجانے کیا جادو کر دیا تھا اس نے کہ آئینہ نے میری ایک بات نہیں سنی۔" امی رہی تھیں۔ عمران کو کوسنے دے رہی تھیں۔ آئینہ کے اندر ایک وحشت جاگی۔

"اس سے تو اچھا تھا' آئینہ تو مرجاتی۔"

"ہاں...... مجھے مرہی جانا چاہئے۔ مجھ جیسی لڑکی کو زندہ رہنے کا واقعی کوئی حق نہیں"

ایک وحشت کے عالم میں وہ کمرے سے نکل کر کچن میں آگئی۔ اس کی متلاشی نگاہیں ادھر ادھر ڈھونڈ رہی تھیں۔ تب ہی نگاہوں کی گرفت میں چھری آگئی۔

"آئینہ! تم نے سنا......" ایمن اس کے پیچھے آئی تھی۔

"ہاں سنا!" اس کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ "قصور وار وہ نہیں ہے۔ میں کوئی بچی جسے کھلونے دکھا کر بہلا لیا جاتا۔ اس نے مجھے اغوا نہیں کیا تھا۔ گن پوائنٹ پر نکاح نہیں

تھا۔ جو کچھ ہوا' میری مرضی سے ہوا۔ میں اندھی ہوگئی تھی۔ اپنے نفس کی غلام ہوکر اپنی نسوانیت کا سارا غرور اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ میں نے سوچا' وہ مجھ سے اپنی جنم دینے والی ماں سے زیادہ محبت کرسکتا ہے۔ میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔ بیٹی کی عزت تو خاندان کی عزت و ناموس ہوتی ہے اور میں نے اسے چند کھوکھلے اور جھوٹے لفظوں کے عوض نیلام کردیا۔ میں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ جو شخص میری محبت کو پارکوں' ہوٹلوں اور کرایے کے فلیٹ میں رسوا کررہا ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر کی زینت بنائے گا۔ میں نے کیوں دھوکا کھایا۔ گناہ میں نے کیا ہے' قصور میرا ہے۔ سزا بھی مجھے ملے گی......امی ٹھیک کہتی ہیں......مجھ جیسی بیٹیوں کو مرجانا چاہئے۔" اس نے جھپٹ کر چھری اپنے قبضے میں کی۔

"آئینہ......" ایمن کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس سے قبل کہ وہ لپک کر چھری پکڑتی۔ آئینہ اپنی کلائی کی رگ کاٹ چکی تھی۔

* * *

بارش قطرہ قطرہ برس رہی تھی۔ ایسی ہی بارش اس کے اندر بھی ہوتی تھی اور مسلسل ہوتی تھی۔ شادی......کتنا مقدس بندھن۔ بزرگوں کی دعاؤں میں انجام پائے۔ تو کتنا خوبصورت' انوکھا اور دل نشین رشتہ قائم کردیتا ہے مرد عورت کے درمیان' جہاں ماں کی دعائیں لڑکی کے ہاتھوں میں سجی مہندی میں رنگ لاتی ہیں تو باپ کی دعائیں مانگ میں افشاں کی طرح سج جاتی ہیں۔

"اور یہاں کیا تھا دھوکا......عمران نے اگر مجھ سے دھوکا کیا تو اس سے پہلے میں نے اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔ میں بھول ہی گئی کہ میں کس معاشرے میں جی رہی ہوں۔ جہاں بیٹی کو سینکڑوں لوگوں کی موجودگی اور گواہی میں قرآن کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے۔ کاش میں نے بھی......" وہ ایک زخمی سا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

"اب میں زندہ ہوں مگر یہ زندگی......بس ایک سزا ہے' لیکن مجھ جیسی لڑکیوں کا یہی انجام ہونا چاہئے۔" اس کی خالی نظریں اپنی خالی گود سے ٹکرا کر واپس آگئیں۔

نو ماہ......اور ان نو مہینوں میں کیا کچھ نہیں ہوگیا۔

جب ایمن نے اس سے کہا۔

"فراز چاہتے ہیں' یہ بچہ ہم لے لیں۔" وہ ششدر سی اسے دیکھے گئی۔

"تم جانتی ہو' ہم پاکستان کیوں آئے تھے۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "حالات بگڑ گئے تھے۔ فراز مجبور ہو جاتے دوسری شادی کیلئے۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ نتیجہ تب بھی یہی نکلتا......"

آئینہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ نقص مجھ میں نہیں فراز میں ہے۔“ اس نے دبے دبے لہجے میں انکشاف کیا۔

”ایمن کیا! کہہ رہی ہو......“ وہ ششدر سی اسے دیکھے گئی۔

”میں نے یہ کسی کو نہیں بتایا۔ تمہیں بھی نہ بتاتی ...... آئینہ ...... یہ بچہ ہمیں دے دو۔“ وہ ایک دم اس کی طرف پلٹی۔ ”پھر اس معصوم کا کیا قصور ہے۔ اسے اس دنیا میں آنے سے پہلے کیوں ختم کر دیا جائے۔ اپنی اور عمران کی غلطیوں کی سزا اس معصوم روح کو دو گی۔“

”لیکن یہ سب......“ آئینہ ڈری سی گئی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی۔“ ایمن نے اسے تسلی دی اور واقعی سب ٹھیک ہو گیا۔ وہ دونوں اسے لے کر مری آگئے تھے۔ جہاں اس نے اپنے بیٹے کو جنم دیا۔ اسی دوران عمران کی طرف سے طلاق کے کاغذات بذریعہ ڈاک مل گئے۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور اس کی چرچراہٹ سے سارے خیالات ذہن کے کونوں کھدروں میں جا چھپے۔ ایمن کی گود میں معاذ تھا۔ وہ خاموشی سے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی اور آئینہ اس کے سامنے قالین پر۔ معاذ کے کمبل سے باہر نکلے ننھے منے گلابی پاؤں اس کے سامنے تھے۔ اس کے اندر ان کو اپنے لبوں سے چھونے کی خواہش نے جنم لیا۔ اپنے ضبط سے ہاتھ چھڑا کر وہ آگے بڑھنے کو تھی کہ ایمن کی آواز دیوار کی طرح حائل ہو گئی۔

”آئینہ! امی نے تمہارے لئے ایک فیصلہ کیا ہے' اگرچہ تم ان سے سارے فیصلوں کا حق چھین چکی ہو مگر پھر بھی۔ ہم سب کا خیال ہے ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ ایک پل کو خاموش ہوئی۔ آئینہ نے ہاتھ بڑھا کر گلابی پاؤں کی نرم انگلیوں کو چھوا۔

اس کے پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں......

ایمن نے کمبل کھینچ کر اس کے پیروں پر کر دیا۔ آئینہ کی نظریں بے تابی سے اس کے چہرے کے نقوش چومنے لگیں۔ پھر ٹھٹک گئیں۔ ویسی ہی کھڑی ناک' وہی لبوں کا خم اور ویسا ہی تھوڑی کا سیاہ تل ...... وہ بنا بنایا عمران تھا۔ کچھ بھی تھا۔ ان نو ماہ میں آئینہ نے اس بے وفا اور دھوکے باز شخص کو سوچا بہت تھا۔ بھلے نفرت سے ہی سہی مگر وہ اس سے نفرت نہیں کر سکتی تھی جو اس کے وجود کا حصہ تھا۔

ایمن کہہ رہی تھی۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا ہے' تم جانتی ہو۔ تم دوبارہ ماں نہیں بن سکتیں۔ ان حالات میں ہم جس سے بھی تمہاری شادی کریں گے۔ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی ضرور کرے گا۔ ویسے بھی اگر اسے پتا چل گیا تو......؟ کیونکہ ہر شخص فراز نہیں ہوتا۔ فراز نے تو جو احسان ہمارے خاندان پر

کیا ہے' اس کا بدلہ ہم ساری عمر بھی نہیں دے سکتے۔ وہ......“

”اسے مجھے دے دو......“ آئینہ کی بانہیں بے اختیار پھیلیں۔ ایمن ایکدم کھڑی ہو گئی۔

”شام کو تمہارا نکاح ہم محسن کے ساتھ کر رہے ہیں۔“

آئینہ کے بازو پہلو میں گر گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایمن کو دیکھنے لگی۔ وہ دروازے کے قریب جا کر رک گئی۔ پھر پلٹ کر بولی۔

”تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ ہم نے تمہارے ساتھ کوئی ظلم کیا ہے۔ یہ ظلم تم نے خود کمایا ہے۔ اپنے ساتھ دشمنی تم نے خود کی ہے۔ معاذ کی تم فکر نہ کرنا۔ یہ تمہارا نہیں اب ہمارا بیٹا ہے۔“

محبت کی راہ میں پہلا قدم اٹھاتے ہوئے یہ گمان بھی نہ تھا کہ دوسرا قدم پاتال میں جا گرائے گا۔ وہ واقعی کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی کہ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں برباد کی تھی اس نے۔

آغا محسن کے ساتھ اس کا نکاح بے حد سادگی کے ساتھ ہوا تھا اور انہوں نے اس سے پہلی بات یہی کی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم کہ تم سے ایسی کیا غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی پاداش میں تمہیں چار بچوں کی ماں بننے پر مجبور کر دیا گیا۔ میں پوچھوں گا بھی نہیں کہ مجھے تمہارے ماضی سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں صرف اس گھر کا سکون اور اپنے بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ چاہتا ہوں۔ جو ثمینہ کے جانے سے ختم ہو گئی۔“

آئینہ نے اپنی بچی کھچی مسکراہٹ' سکون' محبت اور دکھ دعاؤں میں لپیٹ کر معاذ کے کمبل میں رکھ دیے اور جس دن وہ جا رہے تھے۔ آسمان نے اس کے سارے آنسو ادھار لے کر دھرتی پر برسا دیئے۔ وہ خشک آنکھوں سے امی کو سامان باندھتے دیکھتی رہی۔ وہ ایمن اور فراز کے ساتھ جا رہی تھیں۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔

”ماں! کوئی بہت ہی بچی کھچی دعا بھیک میں ہی دے جاؤ۔“

مگر اس کے لب خاموش ہی رہے۔ وہ خود کو اب اس کا حقدار نہیں سمجھتی تھی۔ اس کی سماعتیں معاذ کی آواز سن رہی تھیں۔ نجانے کیوں وہ اس رات بہت رویا تھا۔ باہر آسمان برستا تھا۔ اندر وہ روتا تھا اور وہ ایمن کے کمرے کے سامنے کھڑی ساری رات بھیگتی رہی تھی مگر اندر جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ صبح اس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں التجا کرتی تھیں۔

”ماں! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

انہوں نے نجانے کتنے عرصے کے بعد نظر اٹھا کر بیٹی کو دیکھا اور بے اختیار اسے گلے

لگا لیا۔

"آئینہ! کاش تو نے یہ سب نہ کیا ہوتا۔"

پھر وہ سب چلے گئے تھے۔ لق و دق صحرا میں وہ تنہا تھی۔ پل صراط کا سفر تھا۔ لہولہو ہوئے دل کو سنبھالے وہ اس رشتے کو نبھانے کی سعی کرتی رہی۔ جس کی ابتدا ہی شک سے ہوئی تھی۔ آغا محسن نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ مگر وہ اس سے لمحے لمحے کا حساب لیتے تھے۔ اس کی ذرا سی غلطی، ذرا سی لرزش معاف کرنے کے روادار نہ ہوتے اور آئینہ نے یہ سب اپنی سزا سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ سزا در سزا کا یہ سلسلہ پچیس سال پر محیط ہوگیا۔ امریکہ سے فون آتا، اس کا وجود سماعت بن جاتا۔ ایمن ادھر ادھر کی باتیں کرتی۔ وہ منتظر ہی رہتی۔ پھر بے اختیار پوچھ لیتی۔

"معاذ! کیسا ہے ایمن۔"

ایمن ایک پل کو خاموش ہو جاتی۔ "ٹھیک ہے۔" کہہ کر فون بند کردیتی۔ کچھ وقت گزرا۔ ایمن گویا بھول ہی گئی۔ آئینہ کا معاذ سے کیا رشتہ ہے۔ وہ معاذ کی ہر کامیابی کا تذکرہ یوں کرتی جیسے اپنے بچے کا کر رہی ہو۔ آئینہ نم آنکھوں سے مسکرا دیتی۔ پھر سوچتی۔

"شاید یہ ٹھیک ہی ہوا۔ میری غلطی کی سزا میرے بچے کو کیوں ملتی۔"

اس نے معاذ کی محبت کو دل میں چھپا کر اپنی پوری توجہ ان بچوں پر مرکوز کردی۔ اس نے اپنی عمر کے چوبیس برس ان کے اسکول کے بستوں، کاپیوں، کتابوں اور کالج کی فائلوں میں تقسیم کردیے۔ تب ایک دن جب تابندہ کیلئے ایک اچھا رشتہ آیا تھا۔ وہ کچن میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہوئے آہستگی سے پوچھنے لگی۔

"آنی! محبت کیا ہوتی ہے......؟"

اس کا دل پتے کی طرح لرزا۔ اس نے پلٹ کر تابندہ کو دیکھا۔ وہاں تابندہ نہیں آئینہ کھڑی تھی۔ ایک اور آئینہ کسی عمران کا شکار بننے چلی تھی۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اور وہ روشنی سے ڈری ہوئی تھی۔ ان بچیوں کو زمانے کے سرد گرم سے بچانے کیلئے انتہا پسند ہوگئی تھی۔ اس نے تابندہ کی شادی کردی۔ حالانکہ کتنا انکار کیا تھا اس نے۔

"مجھے پڑھنا ہے ابھی......"

مگر وہ اس کے انکار کو کسی اور تناظر میں دیکھتی تھی۔ اس نے دعاؤں کے سائے میں رخصت کرتے ہوئے یہ کب سوچا تھا کہ وہ لوٹ کر پھر یہیں آجائے گی اور تابندہ اس سے ناراض تھی۔ اپنی بربادی کا ذمہ دار آنی کو سمجھتی۔

پھر معاذ آگیا۔ وہ بے یقین اور مایوس سی ہو رہی تھی پھر سے جی اٹھی۔ وہ معاذ کو دیکھتی تو بات بھول جاتی۔ وہ ہو بہو عمران جیسا تھا۔ مگر وہ اس سے نفرت نہیں کرتی تھی کر ہی نہیں سکی

تھی۔ وہ اسے چھونا چاہتی۔ اپنی بانہوں میں بھر کر سینے سے لگانا چاہتی پھر ڈر جاتی......

"جب اسے معلوم ہوگا کہ اس کی ماں......"

وہ کترا جاتی۔ سامنے سے ہٹ جاتی۔ پھر ایک دن اس نے معاذ اور رانیہ کو آگے پیچھے ان درختوں سے نکلتے دیکھا۔ معاذ گم صم تھا۔ کچھ سوچتا ہوا جبکہ رانیہ کے چہرے پر رنگ تھے۔ لبوں پر خوبصورت مسکان، پھر ہتھیلی پر دھرا ایک ننھا سا پھول۔

وہ چکرا گئی۔ آخر وہ تھا تو اسی بے وفا اور دھوکے باز عمران کا بیٹا۔

مگر وہ سنجیدہ تھا۔ رانیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسی رات ایمن کا فون آگیا۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

"میں جانتی تھی، تم اسے مجھ سے چھین لوگی۔ اسی ڈر سے اسے پاکستان نہیں بھیجتی تھی۔ تم اسے خود حاصل نہ کرسکیں تو رانیہ کو آگے کردیا۔ مگر وہ میرا بیٹا ہے...... اور ہمیشہ میرا ہی رہے گا۔"

"اور...... میں......" وہ ریزہ ریزہ ہوکر اپنے ہی قدموں میں بکھر گئی تھی۔ وہ اس کا اپنا تھا مگر وہ اسے اپنا کہہ نہیں سکتی تھی۔ "اور وہ جو میرے کچھ نہیں تھے۔ جنہیں میں نے اولاد کی طرح پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ وہ بھی پوچھتے ہیں، میں ان کی ہوتی کون ہوں...... بس سوتیلی ماں۔ کیا ایک غلطی کی سزا بھگتنے کیلئے پچیس برس کم ہوتے ہیں...... لیکن میں تو غلطی پر غلطی ہی کرتی رہی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھلانے کی کوشش میں آنسو دیتی رہی...... تو ہوا یہ آئینہ کہ تو فیل ہوگئی۔" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر رو دی۔ باہر بہاروں کے قافلے اتر رہے تھے اسے اپنا آپ خزاں کی دھول لگا جسے خزاں گزیدہ ہوا اپنے ساتھ اڑا لے گئی تھی اور اب پھر سے اپنی تلاش کا عمل شروع تھا۔

"آنی......؟"

"اور یہ جو مجھے ماں نہیں آنی کہتا ہے، میرا ہے مگر میں کبھی اسے اپنا نہیں کہہ سکوں گی۔"

اس کے اندر تپتی ریت اڑنے لگی جس پر ننگے پاؤں وہ پانی پانی پکارتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ ریت بہنے لگی۔ "اور یہی ہم خزاں رسیدوں کا مقدر ہے۔"

ریتلے آنسوؤں کو ہتھیلیوں میں سنبھال کر اس نے سوچا تھا۔

"آنی! یہاں محبت کی اتنی کڑی سزا کیوں ملتی ہے۔؟" وہ اس کے عقب میں کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"محبت کی نہیں مان توڑنے اور اعتبار ریزہ ریزہ کرنے کی سزا ملتی ہے۔ جو محبت کرتے ہیں ان میں لڑنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ چور رستوں سے حاصل ہونے والی محبت یونہی خوار

کرتی ہے۔"

"میں نے تو کوئی چور رستہ تلاش نہیں کیا۔ پھر میرے ساتھ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ میں نے محبت کی ہے اور مجھ میں لڑنے کا حوصلہ بھی ہے لیکن آپ مجھے کمزور کر رہی ہیں۔ آپ کو کیوں لگتا ہے میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔"

"کیونکہ تم......" الفاظ ان کے حلق میں اٹک گئے۔

"کیونکہ میں...... جملہ پورا کریں آنی......" وہ ان کے سامنے آیا۔ وہ سر جھکائے روتی رہیں۔ معاذ نے دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھے اور ان کے سر پر بوسہ دیا۔ پھر افسردہ سے لہجے میں بولا۔

"مجھے تو لوٹ کر یہیں آنا تھا۔ کیونکہ یہاں رانیہ ہی نہیں میری ماں بھی رہتی ہے۔"

"معاذ......" ساری کائنات ایک لمحے کو ساکت رہ گئی۔

"مجھے ڈیڈی نے سب بتا دیا تھا...... حقیقت بھی کبھی چھپ سکی ہے...... میں صرف ان کا نہیں آپ کا بھی تو بیٹا تھا امی! پھر مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کیا......؟" وہ ان کے دونوں ہاتھ تھامے رو دیا تھا۔

"ٹپ...... ٹپ......" صحرا کے تپتے بدن پر بوندیں گر رہی تھی۔ آبلہ پائی کا سفر تمام ہونے کو تھا۔ ان کے بازو پھیلے اور اسے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ وہ دونوں رو رہے تھے اور ان کے آنسو صدیوں کی پیاس بجھانے لگے۔

* * *

دن بہت روشن اور چمکدار تھا۔ بہار کی خوشبوؤں سے لبریز، معطر معطر سا۔

تابی کی فائل میں کوئی ایک نظم لکھ گیا تھا اور عنوان کی جگہ ایک تازہ ادھ کھلا گلاب کا پھول رکھا تھا۔ تابی کی نظر سب سے پہلے پھول پر ہی پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پھول اٹھا لیا اور نظریں ان معطر معطر سے لفظوں پر پھسلنے لگیں۔

جاناں!
میں نے اب کے سال بھی سبز رتوں کا پہلا پھول
ایک تیری خاطر شاخ شجر سے توڑ کے اپنی زرد کتاب میں لا رکھا ہے
کوئی نہ جانے
کبھی کوئی آوارہ بادل، بھولا بھٹکا بادل
عمر کے ترسے پیاسے دشت کی
پل میں پیاس بجھاتا ہے

کوئی نہ جانے
بعض اوقات ایک بھولی بسری دعا بھی
ایسے پوری ہو جاتی ہے جیسے غیر آباد جزیرے
رستہ بھول کے آنے والے لوگوں سے بس جاتے ہیں
یوں میں نے اب کے سال بھی جاناں
سبز رتوں کا پہلا پھول ایک تیری خاطر
شاخ شجر سے توڑ کر اپنی زرد کتاب میں لا رکھا ہے

اسٹک کی ٹک...... ٹک کمرے کے دروازے پر آ رکی۔ تابی نے گلاب کی نازک پتیوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"اندر آ جاؤ۔ یہ دروازہ تمہارے لئے کبھی بند نہیں ہوا۔"

ٹک...... ٹک اس کے عقب میں آ کر ٹھہر گئی۔

"میں ڈرتا تھا۔ ایک ادھورے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا بے حد تکلیف دہ احساس ہوگا۔"

وہ ان کی طرف پلٹی۔

"ادھوری رفاقتوں اور ادھوری محبتوں سے زیادہ نہیں...... اور تمہیں تو میں نے کبھی ادھورا سمجھا ہی نہیں تھا آفاق......! مجھے تو تمہاری زندگی میں بس اتنی ہی جگہ چاہئے جتنی اس بیساکھی کی ہے۔"

"اور میں اس کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا......"

آنی واپس پلٹ گئیں۔

* * *

صبح اٹھتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا۔ وہ چلا گیا ہے...... جتنی اچانک آیا تھا اتنی ہی اچانک...... لیکن اس کے واپس آنے کا یقین ان کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر پھیلا۔ آفاق اور تابی، ہنسے تھے۔ سکوت کا بوڑھا اونگھتا پنچھی ہڑبڑا کر جاگا۔ اپنے پر جھاڑے اور اڑ گیا۔ ایکدم ساری آوازیں واضح ہو گئی تھیں۔

آفاق اور تابی ہنس رہے تھے۔

پھر تابی ان کے سامنے آئی۔

"آئی ایم سوری آنی! مجھے وہ سب نہیں کہنا چاہئے تھا۔"

آنی نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا اور سیڑھیاں اتر گئیں۔ لاؤنج میں عمر اور حمزہ نے

ہڑبونگ مچا رکھی تھی۔ عالیہ آنٹی انہیں ناشتے کیلئے پکار رہی تھیں۔ وہ باہر نکل گئیں۔

لمبے ڈنڈیوں والے ادھ کھلے گلاب ان کا رستہ روک رہے تھے۔

ستونوں سے لپٹی بیلیں' سرخ سفید اور کاسنی کلیوں سے لدی تھیں۔

مروا کے خم دار پتیوں والے پھول

ہارسنگھار کی زرد ڈنڈیاں

موتیے کی کلیاں

فضا میں لیموں کے پیڑوں کی مہکار اور پھولوں کی خوشبو رقص کرتی تھی۔ بابا رانیہ سے لڑ رہا تھا۔ وہ اب پھول توڑنے کی ضد کیوں نہیں کرتی اور وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تمہیں نہیں پتا بابا! میرے ہاتھ میں کوئی سبز رتوں کا پہلا پھول دے گیا ہے۔''

بہار کی اولین ساعتوں جیسی خوبصورت مسکان نے آئینہ کے لبوں کا احاطہ کرلیا۔ انہیں لگا بہار نے اچانک ان کا رستہ روک لیا ہے۔

* * *

سرخ گلابوں کے موسم

''وہ میری محبت کا خوبصورت چہرہ ہے' جس نے ہمیشہ کیلئے جدا ہوتے ہوئے کہا تھا۔ مجھے خاموشیوں میں آواز دینا۔ مجھے گلاب اور گیندے کے پھولوں میں تلاش کرنا۔ کل میں نے غروب ہوتے ہوئے سورج سے کہا کہ وہ میری محبت کو وہاں تلاش کرے جہاں وہ طلوع ہو رہا ہے۔ میں نے سوکھے زرد پتوں کو اڑاتی ہوا سے کہا اگر کسی زرد پتے پر میری محبت کا نام لکھا ہوا ہو تو وہ زرد پتا مجھے لا دے۔ ہوا زرد پتوں کو اڑاتی گزر گئی۔ میری گلی میں سے موتیے کے پھولوں کی خوشبو نہیں گزرتی۔ میں کس سے اپنی گمشدہ محبت کا پتا پوچھوں۔''

کتاب کے صفحے پھڑپھڑائے تھے اور لفظ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ لکڑی سے بنا قدیم منقش جھولا دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ ہوا زرد پتے اڑا رہی تھی اور ٹنڈ منڈ درخت اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دھوپ میں چمکتا ہلکا نیلا آسمان تھا۔ جسے آلوچے کے درخت کی برہنہ شاخ دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ اس نے غور سے اس شاخ کو دیکھا' وہ اسے سراپا انتظار لگی۔

اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی انگلیاں سینے پر دھری کتاب کے عنوان پر رینگ رہی تھیں۔

خزاں زدہ ہوا میں انتظار کی خوشبو رچی تھی۔

تب ہی اس کی انگلیاں ساکت ہوئیں اور کچھ حیران بھی۔ انہوں نے کتاب میں سے جھانکتے ہلکے نیلے لفافے کو چھوا تھا' پھر انگلیوں نے اس کا نام ڈھونڈ لیا۔

سلمان احمد صدیقی۔

جس نے کبھی اسے دیکھا نہیں تھا پھر بھی اس نے لکھا تھا۔

"یہاں بہت تنہائی ہے اور تنہائی بسیط تاریکی کی طرح ہوتی ہے۔ اپنے اندر نگل لینے والی۔ اس مہیب تاریکی میں' میں کھو جاتا جو میرے ہم قدم تمہاری آنکھیں نہ ہوتیں۔ اماوس کی رات میں چمکتے جگنوؤں کی جگمگاہٹ لئے' جگنو ایسے شرر کی بساط کیا۔ مگر اندھیروں کی موت ایک کرن ہوا کرتی ہے۔ تمہاری آنکھوں کی چمک نہ مجھے کھونے دیتی ہے اور نہ بھٹکنے۔ میرے اندر باہر کی ساری تاریکیوں کو ایک پل میں مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ تم میرے کتنا قریب ہو شاید تمہیں خود بھی اندازہ نہیں۔ میں بتا بھی نہیں سکتا' یہ کیسا اچھوتا سا بندھن ہے جو تمہارے میرے درمیان بندھ گیا ہے۔ میں آتی جاتی ہواؤں سے تمہاری خوشبو چرا لیتا ہوں۔ میں جاتے موسموں سے تمہاری خبر لیتا ہوں۔ سورج کی اولین کرنیں تمہیں چھو جاتی ہیں تو مجھے بتاتی ہیں۔ چاند تمہارے آنگن میں جھانکتا ہے تو مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں تحریم! نہیں میں تمہیں کبھی کہوں گا کہ تحریم سے دوری کا احساس کچھ بڑھ جاتا ہے اور جب یہ احساس مجھے اپنے گھیرے میں لیتا ہے تو میرے تخیل کی کھڑکی کھلتی ہے اور میں تمہیں دیکھتا ہوں۔ سرخ گلابوں کے کنج میں۔ جھولا دھیرے دھیرے حرکت میں ہے۔ فضا میں اولین بہار کی خوشبو رچی بسی ہے۔ شوخ ہوا چنچل سہیلی کی طرح تم پر پھول نچھاور کرتی ہے اور تمہاری سانسوں میں سرخ گلابوں کی مہک بسی ہے۔ تم سوچتی ہوگی مجھے یہ سب کس نے بتایا۔ یہ ہوائیں بڑی شریر ہیں اور چاند بڑا بے ایمان جو دیکھتا ہے کہہ دیتا ہے۔ تم حیران تو ہوگی مگر لکی! یہ تو بتاؤ۔ کیا تم اب بھی جھولے پر بیٹھ کر اے حمید کے ناول پڑھتی ہو۔"

اس کی آنکھیں بند تھیں اور متحرک انگلیاں وہ دوسرا نیلا لفافہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ تب ہی دوسرا لفافہ گرفت میں آیا۔ وہی ہلکا نیلا لفافہ' جس کے کونے میں اس کا نام لکھا تھا۔ سلمان احمد صدیقی۔

اس لفافے کے انتظار میں اس کی عمر کے کتنے ہی سال خزاں کے زرد سوکھے پتوں کی طرح بکھر گئے تھے' پھر بھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ابھی آنکھوں میں چمک تھی اور دل میں انتظار کی تاب بھی۔

پر اس کے بعد عمر کے کتنے سالوں کو وقت کے ہاتھوں دھول ہونا تھا' کون جانے۔ اب یہ لفافے اس کی متاع حیات تھے کہ یہ دو لفافے' دو کاغذ کے پرزے نہ تھے۔

دو خواب تھے' دو وعدے۔

جو وہ اس کی ہتھیلیوں پر چراغوں کی صورت دھر گیا ہے اور وہ دونوں ہتھیلیاں پھیلائے ان چراغوں کو بے مہر ہواؤں سے بچانے کی کوشش میں خود بجھتی جا رہی تھی اور وقت کتنی آہستگی سے اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر رہا تھا۔ اسے خبر ہی نہ تھی کہ نظریں تو چلتے چراغوں کی تھرتھراتی لو پر تھیں۔

وہ پہلا خط اک خواب تھا۔

اس سے محبت اور چاہت کا خواب۔

اور دوسرا اک وعدہ تھا' لوٹ آنے کا۔

اس نے لکھا نہیں تھا کہ وہ اب بھی اے حمید کے ناول پڑھتی ہے یا نہیں' وہ بس منتظر رہی تھی۔ تب برسوں بعد اس نے لکھا تھا۔

"فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھے بندھن کمزور نہیں پڑتے۔ دوریوں کا احساس دل میں جاگزیں ہو تو انتظار مر نہیں جاتا۔ میں واپس آؤں گا جب تمہاری سماعتیں سبز موسموں کی آہٹیں سنیں گی۔ جب سبز ہوائیں تم پر اپنی خوشبو نچھاور کریں گی' جب آلوچے کے پیڑوں پر پہلا گلابی رنگ بکھرے گا۔ جب موتیے کی سفید کلیاں کھلیں گی۔ تمہاری سانسوں میں سرخ گلابوں کی خوشبو مہکے گی۔ میں تب آؤں گا۔ ہاں میں سرخ گلابوں کے موسم میں آؤں گا۔"

اس نے ایک سرد آہ کھینچ کر آنکھیں کھولیں۔ آلوچے کی برہنہ شاخ اب بھی سراپا انتظار بنی نیلے امبر کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ زرد ہوا میں انتظار کی خوشبو رچی تھی۔ ٹنڈ منڈ درخت اس پر زرد سوکھے پتے نچھاور کر رہے تھے۔ نہ آلوچے کے پیڑ پر گلابی رنگ بکھرا تھا' نہ موتیے پر سفید کلیاں کھلی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے زرد ہوا کا جھونکا تھاما اور کہنے لگی۔

اس سے کہنا میرے آنگن میں موسم مستقل نہیں ٹھہرتے۔ فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھن کمزور نہیں پڑتے' کبھی کبھی ٹوٹ جاتے ہیں۔

انتظار مرتا نہیں۔ آنکھوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ بس آنکھیں مر جاتی ہیں۔

میری سماعتیں سبز موسموں کی آہٹ سنتے سنتے مرنے لگی ہیں۔ آلوچے کے پیڑ پر کئی بار گلابی پھول کھلے اور کھل کر بکھر گئے۔ موتیے کی سفید کلیاں دھوپ کی زد میں آ کر ٹوٹ گئیں۔

ادھ کھلے گلاب کا دکھ تم کیا جانو کہ جس کی خوشبو فضاؤں میں نہ بکھر سکے' اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ جائے۔

"تم کیسے آؤ گے سلمان احمد کہ میرے آنگن میں اب سرخ گلاب نہیں کھلتے۔"

زرد ہوا کے جھونکے نے سر جھکا کر یہ سب سنا اور چپکے سے چلا گیا۔

کون جانے یہ جھونکا اس کے گھر تک پہنچے گا یا نہیں۔

* * *

یہ ایک شہر کے ہنگاموں سے دور منقش آبنوسی دروازوں والا خوبصورت سفید گھر تھا۔ بہت بڑا مگر کچھ قدیم۔ اس سے متصل بڑا سا باغ۔ اگرچہ سامنے سے گزرنے والی سڑک کی دوبارہ تعمیر

کی بنا پر سڑک سے اس کا لیول کچھ نیچا ہو گیا تھا' پھر بھی سرسبز بیلوں اور رنگا رنگ پھولوں سے ڈھکا یہ گھر ایک بار تو توجہ ضرور کھینچتا تھا' پھر چھوٹی چاردیواری سے جھانکتے پھل دار اور پھول دار پودے۔ یہ گھر دو بھائیوں کی ملکیت تھا۔

اشفاق احمد صدیقی اور ابصار احمد صدیقی۔

اشفاق احمد صدیقی کا انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ ان کا بس ایک ہی بیٹا تھا' زوار احمد صدیقی۔

ابصار احمد صدیقی کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی تحریم عرف ککی آپا' پھر رمنا عرف مانہ پھر سمانہ اس کا نام اتنا چھوٹا تھا کہ مزید چھوٹا کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی اور سب سے چھوٹے حسام احمد صدیقی عرف ٹیپو۔ بیگم اشفاق اور بیگم ابصار خالصتاً گھریلو خواتین تھیں۔

جاتی سردیوں کا اداس اداس سا دن تھا۔ گھر میں کچھ خاموش' کچھ سوئی جاگی سی کیفیت طاری تھی۔ جسے پانی کی ٹینکی پر چڑھے ٹیپو کی تیز اور جھنجلائی ہوئی آواز نے جھنجھوڑا تھا۔ کتاب میں کھوئی جھولے پر نیم دراز ککی آپا چونک گئیں جبکہ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے اونگھتی بیگم اشفاق ہڑبڑا کر جاگی تھیں جبکہ ان کے اکلوتے فرزند یوں ہی تکیے پر سر رکھے اوندھے پڑے گھاس نوچ رہے تھے۔ عجیب سی بیزاری ان کے لمبے چوڑے وجود پر چھائی تھی۔ یا وہ خود کو بیزار ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہرحال انہوں نے سر اٹھا کر ٹیپو کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سبزیوں کے کھیت میں مصروف وجود بھی بدستور مصروف رہا تھا۔

''میں خودکشی کرنے والا ہوں۔''

ٹیپو کے اس اعلان پر تقریباً سب ہی کی نگاہیں پرواز کرتی ہوئیں پانی کی ٹینکی پر ایستادہ ٹیپو تک گئیں۔ ٹیپو کے ایک ہاتھ میں ٹینکی صاف کرنے والا برش تھا۔ شرٹ کے کھلے بٹنوں اور گھٹنوں تک چڑھائی جینز کے ساتھ وہ جارحانہ انداز میں منڈیر پر کھڑا تھا۔

''کیا فضول باتیں کرتے ہو ٹیپو! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔'' بیگم اشفاق عرف تائی اماں نے ہول کر اکلوتے بھتیجے کو بری طرح گھورا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں' یہ بھی کوئی زندگی ہے۔'' اس نے منہ بنا کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔

''کیوں کیا ہوا۔ اچھی بھلی تو گزر رہی ہے۔ کفران نعمت مت کرو۔'' ککی آپا نے کتاب بند کر کے کسلمندی سے جمائی لی۔

''یہ اچھی بھلی ہے؟ جبر مسلسل کی طرح کٹ رہی ہے۔ میرے پاس ڈھنگ کے کپڑے

تک نہیں ہیں اور وہ اباجی کی گاڑی ہے جسے گاڑی کہنا ہی گاڑی کی توہین ہے۔ کل میں نے فراز سے کہا میں تمہیں لفٹ دے دیتا ہوں تو موصوف نے فرمایا۔ نہیں' مجھے ذرا جلدی جانا ہے اور موصوف پیدل ہی چل دیئے اور وہ پرسوں ایک فقیر میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور ساری جیبیں ٹٹول کر بھی ان میں سے ایک روپیہ بھی نہیں نکلا تو جن نظروں سے اس نے مجھے دیکھا بس یہ کہنے کی کسر باقی تھی کہ بھائی تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔'' وہ حسرت و یاس سے کہہ رہا تھا۔

ککی آپا نے اسے بری طرح گھورا۔

''اب کیا پورے محلے کو سناؤ گے۔''

''محلہ۔'' ٹیپو نے دانت پیسے۔ ''وہ ایک حسینہ مہ جبینہ جلوہ افروز ہوئی تھیں بالکونی میں۔'' ٹیپو نے حسرت سے کسی گھر کی بالکونی میں جھانکا۔ ''ابھی ابھی اشارہ کر گئی ہیں کہ اس گھر کی ٹینکی صاف ہو گئی ہو تو ہماری بھی صاف کر جانا۔''

''خیر اب اتنے بھی حالات نہیں بگڑے۔ وارڈ روب بھری ہے تمہاری کپڑوں سے۔'' تائی اماں اس کی مبالغہ آرائی سے خائف نظر آتی تھیں۔

''ہاں بس کبھی کبھی نہا کر انہیں پہننے کی زحمت گوارا کر لیا کرو۔'' سمانہ سبزیوں کے کھیت میں سے برآمد ہوئی۔ ایک ہاتھ سے بال سمیٹتے ہوئے اس نے ٹیپو کو گھورا جبکہ دوسرے ہاتھ میں مٹر سے بھری ٹوکری تھی۔ یہ کھیت باغ کے ایک کونے میں کچھ بچت اور کچھ شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے لگایا تھا۔

''پچھلی عید پر نہایا تھا' اب اگلی عید پر نہاؤں گا۔'' وہ شرارت و ڈھٹائی سے بولا۔

پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''یہ عید کب آ رہی ہے؟''

''جب تم نہاؤ گے۔'' ترت جواب آیا۔ ''پر نہا کر باہر مت نکل جانا۔ بچے عیدی مانگنے لگیں گے۔''

''اف۔'' وہ بھنا کر بولا۔ ''یہ ہے میری اوقات اور یہ ہے میری زندگی۔ بہنو! اور بھائیو!'' اس نے غیر متوجہ بھائی کو متوجہ کرنے کی کوشش کی' جو بدستور گھاس توڑ توڑ کر ڈھیری لگانے میں مصروف تھا۔

''میں جا رہا ہوں۔''

''ٹیپو صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' جاجی سودا سلف اٹھائے اندر داخل ہوا تھا۔

''ہم چلے اس جہاں سے' دل اٹھ گیا یہاں سے'' وہ دل گرفتہ لہجے میں گنگنایا۔

''کوئی ضرورت نہیں تمہیں کہیں جانے کی۔ جب بھی تمہیں کوئی کام کہتی ہوں' یوں ہی کھسکنے

کی کوشش کرتے ہو۔ ٹینکی صاف کر کے نیچے اترو۔'' کچن سے جھانک کر بیگم ابصار نے اپنے اکلوتے فرزند کو بری طرح لتاڑا۔ وہ باقی تمام گفتگو سے لاعلم نظر آتی تھیں۔

''اف......اف۔'' ٹیپو سر پیٹ کر رہ گیا۔

''آپا! دھیان رکھیں اس کا۔ کام سے پہلے نیچے نہ اترنے پائے۔'' انہوں نے تائی جان سے کہا اور غڑاپ سے کچن میں غائب ہوگئیں۔

''توپیں رکھ دیں نیچے' کہیں میں نیچے نہ اتر آؤں۔'' وہ جھنجلایا۔

''ویسے ٹیپو! یہ تم ٹینکی صاف کر رہے ہو یا ٹینکی تمہیں صاف کر رہی ہے۔'' سانہ نے اس کی حالت زار پر چوٹ کی۔

''بس میں اسی ٹینکی میں کود رہا ہوں۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔

''اس کیلئے ٹینکی کی نہیں' چلو بھر پانی کی ضرورت ہے۔'' سانہ نے کہا' پھر اس کی طرف توجہ دینے کے بجائے تائی اماں' اماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ جبکہ ٹیپو نے جل کر ٹینکی میں چھلانگ لگائی اور رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔ اس کا سارا غصہ اب یہیں نکلنا تھا۔

''جاجی کہاں ہے؟''

''اندر کچن میں سودا سلف رکھ رہا ہے۔'' انہوں نے بتایا تو وہ ٹوکری سمیت کچن میں آگئی۔ جاجی کیبنٹ کھولے سامان رکھ رہا تھا۔

''جاجی! فٹافٹ مٹر چھیلو۔'' اس نے حکم صادر کیا اور خود ہاتھ دھونے لگی۔

''ہیں جی' آج پھر آلو مٹر پکیں گے۔'' جاجی صدمے سے بے ہوش ہونے کو تھا۔ سانہ نے اسے بری طرح گھورا اور چاول نکالنے لگی۔ ذرا سی دیر میں سارا گھر مٹر پلاؤ کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر مٹر پلاؤ اور رائتہ سجا کر اس نے جاجی کو بھیجا کہ وہ سب کو بلا لائے۔ ٹیپو بھی برآمد ہوگیا تھا ٹینکی میں سے۔ رفتہ رفتہ سارا گھر جمع ہوگیا۔

''ماشاء اللہ سانہ کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے۔''

تائی اماں نے دوسری بار ڈش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے تعریف کی۔

''تائی اماں! آپ دوسری بار بھی بغیر تعریف کے لے سکتی ہیں' سانہ بالکل بھی برا نہیں مانے گی۔'' رمنا نے شرارت سے کہا۔ تائی اماں جھینپ گئیں۔

''لو میں' کوئی اس لئے کہہ رہی ہوں۔''

''بری بات رمنا!'' امی نے سرزنش کی۔ وہ لاپروائی سے چاول کھاتی رہی۔

''ذائقے کی بات تو ٹھیک ہے مگر جس تواتر سے یہ ہمیں مٹر کھلا رہی ہے مجھے شک ہے کہ میرے پیٹ میں مٹر کا پودا اگ آیا ہے۔'' زوار بھائی نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر تشویش سے کہا۔

''آپ پودے کی بات کر رہے ہیں۔'' ٹیپو نے دہائی دی۔ ''میری تو شکل روز بروز مٹروں سے مشابہہ ہوتی جا رہی ہے۔''

''اس میں ان کا کوئی قصور نہیں' تمہاری شکل پہلے سے ہی ایسی ہے۔'' سانہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیوں تنگ کرتے ہو بے چارے کو۔ چپ کر کے کھانا کھاؤ۔'' بیگم ابصار نے انہیں ڈانٹا' پھر سانہ سے پوچھنے لگیں۔ ''جاجی کو کھانا دے دیا۔''

''وہ تو سب سے پہلے کھا چکا۔ اب قیلولہ فرمانے گیا ہے۔''

''اب کا تو ہوگیا' شام میں......؟''

''قیمہ پڑا ہے امی۔''

''تھوڑا ہوگا۔ ایسا کرو' اس میں تھوڑے مٹر ڈال لینا۔''

''پھر مٹر۔'' ٹیپو سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

* * *

سانہ کچن سے لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں جھکی رمنا کے ساتھ رات دیکھا جانے والا ڈرامہ ڈسکس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمچہ تھا اور دوسرا کھلی کھڑکی پر چوکھٹ پر دھرا تھا جبکہ رمنا ہاتھ میں ناول پکڑے لان چیئر پر بیٹھی بڑے فراغت میں اس کے ساتھ محو گفتگو تھی جبکہ کچن کی کھڑکی پر جھکی عشق پیچاں کے کاسنی پھول سوکھ سوکھ کر نیچے گر رہے تھے۔ وہ دونوں ہی فراغت کے دن گزار رہی تھیں۔ سانہ نے گریجویشن کر لیا تھا جبکہ رمنا تھرڈ ایئر کے ایگزامز کے بعد کالج کھلنے کی منتظر تھی جبکہ ٹیپو نے حال ہی میں بی ایس سی فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا تھا۔ زوار بھائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاب کی تلاش میں سرگرداں تھے جبکہ لکی آپا سکول میں پڑھاتی تھیں۔ سانہ کا تو سارا وقت پھولوں' پودوں کو سنوارتے اور کوکنگ کرتے گزر جاتا تھا۔ اس کے بک شیف میں ساری کتابیں ان ہی موضوعات کے گرد گھومتی تھیں۔ رمنا کے سارے شوق اس کی عمر کے مطابق تھے۔ میوزک' ٹی وی' ناول وغیرہ۔

تب ہی لکڑی کا قدیم طرز کا دروازہ کھول کر ٹیپو آ گیا۔

''ہائے۔'' اس نے دور ہی سے نعرہ لگایا۔

"وعلیکم السلام۔" رمنا نے فوراً کہا' جبکہ سانہ کھڑکی میں سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔

"پکایا کیا ہے آج؟" وہ کھڑکی پھلانگ کر اندر تھا۔ ابھی ابھی کالج سے لوٹا تھا سو بھوک زوروں پر تھی۔

"مرغ۔" سانہ نے کڑاہی میں کفگیر ہلایا۔

"ایں......" مارے حیرت کے ٹیپو کا منہ کھلا۔ جھٹ شتر مرغ کی طرح گردن کھڑکی سے باہر نکالی۔

"رمنا! تم صبح کتنے بجے جاگی تھیں؟"

"کافی صبح اٹھ گئی تھیں' کیوں؟" رمنا نے ناول سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

"سورج کدھر سے نکلا تھا؟"

جواباً سانہ کا کفگیر اس کی پیٹھ پر لگا۔

"اف۔" وہ تیورا کر پلٹا' تب ہی زوار بھائی کچن میں وارد ہوئے۔

"کہاں ہے وہ۔ خدا کیلئے جلدی چہرہ کرواؤ کہ مدتوں گزر گئیں اس کا دیدار کئے۔"

وہ سانہ کے حد درجہ قریب آ کر بریک لگا سکے تھے۔ سانہ جھنجلا کر پلٹی' پھر انہیں اتنا قریب دیکھ کر اس نے کفگیر کی ڈنڈی سے انہیں پیچھے کر کے جھنجلا کر پوچھا۔

"کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"ہائے ظالم۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر کر کے اڑ جائے' خدارا اس کا دیدار کروا دو۔" انہوں نے دہائی دی۔

"کون اڑ جائے؟" سانہ نے حد درجہ حیرت سے پوچھا۔

"میں نے سنا ہے' یہاں مرغ پک رہا ہے۔" وہ ایک دم لہجہ بدل کر کان کھجاتے ہوئے بولے تھے۔

"اف جائیں ٹیبل پر' میں لگا رہی ہوں کھانا۔" سانہ نے بھنا کر کہا اور رمنا کو کھانا لگانے کہنے لگی۔

"مانہ گھر میں کوئی بیمار ہے؟"

امی اور تائی کو کھانے کا بتا کر وہ لوٹی تو ٹیپو نے پوچھا۔

"نہیں تو' کیوں؟" اس نے پانی کا جگ ٹیبل پر رکھا۔

"تو یقیناً مرغ بیمار ہوگا۔" ٹیپو نے گویا مرغ پکنے کی وجہ تلاش کر ہی لی تھی۔

"پر یہ مرغ ہے کہاں؟" زوار نے شوربے میں گویا ڈبکی لگائی۔

"ٹیپو کی پلیٹ میں۔" رمنا نے نشاندہی کی۔

"نہیں......نہیں یہ میری ٹانگ ہے۔" ٹیپو نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پلیٹ کو ڈھانپا۔

"بیٹے! یہ مرغ کی ٹانگ ہے۔" زوار بڑے آرام سے اس کی پلیٹ سے ٹانگ اڑا گیا تھا۔

"یہ انصاف نہیں ہے۔ کئی مہینوں بعد تو میری باری آئی تھی ٹانگ کھانے کی۔" ٹیپو نے دہائی دی۔

"بچے ابھی تمہاری عمر ٹانگ کھانے کی نہیں ہے۔" زوار نے اطمینان سے کھانے کا آغاز کیا۔

"آپ کی ہے۔" وہ جل گیا۔

"آف کورس ینگ بوائے۔"

"مانہ! یہ مرغ ایک ٹانگ کا تھا۔" ٹیپو نے ڈونگے میں جھانکا۔

"وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ چپ کر کے کھانا کھاؤ۔ ابو کیلئے سالن رکھ کے آئی ہوں۔ تم لوگ تو سب چٹ کر جاتے۔" مانہ نے اسے بری طرح لتاڑا۔ وہ برے برے منہ بنا کر کھانا کھانے لگا۔

زوار کھانا کھانے کے فوراً بعد اٹھ گیا۔

"امی! گاڑی کی چابی کہاں ہے۔ ککی کو سکول سے لے آؤں۔"

"آپ کو تو جلدی جانا ہوگا۔" ٹیپو نے پوچھا۔

"ہاں چھٹی ہونے والی ہے۔" زوار نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"تو پھر پیدل چلے جائیں۔" اس نے آرام سے مشورہ دیا۔ سب اسے ڈانٹنے کی کوشش میں بے ساختہ مسکرائے تھے۔

* * *

گھر کے حالات بگڑے تو پھر بگڑتے ہی چلے گئے تھے۔ ابصار احمد صدیقی ریٹائر ہوئے تو انہوں نے ساری رقم ملا کر کاروبار شروع کیا' مگر تجربہ اور کاروباری سمجھ بوجھ نہ ہونے کی بناء پر کاروبار چل نہ سکا۔ رقم الگ ڈوب گئی۔ آج تک وہ اپنے ڈوبتے ہوئے کاروبار کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھے' مگر اس کیلئے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ گھر والوں نے یہ دیکھ کر گھر کے اخراجات میں کمی شروع کر دی۔ ککی آپا نے سکول میں جاب شروع کر دی تھی۔ سانہ نے

یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔ زوار کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر ہر بار قسمت ساتھ چھوڑ جاتی۔

دونوں خواتین اس وقت سر جوڑے گھریلو بجٹ میں مزید بچت پر غور کر رہی تھیں۔ اگرچہ مزید کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی کہ فون کو تالا لگ گیا تھا۔ تحفے تحائف دینے پر پابندی عائد تھی۔ دسترخوان سکڑتے سکڑتے ایک ڈش تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس میں بھی اگر سمانہ کے کھیت کی سبزی ہو تو زیادہ بہتر ہوتا تھا۔ ٹیپو اور زوار کا جیب خرچ سوائے اشد ضرورت کے بند تھا۔ اگرچہ زوار کے خیال میں ابھی اتنی بری حالت تھی نہیں، جتنی خواتین نے ملی بھگت سے بنا دی تھی، مگر خواتین کا خیال تھا کہ ابھی سے بچت کریں گی تو آڑے وقت میں کام آئے گا۔ کون جانے زوار کو کب جاب ملے اور کاروبار دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے یا نہیں۔

''پھر کیا سوچا تم نے فصیحہ۔'' سمانہ سارے کام سمیٹ کر سبزیوں کی کاشت پر لکھی گئی کتاب ہاتھ میں لئے آئی تو تائی اماں، امی سے پوچھ رہی تھیں۔

''میں کیا سوچوں۔ لکی نہیں مانتی۔'' امی نے سرد سی آہ بھری۔ ٹاپک خاصا سنجیدہ تھا۔ سمانہ وہاں رکنے کے بجائے سیدھی لان میں نکل گئیں۔

''اس کو سمجھاؤ۔ پانچ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا اور پھر سلمان کی کوئی خیر خبر بھی نہیں ملی۔ اتنے فون اور خطوں کے جواب میں ایک جملہ نہیں لکھا اس لڑکے نے۔ کیا پتا وہاں کیا کرتا ہے اور پھر نہیں معلوم ماں کے کیے گئے فیصلے سے متفق بھی ہے یا نہیں اور پھر اب تو فیصلہ کرنے والی بھی نہ رہی۔ اب ایک ایسی بات جس کا کوئی سرا بھی ہاتھ میں نہیں۔ کب تک لڑکی بٹھائے رکھیں گے۔ نہ معلوم وہ لوٹے یا نہ لوٹے۔''

''نہیں سمجھتی۔ بس ایک ہی منطق کہ یہ رشتہ آپ نے اور پھوپھو نے مل کر طے کیا تھا۔ اب وہ سلمان کا انتظار کرے گی۔ جب تک وہ آ نہیں جاتا یا اس کی کوئی خبر نہیں ملتی۔'' وہ خود پریشان تھیں۔

''سمجھ میں نہیں آتا کس بھروسے پر وہ انتظار کر رہی ہے۔ دو چار سال وہ مزید نہ آیا تو عمر نکل جائے گی لکی کی۔'' تائی اماں کے لہجے میں پریشانی در آئی۔

''میں کیا کروں۔ ان لڑکیوں کی پریشانی میں تو رات بھر نیند بھی نہیں آتی۔''

''خیر سمانہ کی تو تم فکر ہی مت کرو، اسے تو کہیں جانا ہی نہیں۔ بس زوار کی نوکری لگنے دو۔ رمنا تو ابھی پڑھ رہی ہے لیکن میں چاہتی ہوں اس سے پہلے لکی کی بات طے ہو جائے۔ بس کسی طرح تم لکی کو سمجھا لو۔ سائے کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دے۔ رشتہ بہت اچھا ہے۔ لڑکا کمپیوٹر انجینئر

ہے۔ اپنا گھر، گاڑی، سب سے بڑھ کر بیاہ کر اسی شہر میں رہے گی۔''

''وہ صاف کہتی ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔'' وہ مایوس کن لہجے میں بولیں۔

''پر اس طرح کب تک چلے گا فصیحہ؟'' تائی اماں نے تشویش سے کہا۔

''میں اب کیا کہوں۔''

''السلام علیکم!'' لکی سکول سے لوٹی تھی۔ پرس ایک طرف رکھ کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ امی نے اشاروں اشاروں میں تائی اماں کو منع کیا کہ وہ لکی کے سامنے کوئی بات نہ کریں۔

''زوار! ایک گلاس پانی تو دینا۔'' خواتین کے اشارے اتنے مبہم بھی نہ تھے کہ لکی سمجھ نہ پاتی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ موضوعِ گفتگو اس کی ذات تھی جو کہ ہمہ وقت رہتی تھی۔ سو وہ یکسر انداز کر کے زوار کی طرف متوجہ ہوئی جو حیرت زدہ سا دھپ سے ان کے قریب بیٹھا۔

''میں تھک گیا ہوں۔''

''تھک کیسے گئے ہو؟''

''میں نے گاڑی نہیں چلائی۔'' وہ آرام سے ٹانگیں پسار کر بولا۔

''کہہ تو یوں رہے ہو جیسے گدھا گاڑی چلائی ہو۔'' لکی نے گھورا۔

''کسی گدھا گاڑی سے کم ہے وہ رفتار تو کم از کم وہی تھی۔''

''شرم کرو تم لوگ۔ کبھی رب کی نعمت کا شکر ادا نہ کرنا۔'' تائی اماں نے بیٹے کو لتاڑا۔

''نعمت کا تو شکر ادا کرتے ہیں، جو چیز زحمت بن جائے اس کا کیا کرتے ہیں۔ خدا کی قسم تین جگہ رک کر اسے دھکا لگایا ہے۔'' وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا۔

''کسی کام کے نہیں ہو تم بھی زوار۔'' لکی جھنجھلا کر کچن کی طرف چل دی تھی۔

''آپ خواتین کے درمیان اشارے بازی کس خوشی میں ہو رہی تھی۔'' زوار اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا۔

''وہی لکی کا مسئلہ۔'' امی نے مایوسی سے کہا۔

''کسی صورت نہیں مان رہی۔ زوار تمہاری تو بہت دوستی ہے اس کے ساتھ، تم ہی مناؤ اسے۔''

''توبہ کریں۔ اس موضوع پر بات کریں تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔'' اس نے جھٹ کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ویسے مسئلہ کیا ہے۔''

''اتنا اچھا رشتہ آیا ہے۔ اب ایسے رشتے روز روز تو نہیں ملتے۔ عمر نکلی جا رہی ہے اس کی۔'' وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگی تھیں۔ آخر میں اسے کہنا ہی پڑا۔

''میں بات کروں گا اس سے۔''

تب کہیں جا کر وہ لوگ پر سکون ہوئیں۔ گویا ککی زوار کی بات مان ہی لے گی۔

* * *

''یہ ککی کہاں ہے مانہ؟''

دونوں پاؤں سمیٹ کر پلنگ پر رکھے کرسی سے ٹیک لگائے بہت انہماک سے ڈرامہ دیکھتی مانہ ذرا کی ذرا چونکی پھر ٹی وی سکرین پر نظریں جماتی آہستگی سے بولی۔

''اپنے کمرے میں ہوں گی۔''

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی۔'' زوار نے تشویش سے پوچھا۔ تب ہی رمنا اس کے کان پر جھک آئی۔ ''بہت زبردست جھڑپ ہوئی ہے ککی آپا اور امی کے درمیان۔''

''کیوں خیریت تو تھی نا۔'' وہ مکمل طور پر رمنا کی طرف مڑ گیا۔ جواب سمانہ نے دیا۔ وہی سیدھا سادا حقیقت پسند لہجہ قدرے بیزاری لئے ہوئے تھا۔

''وہی اسد کے پرپوزل کی بات۔ نہ امی ککی آپا کے جذبات سمجھتی ہیں نہ وہ۔ تصادم تو ضروری تھا پھر......''

''افوہ' ڈرامہ تو سکون سے دیکھنے دو۔'' ابو جان بری طرح ڈسٹرب ہوئے تھے اس کھسر پھسر سے۔ مانہ ایک دم چپ ہوگئی۔ زوار چپکے سے ککی کے کمرے میں آ گیا۔

اس کا کمرہ ایک اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے تھا۔ کاسنی پھولوں والی بیل نے پورے گھر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔ وہ ٹیپو اور رمنا کے کمرے میں جھانکتی تھی تو اس کے پھولوں پر خوشی' شادمانی اور کچی عمر میں دیکھے جانے والے خوابوں کی دلکشی چھا جاتی تھی۔ سمانہ کے کمرے کی کھڑکی سے لپٹی تھی تو اس کے پھولوں پر پیار کے رنگ کھلنے لگتے۔ وہ کھل کر مرجھانے اور مرجھا کر کھلنے سے اسے زندگی کا فلسفہ سمجھاتے تھے۔

اب وہی پھول سراپا انتظار بنے اداس' چپ اور بے قرار چپکے چپکے اندر جھانک رہے تھے۔

وہ کتاب سینے پر دھرے دھرے کرسی پر جھولتی آنکھیں موندے نجانے کس گیان دھیان میں مصروف تھی۔ ہوا کا جھونکا سامنے میز اور کھڑکی کی چوکھٹ پر خشک پھول پتے بکھرا گیا تھا۔

امید کا سایہ ہے' نہ رستہ ہے' نہ منزل
ہم کتنے اکیلے ہیں محبت کے سفر میں

زوار نے کتاب کھینچ لی تھی۔ ککی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مٹیالا سا غبار چھایا تھا۔

''کہاں کھوئی ہو؟''

وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ نگاہوں کی گرفت میں خشک و زرد پھول آ گئے۔ وہ ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھے گئی۔ زوار اس کے سامنے میز پر ذرا کی ذرا ٹک گیا' پھر اس کا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''کیوں مہاتما بدھ کی طرح ساکت ہوگئی ہیں محترمہ۔''

''یوں ہی کچھ سوچ رہی تھی۔'' اس نے مٹھی بھر کے خشک پھول کھڑکی سے باہر پھینک دیئے اور ہاتھ سے میز جھاڑنے لگی۔

''کاش اس بے معنی سے انتظار کو بھی اپنے دل سے یوں ہی جھاڑ سکو تم۔''

اس کا ہاتھ تھم گیا۔ اس نے سلگتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''بے معنی...... اب تم بھی یہ کہو گے زوار؟'' اس کے لہجے میں دکھ کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

''تو کیا کروں۔ جس رشتے کا کوئی نام نہ ہو اسے......''

''نام تو ہے۔'' ککی نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''یہ نام دیا نا پھوپھو نے اس رشتے کو۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جس میں سلمان کے نام کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ زوار نے ایک نظر انگوٹھی پر ڈالی اور کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بولا۔

''اب تو وہ زندہ نہیں رہیں جن کی وجہ سے رشتہ قائم ہوا تھا۔''

''جس کے ساتھ قائم ہوا تھا' وہ تو زندہ ہے نا۔'' اس نے برجستہ کہا۔

''ککی تم......'' اس نے جھنجھلا کر کتاب میز پر پٹخی اور کھڑا ہو گیا۔ کتاب میں سے پھسل کر دو نیلے لفافے نیچے جا گرے۔ وہ جھکا مگر ککی نے اس سے پہلے ہی اٹھا لئے تھے۔ زوار نے سیدھے ہوتے ہوئے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے اور لب بھینچ کر اس کی طرف دیکھا۔

''ان دو خطوں کے سہارے کتنی مسافت طے کر پاؤ گی تم۔''

وہ خاموشی سے خطوں کو گھورتی رہی۔ زوار بری طرح جھنجھلا گیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا ککی! کیسا یقین ہے یہ تمہارا جو تمہیں تھکنے نہیں دیتا۔ تم سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ وہ شخص ان دس سالوں میں محض دو لفافے تمہارے ہاتھ میں تھما کر بری الذمہ ہو گیا اور تم آنکھیں بند کر کے اس کے بتائے رستے پر چلتی جا رہی ہو۔ کبھی سوچا تم نے' کیا انجام ہوگا تمہاری اس عجیب و انہونی محبت کا اور تمہارا۔''

ککی نے دونوں لفافے کسی مقدس صحیفے کے اوراق کی طرح سنبھال کر کتاب میں رکھے' پھر اس کی طرف پلٹی تو اس کی آنکھوں میں الوہی محبت کے چراغ جل رہے تھے۔

''میں تو اتنا جانتی ہوں کہ محبت ابتداء سے سفر میں ہے اور انتہا تک سفر میں رہتی ہے۔''

نہ ہمسفر بھولتا ہے' نہ نشان منزل۔
ہر آنکھ اس کی آنکھ بن جاتی ہے۔
ہر آواز اس کی آواز لگتی ہے۔
ہر صورت میں اس کی شبیہ اتر آتی ہے۔
محبت وہ عذاب ہے جس سے کبھی نجات نہیں ملتی۔
جو کبھی تھا۔ اب بھی ہے۔ ہمیشہ رہے گا۔
یہی زندگی کا عروج ہے اور یہی زوال۔

زوار ششدر سا کھڑا اس کی مدھم آواز سنتا رہا۔

"لکی! اسے دیکھے اور جانے بنا ہی۔"

"ہاں' اسے دیکھے اور جانے بنا ہی۔" وہ دھیمے سے ہنسی۔

وہ اس کے لہجے کی شدت سے خوفزدہ ہوا تھا' تب ہی قصداً ہنس کر اس نے ماحول کے بوجھل پن کم کرنے کی کوشش کی اور کان کھجاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"یہ محبت کی کون سی قسم ہے یار؟"

"مجھے نہیں پتا۔" وہ رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

"ہم تو بس یہ چاہتے ہیں لکی! کہ تم خوش رہو اور زندگی کے کسی لمحے میں تمہیں اپنے جذبوں کے رائیگاں جانے کا افسوس نہ ہو۔ وقت تمہارے ہاتھوں میں دکھ کی کوئی لکیر نہ کھینچ دے۔ تمہاری آنکھ میں آنسو ہوں یہ ہم میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کر پائے گا۔" اس کے پرخلوص لہجے پر لکی پلٹی۔

"تو پھر یہ سب کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ کیا سمجھتے ہو کہ تم لوگوں کا یہ عمل میری آنکھ میں آنسو کی جگہ خوشی بھر دے گا۔"

"ہم سب تمہارا بھلا چاہتے ہیں لکی! تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"خوش۔" وہ مضطرب سی ہنس ہنس دی۔ "میرے لئے خوشی بس سلمان ہے زوار!" اس کے قطعی لہجے پر زوار ٹھٹک گیا۔

"اتنا آگے مت جاؤ لکی! کہ واپس ہی نہ پلٹ سکو۔" وہ ڈر گیا تھا۔

"زوار......! بہت بدقسمت ہے وہ شخص جس کا انتظار کرنے والا کوئی نہ ہو۔ میں یہ بدقسمتی سلمان کے حصے میں نہیں آنے دوں گی۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ وہ آجائے گا۔"

زوار کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا جبکہ وہ ہوا کے سینے پر خیال کی روشنائی سے ایک اور

سندیسہ لکھ رہی تھی۔

"شام ہو جائے تو مسافر گھر لوٹ آتے ہیں' سلمان احمد صدیقی۔ اس سے پہلے کہ ان راستوں کو رات نگل جائے اور ان راستوں پر دیوں کی طرح روشن یہ [illegible] بجھ جائیں' تم بھی لوٹ آؤ۔"

* * *

"اگر تم واقعی نہ آئے سلمان احمد صدیقی تو۔"

اک خدشہ سا اس کے اندر جاگ کر اس کے دھڑکتے دل کو سہا گیا۔

"میں نے جو اپنی عمر کے اتنے سال تمہارے انتظار کی راہ میں رل دیئے۔ اگر وہ رائیگاں چلے گئے تو......تو کیا ہوگا؟ رائیگانی کا یہ احساس تو مجھے مار ڈالے گا سلمان۔ اور یہ سب لوگ...... یہ سب میرے اپنے ہیں۔ میرے لئے پریشان ہوتے ہیں۔ میں کب تک ان کی محبتوں سے منہ موڑے تمہاری راہ تکتی رہوں گی۔ میں ان محبتوں کے سامنے ہار گئی تو تم کیا کرو گے سلمان۔"

"لکی آپا!" رمنا نے پکارا تو اس کا ڈولتا وجود ساکت ہوا۔

"ہوں۔" آنکھیں ہنوز بند تھیں۔

"آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔"

"ابو۔" اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

"خیریت تو ہے نا۔"

"پتا نہیں۔ میں ادھر آرہی تھی تو جاجی نے بتایا تھا۔" وہ اچک کر جھولے پر بیٹھی۔

لکی سوچوں میں الجھتی اندر آگئی۔

"جاجی! ابو کہاں ہیں؟" اس نے کچن سے نکلتے جاجی سے پوچھا۔

"صاحب اپنے کمرے میں ہیں بلکہ باقی لوگ بھی ادھر ہی ہیں۔"

"باقی لوگ بھی۔" کسی انہونی کے خیال سے اس کا دل ذرا سا سہم گیا تھا۔ وہ قدم قدم چلتی ابو کے کمرے میں آگئی۔ امی اور تائی اماں متفکر سی بیٹھی تھیں۔ زوار اسے دیکھتے ہی نجانے کیوں ابو کی الماری کھنگالنے لگا تھا۔

"آؤ بیٹا! تحریم بیٹھو۔" ابو نے خوشدلی سے کہا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا ابو۔"

"ہاں۔" وہ کسی سوچ میں ڈوبے پھر پوچھنے لگے۔

"سکول کیسا چل رہا تھا تمہارا۔"

"ٹھیک چل رہا ہے۔" اس نے دھیان سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"ہونہہ۔" وہ پھر کسی سوچ میں الجھے۔ ککی کو اس خاموشی سے وحشت سی ہونے لگی۔

"آپ کی امی نے رائے مانگی تھی تم سے۔ ککی بیٹا! تم نے جواب ہی نہیں دیا۔"

"کس بات کا؟" اس کی نظریں امی کی طرف اٹھیں۔ وہ نظریں چرا گئیں۔

"تایا جان اسد کے پرپوزل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔" زوار نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر وضاحت کی۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ یہ سب لوگ اس کی رائے نہیں پوچھ رہے ہیں۔ اس کے گرد ایک ان دیکھا جال بن رہے ہیں۔ ایک ایسی بات جو ابو کو امی یا تائی جان کے ذریعے کرنا چاہیے تھی' وہ خود پوچھ رہے تھے۔

"ابو! میں نے تو......" وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے جواب دے دیا تھا' مگر ابو بول اٹھے۔

"دیکھو بیٹا! ہم نے پہلے ایک فیصلہ کیا تھا تم سے پوچھے بغیر۔ ہمیں تسلیم کہ وہ فیصلہ غلط تھا۔"

"غلط تھا۔" ککی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"بھئی سچ پوچھو تو اسد ہمیں پسند ہے اور وہ تمہیں خوش رکھے گا اس کا تو ہمیں یقین ہے۔ تمہاری امی کہہ رہی تھیں تم انکار کر دو گی۔ بھئی' میں نے کہا۔ تحریم میری بیٹی ہے۔ وہ ہمارے فیصلے سے انکار کر ہی نہیں سکتی' اس لئے ہم نے سوچا ہے کہ کل اسد کے گھر والوں کو ہاں کہہ دیں۔ کیا خیال ہے تمہارا تحریم! ہم نے ٹھیک کیا نا؟"

ککی کی شکوہ کناں نگاہیں ماں کے چہرے سے ہو کر زوار کے چہرے پر جم گئیں۔

"بڑا ہی عجیب جال بنتے ہو تم لوگ۔ پر کاٹ کر طاقت پرواز دیتے ہیں۔ پاؤں زنجیر کرنے ہو' راستے کھول دیتے ہو۔ منزل دکھا کر راستے مسدود کرتے ہو۔ کیسے ظالم ہو تم لوگ۔"

"تو پھر تحریم بیٹی! کل ہم ان کو ہاں کہہ دیتے ہیں۔"

وہ یوں پوچھ رہے تھے جیسے کسی اور کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ وہ زبردستی اس پر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کرتے تو شاید وہ ضد میں آ جاتی۔ پر ان کے لہجے میں تو پیار تھا' مان اور اعتبار تھا اور والدین جب اولاد کے پیروں میں اپنے اعتماد کی بھاری زنجیر ڈالتے ہیں تو پھر وہ ہل نہیں سکتے۔

اس نے بھی چپ چاپ وہ ادھورا خواب ان کے پاس رہن رکھوا دیا تھا اور اس کے بدلے اس کو کیا ملا تھا؟

وہ قدم قدم چلتی باہر آ گئی۔ جھولا خشک پتوں سے بھر گیا تھا۔ وہ اس پر دراز چمکتے نیلے آسمان

کو دیکھنے لگی۔ آج بھی آلوچے کی خشک برہنہ شاخ آسمان کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ آسمان تقسیم نہیں ہوتا' نظر تقسیم ہو جاتی ہے۔ محبت بھی تقسیم ہوتی' بس یوں ہی کبھی خشک ٹہنی درمیان میں آ جاتی ہے۔ کئی خشک پتے اس کے چہرے سے ٹکرائے۔

"سلمان احمد صدیقی! اس شخص سے بڑھ کر کوئی بدنصیب نہیں جس کا کوئی انتظار کرنے والا نہ ہو۔ میں یہ بدنصیبی تمہارے حصے میں لکھنا نہیں چاہتی تھی پر تم نے بہت دیر کر دی۔ یہ سوچے بغیر کہ جب شام اپنے رنگ دھرتی پر بکھیرتی تھی جب درختوں کے سائے لمبے ہوتے تھے تو کوئی تھا جو تمہارے رستوں پر دیے جلایا کرتا تھا کہ اندھیرا گہرا ہو جائے تو رستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ پر وہ سارے دیئے ایک ایک کر کے بجھ گئے۔ اب تم کیسے لوٹو گے؟

اور لوٹو بھی تو کیا......؟

* * *

"صبح سے فون ملا رہی ہوں اسد کے گھر کا۔ لگتا ہے کوئی گھر میں ہی نہیں ہے۔" امی بڑبڑاتی ہوئی آئیں اور تائی اماں کے پاس بیٹھ گئیں۔

"شام کو کر لینا۔"

تب ہی جاجی سر پر ٹوکرا رکھے برآمد ہوا۔

"جاجی اس میں کیا ہے؟" امرود کے درخت پر ٹنگی رمنا نے پوچھا۔ وہ بچے کچے امرود اتار رہی تھی۔

"مالٹے منگوائے تھے صاحب نے۔"

"لو اتنے ڈھیر سارے منگوانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں جتنی بچت کرتی ہوں' یہ اتنی ہی فضول خرچی کرتے ہیں۔"

"بیگم صاحبہ رکھ دوں۔"

"ظاہر ہے رکھنے ہی ہیں' باہر تو اب پھنکوانے سے رہی۔" امی کو اس فضول خرچی پر غصہ ہی آ گیا۔ فون کی بیل سن کر بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ جاجی نے ٹوکرا گھاس پر رکھ دیا۔

"یہ ثمانہ کہاں ہے؟" تائی اماں نے پوچھا۔

"مٹر کے پودے سے لٹکی ہوگی یا گوبھی کے پھول پر استراحت فرما رہی ہوگی یا ہو سکتا ہے گاجر سمیت زمین میں دھنس گئی ہو۔" رمنا نے امرود دانتوں سے کترتے ہوئے کہا۔

"ثمانہ! او ثمانہ!" تائی اماں نے پکارا۔ وہ سچ مچ وہیں سے برآمد ہوئی تھی۔

"جی تائی جان۔"

’’بیٹی! ذرا یہ مالٹے تو گن لو۔‘‘

’’پورے ہی ہوں گے تائی جان۔‘‘

’’ارے پورے نہیں ہوں گے۔ ہر دفعہ وہ باغ والا دس بیس کم ہی ڈالتا ہے۔‘‘

’’تو پھر دس بیس کم ہوں گے۔‘‘

’’تم مت گننا۔‘‘ انہیں غصہ آ گیا۔

’’جاجی! او جاجی!‘‘ سمانہ نے وہیں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔

’’جی۔‘‘

’’یہ مالٹے گنو۔‘‘ حکم صادر ہوا۔ جاجی پھسکڑا مار کر گھاس پر بیٹھا پھر قدرے پریشانی سے بولا۔

’’پر مجھے تو بیس سے آگے گنتی ہی نہیں آتی۔‘‘

’’کوئی بات نہیں بیس بیس کر کے گن لو۔‘‘ سمانہ نے کہا۔ تائی اماں اسے گھورتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ سمانہ نے کرسی پر دھرا ناول اٹھایا۔

’’ایک امرود تو دینا رمنا۔‘‘ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’کیچ کرو۔‘‘

سمانہ نے کیچ کرنا تو چاہا پر وہ اس کے سر سے تین فٹ کے فاصلے سے ہوتا ہوا کچن کی کھڑکی سے گزر کر نجانے کس برتن سے ٹکرایا تھا۔

’’تمہارا نشانہ بہت کمال کا ہے۔‘‘ سمانہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔

’’پھر تو مجھے پاکستانی کرکٹ ٹیم میں شامل ہو جانا چاہیے۔‘‘ وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔ جواباً سمانہ سر جھٹک کر ناول کی طرف متوجہ ہوئی۔

’’یہ جی ہو گئے آٹھ دفعہ بیس۔‘‘ بہت دیر میں جاجی نے سر اٹھایا۔

’’رمنا! او رمنا! کیا درخت پر ہی سو گئیں۔‘‘ بہت جھنجلا کر پوچھا گیا تھا۔

’’نہیں، جاگ رہی ہوں۔‘‘

’’یہ آٹھ دفعہ بیس کتنے ہوتے ہیں؟‘‘

’’آٹھ کا پہاڑہ پڑھ لو نا یار۔‘‘

’’ہاں۔ پر رمنا آٹھ کا پہاڑہ تو بس دس تک ہوتا ہے۔ میں نے تو بیس تک یاد نہیں کیا۔‘‘ وہ قدرے پریشان ہوئی۔ ’’تم نے کیا تھا؟‘‘

’’نہیں۔ تو ایسا کر دونا، بیس کا پہاڑہ پڑھ لو آٹھ تک۔‘‘ رمنا نے مشکل آسان کی۔

’’مگر رمنا! پہاڑے تو بس سولہ تک ہوتے ہیں۔‘‘ سمانہ کچھ اور پریشان ہوئی۔

’’افوہ! تو بیس کو آٹھ سے ضرب دے لو۔‘‘

’’تو اس کیلئے بھی تو آٹھ کا پہاڑہ پڑھنا پڑھے گا اور وہ میں بھول چکی ہوں۔‘‘ وہ جھنجلا کر بولی پھر جاجی کی طرف پلٹی۔ ’’اٹھاؤ ٹوکرا اور اندر رکھ آؤ۔ تائی اماں سے کہنا پورے ہی ہیں۔‘‘

اس نے مسئلہ حل کیا۔ جاجی ٹوکرا اٹھا کر چلا گیا۔ تب ہی لکڑی کا بڑا سا گیٹ نما دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ سمانہ نے کچھ لمحے جاجی کا انتظار کیا، پھر رمنا سے بولی۔

’’رمنا! دیکھو ذرا کون آیا ہے۔‘‘

’’میں اترنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔‘‘ اس نے صاف انکار کیا۔ سمانہ اسے گھورتی ہوئی اٹھی۔

’’تمہیں دیکھ کر تو اس بات پر یقین آ جاتا ہے کہ.....‘‘ اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ ’’انسان پہلے بندر تھا۔‘‘

’’جی کیا کہا آپ نے۔‘‘ آنے والا بھونچکا رہ گیا۔

’’افوہ! میں نے کچھ نہیں کہا۔ آپ نے جو بھی کہنا ہے کہیے۔‘‘

’’جی یہ ابصار احمد صدیقی کا گھر ہے؟‘‘ وہ سنبھل کر بولا۔

’’آپ کچھ پڑھے لکھے ہیں۔‘‘ اس نے سرتاپا نو وارد کا جائزہ لیا۔ بلیک پینٹ، ہنی کلر کی شرٹ میں ملبوس، ایک ہاتھ میں سفری بیگ تھامے وہ خاصا اسمارٹ اور ڈیشنگ پرسنیلٹی کا مالک تھا۔

’’نظر ٹھیک ہے آپ کی؟‘‘ سمانہ نے اس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں کو سرسری انداز میں دیکھا۔

’’کیا مطلب ہے آپ نے......‘‘ اب کے اس نے کڑے تیوروں سے سمانہ کو گھورا تھا۔

’’یہ ساتھ لگی نیم پلیٹ پر کیا لکھا نظر آ رہا ہے آپ کو۔‘‘ اجنبی کچھ مانوس سا لگ رہا تھا۔

’’افوہ۔‘‘ اس نے جھنجلا کر سمانہ کو دیکھا۔ ’’میں یہ پوچھ رہا ہوں۔ ابصار صاحب گھر پر ہیں۔‘‘

’’تو یوں پوچھیں نا۔ وہ گھر پر نہیں ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ بائے دا وے آپ ہر اجنبی سے یوں ہی بے تکلف ہوتی ہیں۔‘‘ اس نے سرتاپا سمانہ کو دیکھا تھا۔ سمانہ تو سلگ ہی اٹھی۔

’’کیا مطلب ہے آپ کا۔ کون سی بے تکلفی دکھائی ہے میں نے آپ کو؟‘‘

''میں تو یہ کہہ رہا تھا......''

''آپ جو بھی کہہ رہے تھے۔ ابو اس وقت گھر میں نہیں ہیں' آپ بعد میں آ ئیے گا۔ ویسے بھی وہ ہرا یرے غیرے سے ملنا پسند نہیں کرتے۔'' اس نے ترخ کر کہا تھا۔

''ایرا غیرا' دیکھیں محترمہ میں......''

''میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔'' محترمہ نے بگڑ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ اس نے ہاتھ رکھ کر روکا تھا۔

''آپ میری بات تو سنیں۔'' وہ کچھ جھنجھلا کر اور کچھ بگڑ کر بولا تھا۔ ''اب میں یہاں سڑک پر کھڑا ہو کر......''

''سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کریں یا کہیں اور میری بلا سے۔'' وہ دھاڑ سے دروازہ بند کر کے پلٹی ہی تھی کہ دروازہ اسی رفتار سے کھلا تھا اور دوسرے لمحے وہ اندر تھا۔ سمانہ بھونچکی رہ گئی۔

''ارے بات سنیں۔ اندر کہاں جا رہے ہیں۔ ارے رکو تو۔ جاجی...... جاجی۔''

رمنا نے بڑی حیرت سے یہ منظر ملاحظہ کیا۔ آگے آگے ایک اجنبی نوجوان بیگ پکڑے ہوئے تھا اور اس کے پیچھے سمانہ بی بی چلاتی ہوئی آ رہی تھیں۔

''ڈ...... ڈاکو۔'' رمنا نیچے لڑھک جانے کو تیار تھی۔ پر فی الفور بے ہوش ہو جانے کا ارادہ ملتوی کیا۔ ہاتھ میں پکڑا امرود تولا اور تاک کر اجنبی ڈاکو کے سر کا نشانہ لیا۔ نشانہ تو سر کا لیا تھا ... کے ٹخنے پر لگا۔

''اف......'' اجنبی کے ہاتھ سے بیگ چھوٹا اور دوسرے لمحے وہ ٹخنا ہاتھ میں پکڑے ایک ٹانگ پر بریک ڈانس کرنے لگا تھا اور اس ایک ٹانگ کے ڈانس کی زد میں آنے سے بچنے کو سمانہ کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف ہو رہی تھی۔ رمنا نے تیزی سے شاخ پر کوئی بچا کھچا امرود ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ تب ہی اس نے ٹخنا چھوڑ کر شعلہ بار نگاہوں سے رمنا کو گھورا۔

''نیچے اترو' بندریا نہ ہو تو۔''

''تم نے مجھے بندریا کہا۔'' رمنا چیخی جبکہ نیچے اترنے کا رسک بہر حال اس نے نہیں لیا تھا۔

''ہاں کہا ہے۔'' وہ تیورا کر درخت تک آیا۔ دوسرے لمحے بندریا لڑھک کر درخت سے نیچے اتری۔ شاید مارے ڈر کے لڑھک گئی تھی۔

''اگر میری آنکھ پھوٹ جاتی تو۔'' وہ غصے میں دھاڑا۔

''آپ کی آنکھ ٹخنے پر لگی ہے؟'' بہت ڈرتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔

''اس گھر میں کوئی معقول انسان بھی رہتا ہے۔'' اس نے غضبناک انداز میں دونوں کو دیکھا تھا۔

''ہاں جی میں رہتا ہوں۔'' جاجی ابھی ابھی نکلا تھا۔ گردن اکڑا کر بولا۔

''اس نے معقول انسان کہا ہے۔'' سمانہ نے اسے گھورا۔

''پر جی یہ ہیں کون؟'' جاجی نے پوچھا۔

''افوہ! آپ ہیں کون؟'' سمانہ جھنجھلا کر اس کی طرف پلٹی۔

''میں...... میں سلمان احمد صدیقی ہوں۔''

''جی......'' جو جہاں تھا' وہیں ساکت ہو گیا۔

''کیا ہوا آپ لوگوں کو؟'' اس نے حیرت سے سب کو دیکھا۔

''آ...... آپ واقعی سلمان ہیں۔'' رمنا نے انگلی اٹھا کر تعجب سے پوچھا۔

''ہاں!''

دوسرے لمحے وہ سرپٹ اندر کی طرف بھاگی۔ سلمان نے پلٹ کر سمانہ کو دیکھا' وہ یوں ہی ساکت کھڑی تھی۔

''اے مس۔'' سلمان نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ تب اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔

''تو آپ واپس آ ہی گئے۔'' وہ ایک طویل سانس کھینچ کر بولی۔ سلمان اس کے عجیب سے لہجے سے خائف ہو کر جواب دینے کے بجائے ادھر ادھر جھانکنے لگا۔

''اکیلے ہی آئے ہیں؟'' اب کے وہ ذرا مسکرائی تھی۔

''کیا کسی اور کو بھی آنا تھا۔'' اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی' پھر اس کے پاس آ کر بڑے شاہانہ انداز میں بولی۔

''مسافر! تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو۔ ہاں یہ اطلاع ضرور دی جاتی ہے کہ بہت وقت پر آئے ہو۔''

''اچھا۔'' سلمان نے اپنے سامنے کھڑی سنہری رنگت والی لڑکی کو دلچسپی سے دیکھا۔ اس کی ڈارک براؤن آنکھیں مسکرائی تھیں۔

''ویسے ہم سب آپ سے سخت خفا تھے۔ پورے پانچ سال گزر گئے آپ کے آخری خط کو آئے ہوئے۔ ہمارے کسی خط اور فون تک کا جواب نہیں دیا تھا۔'' وہ مسکراتی آنکھیں خفا ہو کر کچھ اور حسین ہو گئی تھیں۔

''شکریہ۔'' وہ مسکرایا۔

"کس بات کا۔" وہ حیران ہوئی۔

"اس اطلاع کا کہ میرا آپ کا رابطہ ٹوٹے پانچ برس گزر گئے ہیں۔"

"آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔"

"شاید نہیں' یقیناً۔" وہ کھل کر ہنسا تھا۔ "کیا یہیں کھڑا رکھیں گی مس......"

"سمانہ...... آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

"آپ نے کب پہچانا تھا ہمیں۔"

تب ہی دونوں خواتین افتاں وخیزاں لپک کر آئیں۔

"سلمان بیٹا۔" اور دوسرے لمحے وہ دونوں اس کے ساتھ لگیں زاروقطار رو رہی تھیں۔

"یا خدا!" اس نے گھبرا کر سمانہ کو دیکھا۔ وہ لپک کر آگے آئی اور سمجھا بجھا کر الگ کیا اور سلمان کی تھکن کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا جیسے وہ امریکہ سے یہاں تک پیدل آیا ہو۔ جاجی نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیا اور وہ ان سب کے جلو میں ڈرائنگ روم تک پہنچا۔ جاجی کو دوڑایا گیا کہ ابصار صاحب جہاں کہیں بھی ہیں انہیں ڈھونڈ کر لاؤ۔

"بیگم صاحبہ! مسجد میں اعلان کروا دوں۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں کروا دو۔" بیگم صاحبہ سلمان سے امریکہ کا حال سننے کو بے تاب تھیں۔

سمانہ نے لمبی چوڑی لسٹ تھما دی سودا سلف کی۔ خود وہ دونوں بہنیں کچن میں گھس گئیں۔

کِکی جب اسکول سے لوٹی۔ وہ سب کے ساتھ کھانے کی ٹیبل پر موجود تھا۔

"کِکی آپا! پہچانیں ذرا کون آیا ہے۔" رمنا چہک کر بولی۔ کِکی نے سب کے چہروں پر کھلتے خوشی کے رنگوں کو دیکھا' پھر اجنبی مہمان کو' پھر کندھے اچکا کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ارے ہمارا تو خیال تھا آپ انہیں بنا دیکھے ہی پہچان لیں گی۔ یہ سلمان بھائی ہیں۔"

کِکی کا دل ڈوب کر ابھرا۔

"اور سلمان بھائی! یہ تحریم ہیں کِکی آپا۔" سب کی نگاہیں ان دونوں پر جمی تھیں۔ کِکی کے چہرے پر حیرت منجمد تھی جبکہ سلمان کے چہرے پر اپنائیت کے وہی تاثرات تھے جو سب سے ملتے وقت تھے۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ تحریم؟" سلمان نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"آپ...... تحریم......"

کِکی کا دل کسی بھنور کی زد میں آیا۔

(میں تمہیں کِکی کہوں گا کہ تحریم سے دوری کا احساس ہوتا ہے)

"ٹھیک ہوں۔" اس نے خود کو سنبھالا اور کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ سب سلمان کو مختلف ڈشیں پیش کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں دھرے اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے یوں ہی ایک نظر اس پر ڈال کر پھر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔

* * *

"صبح بخیر۔"

ناشتہ بناتی سمانہ چونکی۔ آسمانی رنگ کے شلوار کرتے میں ملبوس اس کا دراز قد خاصا نمایاں ہو رہا تھا۔

"ارے آپ امریکہ میں بھی یہ لباس پہنا کرتے تھے۔"

"ترس گئے تھے محترمہ! کراچی اترتے ہی پہلا کام یہی کیا تھا کہ اپنے لئے کچھ شلوار کرتے خریدے تھے۔"

"بہت اچھا کیا تھا۔ کافی جچ رہا ہے۔" اس نے سادہ سے لہجے میں تعریف کی۔

"تھینک یو۔" سلمان چلتا ہوا آیا اور لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"سب لوگ ابھی جاگے نہیں کیا؟"

"دو بجے تک تو آپ کی واپسی کی وجوہات کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی رہی تھیں۔ ذرا کھڑکی تو کھول دیں۔" سمانہ نے ابلے انڈے نکالتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔ سلمان نے پلٹ کر کھڑکی کھولی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے کچن کی فضا بدل دی تھی۔ سلمان ہاتھ سینے پر باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ بہار کی اولین صبح کی طرح نکھری نکھری سی لڑکی تھی۔ گلابی پھول دار کرتے دوپٹے میں ملبوس' کندھوں تک ترشے ڈارک براؤن بالوں کو بنانا کلپ میں قید کئے مصروف' مصروف سی کتنی اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔

"ناشتے میں کیا لیں گے؟" فریج سے آٹا نکالتے نکالتے وہ چونکی۔ "ارے کہیں آپ بیڈ ٹی تو نہیں لیتے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ دراصل ہمارے ہاں چائے بہت کم لوگ پیتے ہیں۔"

"بیڈ ٹی لیتا تو تھا لیکن اب میرا خیال ہے ناشتا تو تیار ہی ہے۔"

"آپ کیلئے بہت اسپیشل ناشتا تیار ہو رہا ہے۔" ایک چولہے پر توا چڑھائے وہ پراٹھے کیلئے پیڑا بنا رہی تھی۔ دوسری پر قیمہ چڑھایا تھا اور قیمہ بھننے کی خوشبو پورے کچن میں پھیلی تھی۔

"اچھا جی اور اس اسپیشل ناشتے میں ہے کیا؟" سلمان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"گاجر کا حلوہ' انڈوں کا حلوہ' پراٹھے' بھنا ہوا چٹ پٹا قیمہ اور میٹھی لسی۔"

"یہ اتنا کچھ آپ بنائیں گی۔ میں کچھ ہیلپ کرواؤں۔"

"آپ کیا ہیلپ کروائیں گے سلمان بھائی۔ الٹا کام بڑھائیں گے۔" اس نے قیمے پر کٹا ہوا ہرا دھنیا ڈال کر چولہا بند کیا۔

"امریکہ میں رہ کر بندہ اور کچھ ہو نہ ہو' امور خانہ داری میں ماہر ضرور ہو جاتا ہے۔"

"اچھا' انڈے پھینٹنے آتے ہیں آپ کو۔"

"جی محترمہ! میں بہت اچھا آملیٹ بنا لیتا ہوں۔"

"اچھا جی تو پھر جلدی سے آملیٹ کیلئے پیاز کاٹ دیں۔" سمانہ نے جھٹ پیاز اور چھری اس کی طرف کھسکائی۔

"پیاز۔" سلمان گڑبڑایا۔

"جی ہاں' زوار بھائی کو صبح آملیٹ نہ ملے تو وہ ناشتہ نہیں کرتے۔"

"دراصل میں پیاز کے بغیر آملیٹ بناتا ہوں۔"

سلمان نے سر کھجاتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"پکڑے گئے نا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں' جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔"

"سمانہ! آپ ہنستی بہت اچھا ہیں۔" وہ بے اختیار تعریف کر گیا۔

"سلمان بھائی! سب مجھے مانہ کہتے ہیں اور یہ "آپ" کیا ہوتا ہے۔ بہت سال چھوٹی ہوں میں آپ سے۔ امی کہتی ہیں آپ زوار بھائی سے پورے دو سال بڑے ہیں اور میں ان سے تین سال چھوٹی ہوں۔"

"اف! خواتین کو چھوٹا بننے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"خواتین کس کو کہا ہے۔" سمانہ خفگی سے اس کی طرف پلٹی۔ "اور یہ حقیقت ہے بے شک امی سے پوچھ لیں۔"

"اچھا بابا خفا کیوں ہوتی ہو۔ مان لیا۔"

"ویسے سلمان بھائی! آپ سے مل کر ذرا بھی نہیں لگا کہ ہم آپ سے پہلی بار مل رہے ہیں۔"

"مجھے بھی کب لگا ہے۔ ایک پل بھی محسوس نہیں ہوا کہ میں اس گھر کا فرد نہیں ہوں۔"

"آپ ہمیشہ سے اس گھر میں موجود رہے ہیں سلمان بھائی۔"

اس کے پرخلوص لہجے پر سلمان نجانے کس سوچ میں ڈوب گیا' پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے

ہوئے کہنے لگا۔

"تم لوگ بہت اچھے ہو مانہ۔ نجانے بابا جان نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔"

"کیا؟" سمانہ چونکی تو وہ گڑبڑا گیا۔

"کچھ نہیں' یوں ہی کہہ رہا تھا۔"

"پھوپھا جان کب تک آئیں گے واپس؟" سمانہ نے پوچھا جبکہ سلمان نے کھلی کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے اس کی بات کو یوں نظرانداز کیا تھا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ تب ہی ٹیپو آ گیا۔

"خدا کی قسم! ایسی ایسی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں کچن سے کہ مجھے آنکھیں کھولنی ہی پڑیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے مہینے بھر کا بجٹ......" اس سے آگے نگاہ کی زد میں سلمان آ گیا تھا۔ تب ہی گڑبڑا کر بقیہ جملہ منہ ہی منہ میں بدبدایا۔

"آپ اٹھ گئے سلمان بھائی؟"

"ہاں' رات کو جلدی سو گیا تھا۔"

"یار مانہ! اب ناشتا دے بھی دو۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"آج ناشتا اکٹھے کریں گے۔" مانہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"ہاں تو انتظار کئے لیتے ہیں۔ آج سلمان بھائی کی بدولت ہم بھی عیش......" باقی جملہ سمانہ کی گھوری کی نذر ہو گیا۔

"میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ سلمان بھائی بہت برسوں بعد لوٹے ہیں' ان کے سنگ ناشتے کا مزا دوبالا ہو جائے گا۔"

"ہاں سلمان بھائی! کتنے برسوں بعد لوٹے ہیں آپ۔ وطن یاد نہیں آتا تھا۔" سمانہ نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

"مجھے تم لوگ بہت یاد آتے تھے۔" سلمان کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

"ٹیپو! مجھے اسکول تک چھوڑ آؤ۔ زوار تو ابھی تک سو رہا ہے۔" ککی گھڑی کا اسٹریپ بند کرتی ہوئی اندر آئی۔

"ککی آپا! آپ آج بھی اسکول جائیں گی۔"

سمانہ نے تحیر سے پوچھا۔ ککی کی سرخ آنکھیں اس کی شب بیداری کی گواہی دے رہی تھیں۔

"ہاں۔" اس نے سامنے کھڑے شخص پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔

"ناشتا تو کر لیں۔" سمانہ عالم حیرت میں تھی۔

"اسکول میں کرلوں گی؟" وہ سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر ٹیپو کی طرف متوجہ ہوئی۔
"کِکی آپا! آج آپ چھٹی کرلیتیں۔ سلمان بھائی کیا سوچیں گے۔" سمانہ نے پاس آ کر
دبی زبان میں کہا۔ کِکی کی نظریں بلا ارادہ سلمان کی طرف اٹھیں۔
"آپ کو پتا ہے سلمان بھائی! اس گھر میں آپ کی واپسی کا یقین صرف اور صرف کِکی
کو تھا۔" سمانہ نے بتایا۔ کِکی کا خیال تھا وہ اسے اپنی نظروں کے حصار میں لے کر کہے گا۔ "مجھے
معلوم ہے۔"
اس کے برعکس سلمان نے چونک کر پوچھا تھا۔
"ارے کیا واقعی؟"
"ٹیپو! جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" کِکی نے تیزی سے کہا اور بغیر ٹیپو کا انتظار کیے
باہر نکل گئی تھی۔ سمانہ نے جیسے اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی، مگر جاجی آ گیا۔
"بیگم صاحبہ کہتی ہیں۔ آج ناشتا نہیں ملے گا۔"
"ہاں۔" وہ چونکی پھر ہاتھ میں پکڑے پیڑے کی طرف متوجہ ہوگئی۔
"تم برتن نکالو جاجی ناشتا تیار ہے۔ سلمان بھائی آپ چلیں، میں ناشتا لگاتی ہوں۔"
ناشتا خاصا پرتکلف تھا۔ سلمان نے خوب ڈٹ کر کیا، پر آئندہ کیلئے منع کر دیا۔
"اتنے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یوں بھی سادہ سا ناشتا کرتا ہوں۔ ہاں اگر
سب کھلانا مقصود ہے تو روز ایک ڈش بنائی جاسکتی ہے۔"
اس کے یوں کہنے سے خواتین کو خاصی تسلی ہوئی کہ لڑکا زیادہ نخرے والا نہیں ہے۔ ورنہ ان کے
حساب سے تو گھر کا بجٹ سخت ڈسٹرب ہوجانے کا خدشہ تھا۔ ناشتے کے بعد رمنا اور سمانہ گھر کی
جھاڑ پونچھ میں مصروف ہوگئی تھیں جبکہ خواتین نے سلمان کو گھیر لیا۔ رات بھی وہ تھکن کا بہانہ
کر کے سو گیا تھا۔ خواتین کے تابڑ توڑ سوالوں نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا، پھر بھی وہ انہیں تسلی بخش
جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔
"بھائی صاحب کیوں نہیں آئے تمہارے ساتھ؟" تائی اماں نے پوچھا۔
"وہ بھی آئیں گے کچھ عرصے تک۔ ابھی کچھ مصروف تھے۔" وہ قدرے بے چین ہوا۔
"تو اب تم نے کیا سوچا ہے؟" سمانہ کی امی نے پوچھا۔
"کس بارے میں؟" وہ چونکا۔
"پاکستان سیٹل ہونا ہے یا واپس جاؤ گے۔ میری مانو تو یہیں بس جاؤ۔ بہت کمائی ہوگئی۔"
"آپ لوگ چاہیں گے تو کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔" سلمان نے خلوص دل سے کہا۔

دونوں خواتین بے ساختہ مسکرائیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے۔
"ہم کب چاہتے ہیں بیٹا کہ تم جاؤ۔"
"ایک بات تو بتاؤ سلمان۔" تائی اماں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ "تم لال حویلی گئے
تھے۔"
"لال حویلی۔" سلمان نے بے چینی سے پہلو بدلا، پھر نظریں چرا کر بولا۔ "نہیں، میں تو
سیدھا ساہیوال ہی آیا تھا۔ ملتان گیا ہی نہیں۔"
"بہت اچھا کیا۔ وہ لوگ اس قابل ہی نہیں کہ ان سے ملا جائے۔" تائی اماں نے تنفر
بھرے لہجے میں کہا۔
"مامی جی! آپ نے کبھی کوشش نہیں کی، ان سے ملنے کی؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"ہم کاہے کو کرتے کوشش ان سے ملنے کی۔" تائی اماں نے تنک کر کہا۔
"بس بیٹا! انہوں نے کوئی ایسا تعلق رکھا ہی نہیں۔ اللہ بخشے تمہاری امی جب تک زندہ رہیں،
ہم سے ملنے آتی رہیں۔ وہی لال حویلی کی خیریت بتا دیا کرتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد تو
سارے تعلق ہی ختم ہوگئے۔" سمانہ کی امی نے رسانیت سے سمجھایا۔
"سوتیلا سہی، پر تھا تو آخر بھائی۔ پر ایسا ہاتھ دکھایا احتشام احمد نے کہ توبہ توبہ۔ لاکھوں،
کروڑوں کے مالک اس چھوٹے سے گھر میں آپڑے۔ حق دار کا حق مارا تھا۔ ساری جائیداد ہتھیا
لی۔ ساری عمر ابصار اور اشفاق نے انہیں بڑا سمجھ کر عزت دی، پر اس نے ثابت کر دیا سوتیلا آخر
سوتیلا ہی ہوتا ہے۔ پر ایک بات لکھ لو کبھی نہ کبھی تو سامنے آئے گا۔ احتشام احمد کب تک دوسرے
کے حق مار کر عیش کرتا رہے گا۔"
تائی اماں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔
"بڑے ماموں اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" سلمان نے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے آہستگی
سے بتایا۔
"احتشام احمد انتقال کر گئے کب؟" وہ دونوں ہی اچھل پڑیں۔
"کچھ سال ہوئے۔"
"تمہیں کس نے بتایا؟" تائی اماں کا دھیان فوراً پلٹا۔
"ان کے بیٹے زبیر احمد صدیقی نے اپنے خط میں لکھا تھا۔" اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا دکھ ہلکو
رے لے رہا تھا۔
"تم اسے خط لکھتے رہے تھے۔" تائی اماں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''شروع میں تو رابطہ رہا تھا' بعد میں اتنی مصروفیت رہی کہ...... اور جب بابا بھی میرے پاس امریکہ آگئے تو بالکل ہی رابطہ کٹ گیا۔ ہم نے ملتان والا گھر بھی بیچ دیا تھا۔''

''کتنے بچے ہیں احتشام احمد کے اور اس کی بیوی آصفہ' بڑی نیک عورت تھی۔ اپنے شوہر کے بالکل برعکس۔''

''جی وہ وہیں حویلی میں ہوتی ہیں۔ ایک بیٹا ہے زنیر اور دو بیٹیاں۔ بیٹیوں کی تو شادی ہوگئی تھی۔ وہ دونوں جدہ میں ہوتی ہیں۔'' سلمان نے باقی تفصیل بتائی۔ تائی جان نے ٹھنڈی سانس بھر کے سمانہ کی امی کی طرف دیکھا۔

''کیسا وقت پلٹا۔ جتنا وہ سب زنیر کا ہے' اتنا ہی ان بچوں کا بھی تھا۔ آج وہ راج کر رہا ہے اور ہمارے بچے دو وقت کی روٹی کیلئے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ سب قسمت کے کھیل ہیں۔''

''یہ زوار کہاں ہے؟'' سلمان کیلئے اب مزید یہاں بیٹھنا ممکن نہ تھا۔

''ہم یہاں ہیں جناب۔'' زوار نے کمرے میں جھانکا۔ ''کہیے کیسے یاد فرمایا جا رہا ہے ہمیں۔''

''یوں ہی' میں سوچ رہا تھا شہر کی سیر کو نکلیں۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''چھوٹا سا شہر ہے' یہاں تمہارے دیکھنے کو کیا ہوگا؟''

''دیکھنے کو ہر جگہ ہوتا ہے دوست۔ بس دیکھنے والی نگاہ چاہئے۔''

''یہ بات ہے تو پھر چلو۔'' وہ دونوں آگے پیچھے نکل گئے۔

''کتنا اچھا ہوگیا کہ سلمان آگیا۔'' امی کے چہرے پر اطمینان بکھرا تھا۔

''یوں کہو کہ کتنا اچھا ہوا۔ اسد کے گھر کا فون خراب تھا۔'' تائی جان ہنس دیں۔

''یہ تو واقعی بہت اچھا ہوا۔ اگر ہم ہاں کہہ دیتے تو کتنی سبکی ہوتی۔''

''اب تم مناسب موقع دیکھ کر سلمان سے بات کرلو۔'' تائی جان نے مشورہ دیا۔

''کرتو لوں' پر میں سوچتی ہوں بھائی صاحب امریکہ سے آجائیں تو زیادہ اچھا ہے۔ ابصار کا بھی یہی خیال ہے۔'' امی نے رسان سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ پر پتا نہیں وہ کب تک آسکیں۔ مجھے تو لگتا ہے انہوں نے سلمان کو بھیجا ہی اس مقصد کیلئے ہے۔''

''اگر ایسی بات ہوئی تو وہ کوئی اشارہ تو دے گا نا۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' تائی اماں یہ کہہ کر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

* * *

سلمان لان میں آیا تو سمانہ کیاریوں کو پانی دے رہی تھی جبکہ لکی حسب معمول جھولے پر بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر سلمان کو دیکھا اور پھر سے کتاب میں محو ہوگئی۔ سلمان کو یہاں آئے کئی دن گزر گئے اس نے لکی کو یوں ہی دیکھا تھا۔ خاموش' چپ کبھی کتاب تو کبھی خود میں گم۔ ہاں البتہ اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ نجانے کیوں سلمان ان آنکھوں سے گھبرانے لگا تھا۔ متجسس' ٹٹولتی' کھوجتی سوالیہ نظریں۔

وہ سمانہ کی طرف آگیا۔ حقیقتاً اسے اپنی یہ کزن اچھی لگی تھی اور سب سے مختلف تھی۔ لاپرواہ بے نیاز سا انداز' خود اعتماد' حقیقت پسند اور متحرک۔

''تم ہر وقت مصروف رہتی ہو مانہ' اتنا کام کیسے کرلیتی ہو؟'' ایک ہاتھ آم کے درخت پر ٹکا کر اس نے پوچھا۔

''یہ کام تو ہمارے ملک کی ساری لڑکیاں کرتی ہیں۔'' سمانہ نے پائپ کیاری میں چھوڑا اور لاپروائی سے گویا ہوئی۔

''کیا یہ بھی......''

''ارے یہ کام تو نہیں ہے' یہ تو میرا شوق ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ لکی نے ذرا کی ذرا کتاب سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا۔

''اچھا شوق ہے' لگتا ہے تمہیں پھول بہت پسند ہیں۔'' اس نے کیاریوں میں گلاب اور موتیے کے پودوں کو دیکھا۔

''مجھے پھل زیادہ پسند ہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''لکی آپا کو پھول پسند ہیں۔ خاص طور پر گلاب۔ یہ سب میں نے ان کیلئے لگائے ہیں۔ آپ کو بھی گلاب اچھے لگتے ہیں؟'' وہ پائپ اٹھا کر اپنے پاؤں دھونے لگی۔

''تم نے اپنے لئے کیا لگایا ہے؟'' سلمان نے اس کا سوال یکسر نظرانداز کرکے پوچھا۔

''یہ آم' امرود' آلوچہ' جامن' لیموں اور انار۔ یہ سب میرے لئے ہی تو ہے اور وہ دیکھیں' وہ فالسے کا پیڑ ہے۔ ذرا گرمیاں آنے دیں پھر یہ لان کم' باغ زیادہ ہوجائے گا۔ اسی لئے تو مجھے گرمیاں اچھی لگتی ہیں۔''

''اور میرے لئے کیا لگاؤ گی؟'' سلمان نے اس کے متبسم چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

''لکی آپا سے پوچھیں۔'' سمانہ کی متبسم نگاہوں میں شرارت جاگی۔

''انہیں کیا معلوم میری پسند کا۔'' سلمان کی نگاہیں اب اسے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھیں اور دور بیٹھی لکی کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

"انہیں ہی تو معلوم ہے۔" سمانہ اس کی نگاہوں کے بدلتے رنگوں اور زاویوں سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھی' پھر وہ نل بند کر کے ان کی طرف پلٹی۔

"آپ ذرا آپا سے پوچھ کر دیکھیں۔ میں دیکھوں رمنا کچن میں کیا کر رہی ہے۔ چھٹی والے دن ٹیپو کو بارہ بجے ہی بھوک لگ جاتی ہے۔"

سمانہ نے چپل پاؤں میں ڈالی اور دونوں ہاتھوں سے بکھرے بال سمیٹتی اندر چلی گئی۔ سلمان کی نگاہوں نے بہت دور تک اس کا پیچھا کیا جبکہ ککی نے اس کی نظروں کا۔ سلمان نے پلٹ کر ککی کو دیکھا' پھر اسی کی طرف چلا آیا کہ ٹیپو اور زوار کسی کام سے باہر نکلے تھے۔

"یہ آپ کی بہن بہت عجیب لڑکی ہے۔" وہ جھولے کی بیک پر دونوں ہاتھ ٹکا کر بولا۔ ککی نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔

"کچھ اتنی عجیب بھی نہیں' شاید آپ کو لگتی ہو۔"

"ہاں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ "کیا پڑھتی رہتی ہیں آپ؟"

"میں اب اے حمید کے ناول نہیں پڑھتی۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا' پھر وہ عجیب سی ہو کر کتاب کا صفحہ پلٹنے لگی۔

"کیا پہلے پڑھا کرتی تھیں؟"

ککی نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

(ککی تم حیران تو ہو گی۔ پر یہ بتاؤ' کیا تم اب بھی جھولے پر بیٹھ کر اے حمید کے ناول پڑھتی ہو۔)

(حیران میں تب نہیں ہوئی تھی سلمان احمد صدیقی کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا میں جھولے پر بیٹھ کر اے حمید کو پڑھا کرتی تھی۔ حیران تو میں اب ہوں کہ تمہیں یہ یاد کیوں نہیں رہا۔)

سلمان اپنے چہرے پر جمی خاموشی اور حیران آنکھوں سے خائف سا ہو کر سیدھا ہو گیا۔

"میں دیکھتا ہوں۔ شاید زوار آ گیا ہو۔"

ککی کی سلگتی نگاہوں نے اس کے جاتے قدموں کو دیکھا۔

"سلمان احمد کیا تم سچ مچ لوٹ آئے ہو اور اگر لوٹ آئے ہو تو ککی کو کہاں بھول آئے ہو۔"

* * *

"آخر یہ اندر ہو کیا رہا ہے۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں انہیں باتیں کرتے۔" رمنا بری طرح جھنجلائی۔

"پتا نہیں' بس باتیں کرتے جا رہے ہیں۔" جاجی نے کندھے اچکائے۔ وہ ابھی ابھی چائے دے کر آیا تھا۔

"کب ختم ہوں گی ان کی باتیں۔" ٹیپو نے منہ بنایا۔ پچھلے دو گھنٹے سے زوار' سلمان اور ابصار احمد کمرے میں گھسے نجانے کون سے معاملات سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اب ان کی سنجیدہ باتیں ختم ہوں تو ہم اپنی غیر سنجیدہ باتیں کریں۔"

"پکنک پر جانا غیر سنجیدہ بات ہے۔" ٹیپو نے رمنا کو گھورا۔

"اگر وہ نہ مانے تو۔"

"اس میں نہ ماننے والی کون سی بات ہے۔"

"کون سی بات۔" سمانہ ایک ہاتھ میں دھنیا اور دوسرے میں ہری مرچ پکڑے وارد ہوئی۔

"ہم سلمان بھائی کے ساتھ پکنک پر جانا چاہتے ہیں۔" رمنا نے بتایا۔

"جانا کہاں ہے ہڑپہ۔"

"ہڑپہ چلے جائیں۔ انہوں نے کون سا ہڑپہ دیکھا ہو گا۔" ٹیپو نے سر ہلایا۔

"گھر پر ارینج کر لو۔" سمانہ نے مشورہ دیا۔

"گھر میں پکنک منانے کا کیا مزا بدذوق لوگو!"

"ہڑپہ میں بھی کوئی مزا نہیں ہے۔ وہی ہزاروں بار کے دیکھے ہوئے کھنڈرات۔" رمنا نے منہ بنایا۔

"اس سے اچھا ہے' باغ میں چلتے ہیں یا نہر کنارے۔"

"بات کر دیکھو۔" سمانہ کچن میں گھس گئی۔

"آؤ' ابو سے بات کرتے ہیں۔" ٹیپو کھڑا ہوا۔

"لیکن وہ لوگ تو سنجیدہ گفتگو کر رہے ہیں۔" رمنا نے یاددہانی کرائی۔

"تم آؤ تو' اسی سنجیدہ گفتگو میں ہم کہیں نہ کہیں پکنک کھینچ لائیں گے۔"

وہ دونوں اندر گئے تو گفتگو واقعی سنجیدہ نوعیت کی تھی۔ وہ ایک سائیڈ پر ہو بیٹھے۔

"پارٹنرشپ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سلمان نے اچانک پوچھا۔ زوار کے ساتھ ساتھ ابصار احمد بھی چونک گئے۔

"کیا مطلب؟"

"آخر مجھے بھی تو یہاں سیٹل ہونا ہے اور جو سرمایہ میں لے کر آیا ہوں۔ کہیں نہ کہیں تو انویسٹ کرنا ہی ہو گا تو یہاں کیوں نہیں۔" اس نے آرام سے کہا۔

"مگر بیٹا۔" ابصار احمد متذبذب تھے۔

"کیا حرج ہے ماموں جان۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ یہ آئیڈیا اس گھر کے حالات دیکھ کر ابھی ابھی اس کے ذہن میں آیا تھا۔

"اپنے باپ سے تو پوچھ لو بیٹا! وہ لوگ راضی ہوں یا نہیں۔"

"یہ خالصتاً میرا اپنا سرمایہ ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"کیا خیال ہے زوار؟" ابصار احمد نے زوار کی طرف دیکھا۔ بہرحال سلمان کی پیشکش پرکشش تھی۔

"میرا خیال ہے چچا جان! اس سے اچھی آفر تو آپ کو کہیں سے نہیں ملے گی۔" زوار تو دل و جان سے راضی تھا۔

"ٹھیک ہے پھر سوچتے ہیں اس بارے میں۔" ابصار احمد نے باتیں کرتے کرتے ٹیپو اور رمنا کو دیکھا۔

"کیا بات ہے۔ تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"وہ ابو! ہم یہ سوچ رہے تھے جو اتنے سارے ڈالر سلمان بھائی آپ کو دیں گے' ان میں سے تھوڑے سے اگر ہمیں مل جاتے تو......" بات ادھوری چھوڑ کر وہ کان کھجانے لگا۔

"تم نے کیا کرنے ہیں۔" ابصار احمد نے اسے گھورا۔

"پکنک...... وہ ہم پکنک منا لیتے سلمان بھائی کے ساتھ۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پکنک کیلئے تمہیں ڈالروں کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہو جائے گی پکنک بھی۔"

"ہو جائے گی نا۔" ٹیپو نے ڈرتے ڈرتے تصدیق کی۔

"ٹیپو!" ابصار احمد نے تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورا۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

"بس ابو! مجھے یقین آ گیا۔"

اس نے کھسکنے میں دیر نہیں لگائی۔ جبکہ ابصار احمد پھر سے سلمان کی کی گئی آفر پر غور کرنے لگے تھے۔

* * *

دروازہ بے آواز کھلا تھا۔

"آ جاؤ مانہ!" سلمان نے فائل سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"ہیں۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آئی ہوں۔" وہ کچھ حیران سی اندر آئی۔

(میں تمہیں تمہاری آہٹوں سے پہچاننے لگا ہوں۔)

"کافی لائی تھی آپ کیلئے۔ پئیں گے؟" کوئی جواب نہ پا کر اس نے مگ ٹیبل پر رکھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے اس وقت کافی کی طلب ہو رہی ہے۔" اس نے فائل بند کر کے میز پر کھسکائی۔

"جناب یہ گھر عملاً میرے کنٹرول میں ہے۔ ککی آپا اسکول ہوتی ہیں۔ رمنا کالج' وہ تو بس آج کل چھٹیاں ہیں۔ خواتین کے خیال میں بیٹیاں جوان ہو جائیں تو ماؤں کو ریٹائرڈ ہو جانا چاہئے۔ سو یہ تو میرا فرض ہے کہ ہر کسی کی ضروریات کا خیال رکھوں۔" میز پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے لاپروائی سے تفصیل بتائی۔

"اور وہ بھی بن کہے۔" سلمان نے مسکرا کر کہا اور مگ اٹھا لیا۔

"بائے دا وے۔ میں کب سے تمہارے فرائض میں شامل ہو گیا ہوں۔"

"جب سے آپ آئے ہیں۔" اس نے برجستہ کہا' پھر لہجہ بدل کر بولی۔ "یہ آپ نے صبح سے کیا بوریت پھیلا رکھی ہے۔ کیا ہے ان فائلوں میں۔"

"ماموں نے جو بزنس شروع کیا ہے۔ اس کی کچھ تفصیلات ہیں' وہی دیکھ رہا تھا۔"

"رمنا کو کام تھا کچھ۔ وہ بھی آج کالج چلی گئی ہے۔ میں سخت بور ہو رہی تھی۔"

"تم بور بھی ہو جاتی ہو۔" سلمان نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں میں بور نہیں ہو سکتی؟" وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

"بھئی تمہیں اتنا مصروف دیکھا ہے کہ میرے خیال میں تمہیں اس کیلئے وقت نہیں ملتا ہوگا۔"

"نہیں' بس کبھی کبھی کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔" اس نے منہ بنایا۔

"تو پھر تمہاری اس بیزاریت کا کیا علاج کیا جائے۔" اسے سمانہ سے باتیں کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

"باتیں کرتے ہیں۔"

"تو پھر بیٹھو۔ کھڑی کیوں ہو؟"

"ابھی نہیں۔ تھوڑا کام باقی ہے' میں وہ سمیٹ لوں۔ تب تک آپ بھی فارغ ہو کر لان میں آ جائیں پھر باتیں کریں گے۔"

وہ چلی گئی۔ سلمان نے فائل کھول کر پڑھنا چاہا پر توجہ بھٹک گئی تھی۔

"لان ہی میں چلتے ہیں۔" اس نے خالی مگ ٹیبل پر رکھ کر اٹھنا چاہا تب ہی اس کے اندر سے کوئی پکارا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو سلمان۔"

"کیا کر رہا ہوں۔" وہ حیران ہوا۔

"تمہیں یاد ہے' تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"ہاں' کچھ بھی نہیں بھولا ہوں میں۔ یہ بزنس اسی سلسلے کی تو ایک کڑی ہے۔"

"یہ سمانہ کس سلسلے کی کڑی ہے۔" بہت چبھتا ہوا لہجہ تھا۔

"سمانہ۔" اس نے زیرلب دہرایا اور مسکرا دیا۔ اس نے کب سوچا تھا کہ جب وہ یہاں آئے گا تو کوئی اسے اس حد تک متاثر کر جائے گا۔ "اوہ سمانہ کیا چیز ہو تم۔"

اپنے دل کے بدلتے موسموں کو دیکھ کر اس نے بے اختیار سوچا تھا' پھر فائل کھسکا کر اٹھ گیا۔ فون پر نظر پڑتے ہی اسے خیال آیا کہ اسے بہت ضروری فون کرنا تھا' مگر فون کے پاس ہی دونوں خواتین موجود تھیں۔ نہ جانے وہ دونوں سر جوڑے ہمہ وقت کون سی گتھیاں سلجھاتی رہتی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر باہر آ گیا کہ وہ ان کے سامنے فون کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

سمانہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں گلاب پر کھلنے والی نئی کونپلوں پر پھسل رہی تھیں۔ کندھوں تک کھلے بال ہوا کی زد میں بے ترتیب ہو رہے تھے۔ سلمان دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس پر جھکی شاخ تھام کر جھٹکے سے چھوڑی۔ اس نے اپنے پتے فراخ دلی سے سمانہ پر لٹا دیئے۔ تب ہی وہ چونکی۔

"کس کو سوچا جا رہا ہے؟" اس نے دانستہ لفظ "کس" استعمال کیا تھا اور دل ہمک کر کہہ رہا تھا کہ وہ کہہ دے "آپ کو۔"

"کچھ خاص نہیں۔ بس دیکھ رہی تھی کہ بہار آنے والی ہے۔"

"ہاں۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"ابھی کچھ دنوں میں یہ ساری کیاریاں گلاب کے پھولوں سے مہک اٹھیں گی۔ بہت خوبصورت منظر ہوتا ہے۔ لکی آپا تو پھر گھنٹوں یہیں سرخ گلابوں کے سنگ وقت بتا دیتی ہیں۔"

"تم نے ایم اے میں ایڈمیشن کیوں نہیں لیا۔" اسے لکی آپا کے تذکرے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"بس گریجویشن کافی ہے۔ مجھے کون سا جاب کرنی ہے۔" وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر بولی۔

"اور کیا کیا مشغلے ہیں تمہارے؟"

اور سمانہ کا تو ایک ہی مشغلہ تھا۔ باغبانی' پھولوں اور پودوں کے بارے میں اس کی معلومات

بے تحاشا تھیں۔ سو وہ بولتی چلی گئی اور سلمان کو اس کا بولنا اچھا لگتا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ جب کچھ لمحوں بعد اپنے چہرے پر جمی اس کی نگاہوں کا احساس ہوا تو وہ ہنس دی۔

"شاید میں بہت زیادہ بول گئی۔ اب آپ کی باری ہے۔"

"نہیں' مجھے اچھا لگتا ہے۔ تمہاری آواز بہت خوبصورت ہے۔" سلمان نے بے ساختہ تعریف کی تھی۔ سمانہ جھینپ سی گئی۔ تب ہی باہر کا دروازہ کھول کر لکی آ گئی۔ ان دونوں کو وہاں دیکھ کر ٹھٹکی۔

"السلام علیکم لکی آپا! آپ آ گئیں؟" سمانہ نے اسے دیکھ کر معمول کا جملہ بولا تھا۔

"نہیں ابھی اسکول میں ہی ہیں۔" سلمان نے برجستہ کہا۔ سمانہ ہنس دی۔

"سلمان بھائی! آپ مذاق بھی کر لیتے ہیں۔"

"تو کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔" وہ خفا ہوا۔ لکی چپ چاپ ان کے پاس سے گزر کر اندر چلی گئی۔

"یہ اتنی گم صم کیوں رہتی ہیں؟" سلمان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے تو اتنا خاموش نہیں رہتی تھیں۔ آپ کے آنے پر تو زیادہ ہی رہنے لگی ہیں۔" سمانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی ڈرتی ہیں مجھ سے۔"

"آپ تو ان سے زیادہ بات بھی نہیں کرتے' ایسے کیسے چلے گا۔" وہ جھنجلائی۔

"یار دراصل ان سے تھوڑا ڈر لگتا ہے مجھے۔" وہ کان کھجا کر بولا۔

"آپا سے؟ اتنی کیوٹ سی تو ہیں۔ ان سے کیا ڈرنا اور جناب پتا ہے آپ کو' آپ کے آنے کا سب سے زیادہ انتظار آپا ہی کو تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ ٹھٹکا

"وہ ایسے کہ......"

"باجی! آپ کا فون ہے۔" جاجی نے آ کر بتایا تھا۔

"میں فون سن لوں۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر چلی گئی۔

* * *

"تمہارا لوٹ آنا تمہارے انتظار سے زیادہ اذیت ناک ہے سلمان احمد صدیقی۔ تم دور تھے تو کتنا قریب لگتے تھے۔ تمہیں کھو دینے کا ذرا سا خدشہ بھی میرے دل میں نہ جاگتا تھا۔ تم پاس ہو تو کتنا دور لگتے ہو کہ میری آنکھیں تمہیں دیکھ بھی نہیں پاتیں اور جو دیکھیں تو محض ایک اجنبی سی

شبیہ ابھرتی ہے۔ تم اتنے اجنبی کیوں ہو گئے ہو سلمان! تم نے ہی تو لکھا تھا۔ ''فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھن کمزور نہیں پڑتے۔ دوریوں کا احساس دل میں جاگزیں ہو تو انتظار مر نہیں جاتا۔'' انتظار نہیں مرا سلمان احمد۔ میں تو اب بھی منتظر ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں وہ جذبے نہیں چھلکتے جو تمہارے لفظوں میں خوشبو دیتے تھے۔ آہ...... تمہاری آنکھوں کی وہ اجنبی چمک۔ کہاں کھو گئے ہو سلمان احمد کہ مجھے بھی بھول گئے۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔''

سلمان آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ کِکی کو لگا وہ سانس لینا بھول گئی ہے۔

''میں نے سوچا تھوڑی دیر آپ کے ساتھ گپ شپ ہو جائے۔'' وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کِکی نے آہستگی سے سینے میں اٹکی سانس باہر نکالی۔

''تو اسی لئے تحریم آپ اپنے کمرے سے کم ہی باہر آتی ہیں۔ یہاں تو پوری دنیا آباد ہے۔''

اس نے گھوم کر چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر دیکھے۔

''میرا خیال ہے آپ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ کتاب بہترین دوست ہے۔'' وہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم مجھے آپ کیوں کہتے ہو۔'' اس کا سوال غیر متوقع تھا۔ سلمان ٹھٹک گیا۔

''یوں ہی۔''

''امریکہ میں کیا کرتے رہے اتنا عرصہ۔'' وہی ٹٹولتی کھوجتی ہوئی سوالیہ نظریں۔

سلمان کو لگا' اس نے کمرے میں تنہا آ کر غلطی کی ہے۔ کچھ تھا جو نظر نہیں آتا تھا' مگر پوری شدت سے محسوس ہوتا تھا۔

''جاب وغیرہ۔ اسٹڈیز کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔''

''گویا بہت مصروف رہے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''جی۔ وہاں کی لائف خاصی ٹف ہے اتنی کہ......''

''اتنی کہ تمہیں کوئی یاد بھی نہیں آیا۔''

''کوئی کون؟'' وہ بری طرح چونک اٹھا۔

''ہم سب۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے اپنے خشک گلے پر ہاتھ پھیرا۔ نجانے کیوں وہ خود

بے چین سا محسوس کر رہا تھا۔

''تم کھڑے کیوں ہو' بیٹھو نا۔''

اس لمحے سلمان کو خود پر غصہ آ گیا۔ وہ کیوں اس کے سامنے خود کو اتنا کمزور محسوس کرنے لگتا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑے اور کھڑکی کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''امی بہت ذکر کیا کرتی تھیں آپ کا۔'' اب اس کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

''پھوپھو بہت پیار کرتی تھیں مجھ سے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اکثر صرف مجھ سے ملنے یہاں آتی تھیں۔'' وہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ میز پر بہت سی کتابیں اور کاغذ بکھرے تھے۔

''اچھا؟'' سلمان کو حیرت ہوئی۔

''یہ نہیں بتایا کبھی انہوں نے۔'' وہ مسکرائی۔

''ہاں۔ شاید بتایا ہو اور میں بھول گیا ہوں۔'' سلمان گڑبڑایا۔

''ہاں اب تم بہت کچھ بھول گئے ہو۔'' اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ''بہرحال اب رہو گے یا واپس جانا ہے۔'' اس نے میز پر سے کتابیں اٹھا کر ریک پر رکھیں اور کاغذ سمیٹنے لگی۔

''میرا ارادہ تو اب یہیں رہنے کا ہے' اسی لئے تو......'' وہ جملہ بھول گیا کہ اس کی نگاہوں کی زد میں دو نیلے لفافے آ گئے تھے اور لفافے کے کونے میں لکھا انگلش میں سلمان احمد صدیقی کا نام بھی۔ کِکی نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر لفافے اٹھا لئے۔

''یہ...... یہ۔'' سلمان ہکلا کر رہ گیا۔

''کبھی تم نے لکھے تھے۔'' اس کا لہجہ نارمل تھا۔

سلمان اچھل ہی تو پڑا۔

''میں نے...... ارے ہاں۔'' اس کے ماتھے پر پسینہ ابھر آیا تھا۔

''تمہیں شاید یاد نہیں۔'' کِکی کی شکوہ کناں نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔

سلمان کو لگا کمرے میں گھٹن بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

''یاد ہے۔ میں تو اس لئے حیران تھا کہ تم نے ابھی تک انہیں سنبھال کر رکھا ہے۔''

''نہیں' سنبھال کر تو نہیں رکھا۔ کچھ پرانی کتابوں میں پڑے رہ گئے تھے۔ آج صفائی کی تو نکل آئے۔''

کِکی کے گلے میں کچھ اٹک گیا تھا۔ ''تم چاہو تو واپس لے لو۔''

اس نے دونوں لفافے اس کی طرف بڑھائے۔

''نہیں...... م...... میں نے کیا کرنا ہے ان کا۔ چلتا ہوں اب میں۔ شاید زوار آ گیا ہو۔''

وہ بغیر جواب دیئے کمرے سے نکل گیا۔ لکی نے ہاتھ میں پکڑے لفافے دیکھے' پھر تھکے تھکے انداز میں سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

"یہ کیسا اچھوتا سا بندھن ہے جو تمہارے میرے درمیان بندھ گیا ہے۔ میں آتی جاتی ہواؤں سے تمہاری خوشبو چرا لیتا ہوں۔ میں جاتے موسموں سے تمہاری خیر لیتا ہوں۔ سورج کی کرنیں تمہیں چھو جاتی ہیں تو مجھے بتاتی ہیں۔ چاند تمہارے آنگن میں جھانکتا ہے تو مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے۔"

"وہ سب کیا تھا سلمان۔" وہ میز پر سر رکھ کر سسک اٹھی۔ "کاش......

"کاش تم کبھی لوٹ کر نہ آتے۔"

* * *

"تم نے سلمان بھائی کو دیکھا ہے مانہ۔ کچھ دنوں سے پریشان لگتے ہیں۔" دال چنتی رمنا نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔

"ہوسکتا ہے امریکہ یاد آ رہا ہو۔" سمانہ نے کڑھی بنائی تھی۔ اب اس میں ڈالنے کیلئے پکوڑوں کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے بیسن میں مسالے مکس کر رہا تھا۔ ابو کڑھی نہیں کھاتے تھے سو ان کیلئے وہ دال پکانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

"امریکہ میں کون ہے جسے یاد کریں گے۔"

"پھوپھا جان وہیں ہیں بے وقوف۔"

"اتنے دنوں سے وہ یہاں ہیں۔ ایک بار بھی نہ پھوپھا جان کا فون آیا اور نہ خود انہوں نے کیا۔"

"پی سی او سے کر لیا ہوگا۔ ادھر لکی آپا الگ گم صم اور چپ چپ رہتی ہیں۔ میرا خیال تھا سلمان بھائی کی آمد پر وہ بھنگڑے ڈالیں گی۔ وہ الٹا مزید گوشہ نشین ہوگئی ہیں۔"

"پہلے میرا خیال تھا وہ شرماتی ہیں' مگر اب تو وہ بھی واضح طور پر پریشان دکھائی دیتی ہیں۔" سمانہ کڑھائی چڑھاتے ہوئے بولی۔

"مجھے لگتا ہے ان دونوں کے درمیان کوئی ان بن ہوگئی ہے۔" رمنا نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"ان بن کیسی؟" سمانہ چونکی۔ "کبھی آپس میں بات تک تو کرتے دیکھا نہیں ہے میں نے۔"

"ہاں سارا دن تو سلمان بھائی تمہارے ساتھ لگے رہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" سمانہ بری طرح چونکی اور رمنا کی طرف پلٹی۔ جبکہ وہ معمول کے انداز میں کہنے لگی۔

"تمہاری خاصی فرینڈشپ ہوگئی ہے سلمان بھائی کے ساتھ۔ تم بات کر کے دیکھو۔ لکی آپا نے جس طرح ان کا انتظار کیا ہے میں نہیں سمجھتی کہ اگر کوئی بات ہوئی تو وہ لکی آپا کی طرف سے ہوگی۔"

"ہاں کروں گی۔" سمانہ الجھ سی گئی تھی۔

"خط تو انہوں نے یوں لکھے تھے جیسے لکی آپا کے بغیر ایک پل جینا بھی دشوار ہے۔ کم از کم دیکھنے میں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔"

"خط...... تم نے وہ خط پڑھے تھے۔" مانہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"ہاں۔"

"لکی آپا کی اجازت سے۔"

"ایسی چیزیں اجازت سے پڑھی جاتی ہیں۔" وہ ڈھٹائی سے کندھے اچکا کر بولی۔

"شرم کرو رمنا۔" سمانہ نے سرزنش کی۔

"کر لی۔" وہ تھال کھسکا کر کھڑی ہوگئی۔ "میں نے دال چن دی ہے۔"

"بڑا احسان کیا۔" سمانہ نے جل کر کہا تو وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی جبکہ سمانہ کا ذہن بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ جو کھانا بناتے ہوئے بھی اسے ڈسٹرب کرتی رہیں۔

سلمان نے حسب معمول کچن میں جھانکا تو وہ ڈائننگ چیئر پر بیٹھی ہتھیلی پر تھوڑی ٹکائے دوسرے ہاتھ سے ٹیبل پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔

"کچن کچھ زیادہ راس آ گیا ہے تمہیں۔"

"ہوں۔" وہ چونکی پھر جھینپ گئی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر بغیر کسی کام کے یہاں کیوں بیٹھی ہو۔" وہ خود بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اتنے دنوں میں وہ پوری طرح اس گھر میں رچ بس گیا تھا۔

"کچھ سوچ رہی تھی۔"

"کس کو؟" اس کے لہجے میں شرارت جاگی۔

"آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" اس نے دونوں ہتھیلیاں میز پر ٹکا کر اس کی طرف دیکھا۔

"زہے نصیب۔" سلمان کے ہونٹوں پر در آنے والی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

''آپ کی ککی آپا سے کوئی بات ہوئی ہے۔'' اس کے اچانک پوچھنے پر وہ ذرا سنبھل کر بیٹھا۔

''نہیں۔ کچھ خاص تو نہیں۔''

''وہ بہت پریشان رہنے لگی ہیں سلمان بھائی۔ جبکہ آپ کے آنے پر تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھلنی چاہیے تھیں۔''

''م...... میرے آنے پر......'' وہ متحیر سا پوچھنے لگا۔

''آپ کو نہیں معلوم سلمان بھائی! اس گھر میں جب سب لوگ آپ کے آنے کی امید توڑ چکے تھے' بس وہ تھیں جو انتظار کے دیپ جلائے آپ کی منتظر تھیں۔ آپ کے لوٹ آنے کی دعائیں سب سے زیادہ ککی آپا کی تھیں۔ آپ کے بھیجے بس دو خط انہوں نے کسی مقدس صحیفے کی طرح سنبھال کر رکھے ہیں آج تک۔''

سلمان کے اردگرد دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ ششدر سا سمانہ کو سن رہا تھا اور سمانہ کو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ امی نے اسے سلمان سے اس موضوع پر بات کرنے سے منع کیا تھا۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ ککی آپا پریشان ہیں اور ان کی پریشانی کا تعلق کسی نہ کسی طرح سلمان کے رویے سے ضرور ہے۔

''کیا کہہ رہی ہو مانہ؟''

''آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے آپ کو کچھ خبر ہی نہیں۔'' سمانہ نے خفگی سے انہیں دیکھا۔ ''پانچ سال قبل آپ کا آخری خط آیا تھا۔ اس کے بعد تو کوئی خبر ہی نہ آئی۔ پانچ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا' وہ بھی ایک لڑکی کیلئے پھر بھی وہ ثابت قدم رہیں۔ جب ہم سب نے چاہا کہ وہ آپ کے ساتھ قائم رشتہ ختم کر کے کسی اور سے شادی کر لیں تو ککی آپا اس محاذ پر بالکل تنہا تھیں۔''

''سلمان بھائی!'' سمانہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا۔ سلمان کو لگا اس کا ہاتھ سلگ اٹھا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا' مگر بت بنا ٹکر ٹکر اپنے ہاتھ پر دھرے نازک سے ہاتھ کو گھورے گیا۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ ککی آپا کو ان کی ریاضتوں کا صلہ دیا جائے۔ وہ آپ سے محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے بنا دیکھے' بنا جانے چاہا ہے آپ کو۔ کتنا؟ یہ میں نہیں جانتی۔ مگر وہ آپ کے بنا جی نہیں پائیں گی۔ آپ وعدہ کریں' آپ انہیں کبھی دھوکہ نہیں دیں گے۔ کبھی ہرٹ نہیں کریں گے۔''

نازک سے ہاتھ کا دباؤ اس کے ہاتھ پر بڑھ گیا تھا۔ تب ہی تحریم نے کچن میں قدم رکھا۔

سمانہ کے دل میں چور ہوتا تو وہ فوراً اپنا ہاتھ ہٹا لیتی۔ اس کے برعکس وہ سلمان کا ہاتھ جھنجوڑ کر بولی تھی۔

''وعدہ کریں نا سلمان بھائی۔''

سلمان نے اس کی گرفت سے ہاتھ کھینچا اور دوسرے لمحے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر تھا۔ سمانہ نے بے حد حیرت سے سلمان کے طرز عمل کو دیکھا جبکہ تحریم بھول ہی گئی تھی کہ وہ کچن میں کیا لینے آئی تھی۔

* * *

''افوہ! آپ یہاں ہیں اور میں سارے گھر میں آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔'' رمنا آندھی و طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ بیڈ پر نیم دراز سلمان سیدھا ہو بیٹھا۔

''کوئی کام تھا؟'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

''کوئی کام نہیں تھا لیکن آپ کچھ دنوں سے کمرہ نشیں کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔'' وہ تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ بس یوں ہی۔'' بالوں میں انگلیاں پھنسا کر وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ ایک عجیب سے انکشاف نے اسے الجھا کر رکھ دیا ہے۔

''تو پھر چلیں' نیچے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ گیمز کھیلیں گے۔''

''نہیں رمنا! آج نہیں۔''

''آج کیوں نہیں۔ امی' ابو سب سونے جا چکے ہیں اور میری تو شرط لگی ہے آپ کو لے کر جاؤں گی۔ بس اب آپ نخرے مت کریں۔''

وہ اتنے مان سے کہنے لگی تھی۔ سلمان نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گیا۔ نیچے سب لوگ ککی سمیت لاؤنج میں جمع تھے۔

''لیں' لے آئی ہوں ان کو۔'' رمنا نے کہا۔

''سلمان بھائی! کیرم کھیلتے ہیں۔'' ٹیپو نے کہا۔

''یار! آج موڈ نہیں ہے۔'' وہ بیزار سے لہجے میں کہہ کر ان کے پاس ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

''موڈ ابھی بن جائے گا۔ چلو بھئی پارٹنر بناؤ۔'' ٹیپو نے کہا۔

''پارٹنر وہی ہمیشہ والے۔ میں اور ٹیپو' سمانہ اور زوار بھائی' سلمان بھائی اور ککی آپا۔''

''میں نہیں کھیل رہی۔'' ککی آپا نے پارٹنر کا سنتے ہی انکار کر دیا تھا۔

''آپا کیوں؟'' رمنا چلائی۔

"میں ہارا ہوا گیم نہیں کھیلا کرتی۔" اس نے رسانیت سے کہہ کر کتاب کھول لی۔
"ہیں ابھی کھیلے تو ہیں نہیں۔ آپ پہلے ہی ہار گئیں۔" ٹیپو نے مذاق اڑایا۔
"کبھی کبھی انسان بغیر کھیلے ہی ہار جاتا ہے۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور نظریں کتاب
سلمان ندامت سے گڑ کر رہ گیا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے۔
"تو پھر پارٹنر کیسے بنیں گے؟"
"میں بھی جا رہا ہوں' سلمان اور سمانہ ہو جاؤ۔" زوار تو پہلے ہی مارے باندھے بیٹھا تھا۔ اٹھ کر
"چھوڑو یار! پھر کسی دن کھیلیں گے۔" ککی کے سامنے سمانہ کا پارٹنر بن کر کھیلنا اسے عجیب
سا لگ رہا تھا۔ اگرچہ یہ محض ایک کھیل تھا' مگر دل میں چور ہو تو بہت سی باتیں یوں ہی محسوس
ہونے لگتی ہیں۔
"نہیں' ہم ابھی کھیلیں گے۔" سب کے اصرار پر اسے بیٹھنا ہی پڑا۔ ککی کی بنا پر وہ
کھیل نہیں پا رہا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھار بے خیالی میں کتاب سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھنے لگتی
اور جب عین آخر میں رمنا اور ٹیپو جیتنے لگے تھے۔ لائٹ چلی گئی۔
"اوہ......" سب کے منہ سے ایک ساتھ ہی نکلا تھا۔
"میں موم بتی لاتی ہوں۔" ککی کی آواز اندھیرے میں ابھری' پھر سلمان نے محسوس
کوئی سایہ سا اس کے پاس سے گزر گیا تھا۔ وہ تینوں زور و شور سے کھیل پر تبصرہ کر رہے تھے۔ جبکہ
سلمان ان سے بالکل کٹ کر سوچ رہا تھا۔ اسے یہاں سے چلا جانا چاہئے کہ یہ سب ٹھیک نہیں
رہا۔ اگرچہ جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ ابصار احمد سے پارٹنر شپ کی بات کر چکا تھا اور کچھ دنوں تک
باقاعدہ کام بھی شروع ہونے والا تھا۔
اور پھر سمانہ بھی تو تھی۔ اس کو چھوڑ کر جانا کس قدر مشکل بلکہ ناممکن سا تھا۔ شہادت کی انگلی
سے میز پر لکیریں کھینچتے ہوئے سوچیں اسے کہاں سے کہاں لے گئیں اور اس کی انگلی کی جنبش
میز کی سطح پر سمانہ کا نام لکھا جانے لگا۔ اگرچہ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا مگر دو آنکھوں نے موم بتی
کے ہلکے سے شعلے میں اس کی انگلی کی حرکت کو پڑھا تھا اور اس سے قبل کہ کوئی اور بھی پڑھتا' ایک
ہاتھ دھیرے سے اس کے ہاتھ پر آ ٹھہرا۔ عالم مدہوشی سے باہر نکلتے ہوئے اس نے جھٹکے سے
گردن اٹھائی۔ دو آنکھیں اس کے عین مقابل تھیں اور ان آنکھوں میں غبار سا چھایا تھا۔
ککی نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلا کر اسے روکا تھا' پھر ذرا سا جھک کر اس نے موم بتی
میز پر ٹکائی اور دوسرے لمحے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

* * *

گھر میں ایک دم ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔
سب حیران و پریشان بلکہ ششدر سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔
"ککی نے سلمان سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔"
جس نے سنا انگلی دانتوں تلے دبا لی۔ ابو نے سنا تو بھڑک اٹھے۔ امی سارے لاڈ پیار
بالائے طاق رکھے اس پر برس پڑیں۔ زوار' سمانہ' ٹیپو' رمنا سب متحیر سے اس کی شکل دیکھتے رہے
اور وہ سلمان احمد' جو یہاں سے بھاگ نکلنے کی فکر میں تھا ایک دم شانت ہو گیا۔ ڈھیروں ڈھیر
اطمینان اس کے اندر اتر گیا۔ بس اک احساس شرمندگی تھا۔ اسی لئے سارا وقت گھر سے باہر
گزارنے لگا۔ ابھی وہ اس معاملے میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ گھر والے اس معاملے کو
اس سے بالا ہی بالا نبٹانے کے چکر میں تھے اور سب کچھ اس سے پوشیدہ رکھا جا رہا تھا لیکن
بہر حال وہ اس گھر میں رہتا تھا۔ سب کچھ کسی نہ کسی طرح اس کے علم میں بھی آ جاتا تھا۔
گھر میں سخت ٹینشن تھی اور ککی کا رو رو کر برا حال تھا۔ بس یہی رٹ تھی کہ وہ سلمان احمد
صدیقی سے شادی نہیں کرے گی۔ کسی صورت نہیں کرے گی۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ پاگل ہو گئی ہو جو ایسی باتیں کر رہی ہو۔ جب ہم تمہیں کہہ
رہے تھے کہ وہ نہیں آئے گا' تب تمہاری ایک رٹ تھی کہ سلمان نہیں تو کوئی نہیں۔ اب اس میں
کون سے کیڑے نظر آ رہے ہیں تمہیں۔" امی کا لہجہ غضب ناک تھا اور ککی دھواں دار رو رہی تھی۔
زوار کو ترس آ گیا۔
"بس کریں چچی جان۔"
"ارے کیا بس کروں۔ بات سنی ہے اس کی۔ اوپر سے منہ سے کچھ پھوٹتی بھی نہیں۔ وہ
اتنے سالوں بعد آیا ہے وطن شادی کیلئے' مری ماں کا کیا گیا وعدہ نبھانے کیلئے اور یہ......"
"پلیز چچی جان! ایسے نہیں۔ ایسے بھی کوئی معاملہ سلجھا ہے کبھی۔" زوار نے رسان سے
سمجھایا۔
"تو پھر پوچھو اس سے کیوں کر رہی ہے یہ سب۔" وہ بھڑک اٹھیں۔
"میں پوچھتا ہوں۔ آپ پریشان مت ہوں۔ امی آپ' چچی جان کو نیچے لے جائیں۔"
زوار نے چپ کھڑی تائی اماں سے کہا۔ تو وہ انہیں سمجھاتی بجھاتی نیچے لے گئیں۔ تب زوار ککی کی
طرف متوجہ ہوا۔
"لو پانی پیو۔" اس نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ککی نے اس کے ہاتھ سے گلاس
تھام کر دو گھونٹ بھرے اور ٹیبل پر رکھ دیا۔

"آنسو صاف کرو۔ سہولت سے میری بات سنو۔"

ککی نے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کوئی میری بات نہیں سمجھتا۔"

"پہلے ایک بات تو تم سمجھ لو کہ جو کچھ تم نے کہا اس کے بعد ان لوگوں کے رویے اتنے غیر متوقع نہیں ہیں۔ تمہیں اندازہ تو ہوگا۔"

"ہاں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"تو اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کیا پاگل پن ہے۔"

"تم بھی اسے پاگل پن کہو گے۔" وہ شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم بھی تو یوں کہتی ہو جیسے سب کچھ مجھ سے پوچھ کر یا بتا کر کر رہی ہو۔"

"بس وہ ویسا نہیں ہے جیسا میرا خیال تھا۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" زوار حیران ہوا۔

"وہ میرے آئیڈیل' میرے تصور سے بہت مختلف نکلا ہے۔"

"کتنا مختلف؟" زوار کی کھوجتی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"اتنا کہ میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" وہ لفظ چبا چبا کر بولی۔

"بس یہی وجہ ہے؟"

"ہاں تو کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" وہ نظریں جھکا کر بولی تھی۔

"کچھ بھی مگر یہ نہیں۔" زوار اطمینان سے بولا۔

"مجھے وہ وجہ بتاؤ ککی جو کہ اصل میں ہے' ٹھوس وجہ۔ جسے میں اور گھر والے تسلیم کر سکیں۔ یہ بچوں جیسے بہلاوے مت دو ہمیں۔ تم کتنی بھی آئیڈیلسٹک سہی' مگر جس طرح تم نے بغیر سلمان کو دیکھے اس رشتے کو قبول کیا تھا اور جس طرح اس کی بنا پر سارے پرپوزل ٹھکرائے ہیں۔ اب" جیسا بھی ہوتا تمہیں اس کو قبول کر لینا تھا۔ اس بات کا مجھے یقین ہے۔ اب وہ وجہ بتاؤ۔"

ککی کی آنکھیں پھر سے جھلملا گئیں۔

"پلیز ککی بتاؤ نا۔ دوست سمجھو' بھائی یا کزن' مگر تمہارے میرے درمیان ایسا رشتہ تو ہمیشہ سے موجود رہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کچھ بھی شیئر کر سکیں۔ اچھا چلو۔ وعدہ رہا۔ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"اور میرا ساتھ بھی دو گے۔" ککی نے پرامید نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ اگر تمہاری "وجہ" میرا ذہن و دل مان گیا تب۔" اس نے شرط رکھی اور ککی نے

دھیرے دھیرے اسے بتا دیا کہ سلمان سمانہ میں انٹرسٹڈ ہے۔ زوار اچھل ہی تو پڑا پھر اسے ماننا ہی پڑا کہ ککی بے وقوف تو نہ تھی کہ ایک بے بنیاد بات کرتی۔

"اگر سلمان انکار کرتا تو یہ ناممکن تھا کہ ابو اس کی شادی سمانہ سے کرتے۔ اس لئے میں نے سوچا......"

"کہ یہ قربانی تم دے دو۔" زوار نے جملہ مکمل کیا۔

"کوئی قربانی نہیں ہے یہ۔ میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی جس کے ذہن و دل پر کسی اور کا قبضہ ہو۔ خواہ وہ میری بہن ہو۔ جو کچھ میرے اور اس کے درمیان کبھی تھا وہ فاصلوں نے مٹا دیا۔ اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ میں بلاوجہ اس کے اور سمانہ کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔ سمانہ کو خوش رکھے گا۔"

اس نے جیسے کڑی مسافت طے کی تھی۔

"اور تم......" زوار نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں بھی شادی کر لوں گی' مگر پلیز زوار! اس بات کی کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ سمانہ...... وہ بہت حساس لڑکی ہے۔"

وہ ملتجی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ زوار نے آہستگی سے اس کے سر کو تھپکا پھر باہر نکل گیا۔

* * *

بہت دن تک گھر میں ہنگامہ رہا' مگر ہونا تو وہی تھا جو تقدیر میں لکھا تھا۔ فیصلہ ابو نے خود ہی کر دیا کہ ککی نہ سہی' سمانہ سہی۔ وہ اتنے اچھے لڑکے کو کھونا نہیں چاہتے تھے اور پھر وہ ان کی بہن کی آخری نشانی تھا۔ تائی اماں دل مسوس کر رہ گئیں۔ انہوں نے سمانہ کو ہمیشہ اپنی بہو کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے کبھی زوار سے ذکر نہیں کیا تھا۔

"آپ فکر کیوں کرتی ہیں آپا! رمنا بھی تو آپ کی بیٹی ہے۔" امی نے تسلی دی۔

"پر وہ تو زوار سے چھوٹی ہے۔"

"چار پانچ سال کا فرق بھی کوئی فرق ہے۔"

وہ لوگ سلمان سے شرمندہ تھے اور سلمان ککی سے۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اسے سب کچھ بتانا چاہتا تھا' مگر کسی مناسب موقع پر۔ ابو نے تو ککی سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ یہ بات جہاں ککی کیلئے تکلیف دہ تھی' وہیں سلمان کیلئے بھی پریشان کن۔ وہ معصوم لڑکی خوامخواہ دوسروں کی ناراضگی کا نشانہ بن رہی تھی' مگر ابھی وہ کسی کو اس بات کی خبر نہ دینا چاہتا تھا کہ وہ سمانہ سے محبت کرتا ہے۔ البتہ اس نے سمانہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ اسے پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔

ککی سے بھی زیادہ۔

اس نے بھی تو رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔

''میں نے سلمان بھائی کو ہمیشہ ککی آپا کے حوالے سے دیکھا تھا۔''

''دیکھا نہیں' سوچا تھا۔ اب اسے اپنے حوالے سے دیکھ لو۔'' زوار نے تصحیح کی تھی۔

سلمان چاہتا تھا کہ منگنی کا باقاعدہ اعلان ہو جائے۔ اس لئے ابو نے فیصلہ کیا کہ یکم اپریل کی شام کو منگنی کی تقریب رکھ لی جائے۔ تب ہی سب جو اس ہنگامے میں آتی بہار کو فراموش کر گئے تھے' چونک اٹھے اور پھر زور وشور سے منگنی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے کہ فرق تو کسی کو نہیں پڑا تھا' سوائے ککی کے۔ جس نے وہ دونوں خط پرزے پرزے کر کے بے مہر ہواؤں کے سپرد کر دیئے تھے۔ اب وہ جھولے پر بیٹھ کر کتابیں نہیں پڑھتی تھی۔ بس اپنے کمرے میں بند رہتی۔

اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ باہر سبز موسموں کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔ سبز ہوائیں اپنی خوشبو ان پر لٹانے کو بے تاب ہیں۔ آلوچے کے پیڑوں پر گلابی رنگ بکھر رہا ہے۔ آنگن میں موتیے کی خوشبو رقص کرتی ہے اور یہ کہ اس کے آنگن میں پہلا سرخ گلاب کھل گیا تھا' مگر وہ بے خبر تھی۔

ہوائیں اسے دیکھ کر چپکے چپکے مسکراتی تھیں۔

* * *

کس کو سوچ رہی ہو؟'' وہ اس کے برابر میں بیٹھ کر بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔ سمانہ چونک کر اچھلی۔

''کسی کو بھی نہیں۔''

تو پھر کیا دم پڑھ رہی تھیں کہ خزاں جلد رخصت ہو جائے۔''

''نہیں تو۔''

''تو پھر دعا مانگ رہی تھیں کہ منگنی کا دن جلدی آ جائے۔'' سلمان کا لہجہ شوخ ہوا۔

''افوہ! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' وہ اس کی بات سمجھ کر جھینپی۔

''مجھے تو کچھ نہیں مگر تمہیں ضرور کچھ ہوا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''کترانے کیوں لگی ہو مجھ سے؟'' سلمان سنجیدہ ہوا۔

''کب' میں تو نہیں کترا رہی۔'' وہ نظریں چرا کر بولی۔

''بات بھی نہیں کرتی ہو مجھ سے۔ میں کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو تم سامنے سے ہٹ جاتی ہو۔ یہ سب کیا ہے مانہ۔ کسی نے روکا ہے یا تم خوش نہیں۔''

''دونوں باتیں ہی نہیں ہیں۔''

''تو پھر۔'' سلمان اس کے سامنے آیا۔ وہ کچھ الجھی الجھی سی لگی۔

''یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا ہے سلمان بھائی کہ میں سوچ سوچ کر......''

''بھائی۔ یار! اب تو بھائی کہنا چھوڑ دو اور اگر ان سب کے بارے میں سوچنا چھوڑ کر صرف مجھے سوچنا شروع کر دو تو قسم خدا کی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں آپ سے کچھ اور پوچھنا چاہ رہی ہوں۔'' اس کے غیر سنجیدہ انداز پر وہ چڑ سی گئی۔

''پوچھو۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''آپ کو دکھ تو ہوا ہوگا ککی آپا کے رویے سے۔'' سمانہ نے آہستگی سے پوچھا۔

''اف...... تم ابھی تک وہیں الجھی ہو۔'' سلمان سر پکڑ کر رہ گیا۔

''دیکھو لڑکی! جب میں یہاں آیا تھا تو میرا دل و دماغ بالکل صاف تھے' صاف سلیٹ کی طرح۔ نہ کوئی نقش تھا' نہ کوئی تصویر......''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟'' سمانہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''پلیز' میری بات سنو اور اس پر اعتبار کرو۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ سمانہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

''میں جب یہاں آیا تو مجھے صرف ایک لڑکی نظر آئی تھی۔''

''ککی آپا۔'' وہ پھر سے بول اٹھی۔

''نہیں' تم۔'' پھر اس کی حیران حیران آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔

''صرف تم تھیں سمانہ جسے دیکھ کر مجھے لگا کہ اب میں کہیں نہیں جا سکتا اور جو احساسات میں نے تمہارے لئے اپنے دل میں محسوس کئے تھے اس سے پہلے کسی کیلئے بھی میرے دل میں نہیں ابھرے تھے۔''

''اور ککی آپا۔'' سمانہ کی الجھتی نگاہیں اس کے چہرے سے ٹکرائیں۔

''میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ مجھے انہیں دیکھنا بھی نہیں چاہئے تھا۔'' وہ مبہم سا مسکرایا۔

''ان نگاہوں نے تو صرف تمہیں دیکھنا تھا۔ اس دل کا مکیں تو تمہیں بننا تھا تو پھر میں کسی اور کو دیکھتا بھی تو کیسے۔'' اس کے لہجے میں جذبے آنچ دیتے تھے۔ دل کہتا تھا۔ سچائی یہی ہے جو وہ کہتا ہے۔ سمانہ نے ایک طویل سانس لے کر اسے دیکھا۔

''تو گویا آپ دونوں ہی ایک دوسرے کے آئیڈیل پر پورے نہیں اترے۔ ککی آپا کا سارا سفر رائیگاں گیا۔ عمر کے کتنے قیمتی سال انہوں نے سائے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دھول کر دیئے۔ ہم میں سے کوئی یہ نہیں یہ سوچ سکتا تھا کہ اس کہانی کا انجام یوں ہوگا۔''

"کون جانے آنے والا وقت ہم سب کیلئے کیا لے کر آرہا ہے۔ پلیز سمانہ! ماضی کیا تھا؟ بھول جاؤ۔ ہم ایک دوسرے کا حال بھی ہیں اور مستقبل بھی۔ بس اتنا ہی یاد رکھو۔" سلمان نے دھیرے سے سمجھایا تو اس کی طرف دیکھ کر قصداً مسکرائی تھی۔

* * *

"امی! ہم نے منگنی والے دن پہننے کیلئے نئے کپڑے خریدنے ہیں۔" رمنا نے لاڈ سے ان کا کندھا ہلایا۔

"کیوں تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔" ٹیپو نے چھیڑا۔

"امی سلوا دیں گی نا۔" وہ ٹیپو کی بات نظرانداز کر گئی۔

"کوئی سے بھی پہن لینا رمنا! اتنے تو ہیں تمہارے پاس۔" انہوں نے ٹالا۔

"امی! سب پرانے ہیں۔ منگنی پر اتنے سارے لوگ آئیں گے۔"

"زیادہ تو نہیں، بس یہی محلے والے اور تمہارے ماموں وغیرہ ہوں گے۔"

"تو پتا ہے ماموں کی سدرہ کے پاس کتنے اچھے اچھے کپڑے ہیں اور میں وہی پرانے پہنوں گی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"فکر کیوں کرتی ہو، تمہاری منگنی پر تمہیں نئے کپڑے دلوا دوں گا۔ آخر میں بھی تو پرانی پینٹ پہنوں گا۔" ٹیپو نے تسلی دی۔

"تم تو چپ رہو۔ تمہارا کیا ہے، وہی گھسی ہوئی جینز پہن کر ہر جگہ بھگتا آتے ہو۔"

وہ چڑ کر بولی۔ تب ہی سمانہ کی فرینڈ آگئی۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو ارم بیٹی۔" امی نے محبت سے اس کا پھر اس کے گھر والوں کا حال احوال دریافت کیا۔

"سمانہ کہاں ہے؟" کچھ دیر کے بعد اس نے دریافت کیا۔

"لان میں ہی ہوگی۔ جاؤ رمنا، بہن کو لے جاؤ۔" امی نے کہا تو وہ ارم کو لے کر چلی گئی۔

جبکہ ٹیپو اٹھ کر زوار کے کمرے میں آگیا۔ جو گیارہ بجے اٹھ کر شیو بنا رہا تھا۔ ٹیپو دھپ سے اس کے بیڈ پر گرا اور تکیہ اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔

"خیریت ہے۔" زوار نے واش روم کے کھلے دروازے سے جھانکا۔

"ہوں۔"

"یار ٹیپو! میں منگنی پر کیا پہنوں۔" زوار نے پوچھا۔

"کچھ نہ پہنیں۔" اس نے آسان سا حل بتایا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔" زوار جھینپ سا گیا۔

"لڑکیوں کی فکر تو ٹھیک، مگر آپ کیوں ہلکان ہو رہے ہیں۔ کیا متوقع سسرال والے تشریف لا رہے ہیں۔" تکیے میں سے پوچھا گیا۔

"ہائے ہماری ایسی قسمت کہاں۔" سرد آہ کھینچی۔

"یوں ہی میں سوچ رہا تھا شاید اتنی ساری لڑکیوں میں سے کوئی مجھے پسند آجائے۔"

"یوں کہیے کہ شاید آپ کو کوئی پسند کر لے۔" وہ تکیہ پھینک کر بیٹھ گیا۔

"ارے مجھے پسند کرنے والے بہت۔" زوار اترا کر بولا۔

"یعنی "والیوں" کی کمی ہے۔" ٹیپو کا لہجہ شوخ ہوا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہر طرف سے اللہ کا فضل ہے۔ یہ بتاؤ کہ پہنوں کیا۔"

"آپ؟" ٹیپو نے سرتاپا اسے دیکھا۔ شرٹ ندارد، خالی پینٹ میں ملبوس، کندھے پر تولیہ اور منہ پر شیونگ کریم......

"آپ یوں ہی ٹھیک ہیں۔"

اس نے اطمینان سے کہہ کر کھڑکی کھولی جبکہ زوار جھنجھلا کر دوبارہ واش روم میں گھس گیا تھا۔

لان میں سمانہ اپنی فرینڈ کے ساتھ مصروف گفتگو تھی۔

"پتا ہے۔ میری بھی منگنی ہونے والی ہے۔" وہ شرما کر بتا رہی تھی۔

"اف......کون ہے وہ بدنصیب۔" ٹیپو کے منہ سے پھسلا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اچھل ہی تو پڑی۔

"میرا مطلب ہے خوش نصیب......کون ہے وہ خوش نصیب۔" اس نے فوراً پینترا بدلا تھا۔

"میرے کزن ہیں، آرمی میں ہوتے ہیں۔"

"بیٹ مین ہوں گے۔" ٹیپو منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"تم اپنی منگنی پر کیسے کپڑے سلوا رہی ہو۔ میں تو میرون کلر کا شرارہ سوٹ سلواؤں گی۔ مجھ پر یہ کلر بہت سوٹ کرتا ہے۔" وہ اٹھلا کر بتا رہی تھی۔

"کس احمق کی رائے ہے یہ۔" ٹیپو کی زبان پھر پھسل گئی۔ خود وہ کھڑکی سے کچھ اور باہر آیا تھا۔ سمانہ کے ساتھ ساتھ محترمہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ نظرانداز کر کے سمانہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پاپا نے مجھے بلینک چیک تھما دیا تھا کہ جو چاہو منگنی کیلئے خرید لو۔ یونو وہ بہت بڑی پارٹی

ارینج کر رہے ہیں اس دن۔''

''پھر تو ہماری دعوت پکی۔'' ٹیپو کا لہجہ دوستانہ ہوا۔

''آپ بھی آجایئے گا۔ پاپا کہتے ہیں' ایسے موقعوں پر غریبوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔''

وہ ٹیپو کی دخل اندازی سے تنگ آ کر تنک کر بولی تھی۔ ٹیپو بری طرح اچھلا۔ اس کوشش میں وہ کھڑکی سے کچھ اور باہر نکلا تھا۔

''ہیں۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم غریب ہو گئے ہیں۔''

''ہیں...... سمانہ!'' ارم کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لہرائی۔

''آپ یقین کریں۔ ہم واقعی بہت غریب ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں مرغ بس دو صورتوں میں پکتا ہے یا تو بندہ بیمار ہو یا مرغ۔'' وہ کمال معصومیت اور دل گرفتگی سے ہانک رہا تھا اور سمانہ نظروں ہی نظروں اسے کچا کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''واقعی سمانہ! تم لوگ اتنے غریب ہو گئے ہو۔'' ارم نے پریشان ہو کر سمانہ کو دیکھا۔

''یقین کریں۔ محلے کی ساری بیمار مرغیاں اسی لئے تو ختم ہوتی جا رہی ہیں کہ ہمارے گھر کوئی بندہ بیمار نہیں ہوتا۔''

''ہیں۔ یہ ٹیپو اپنی ٹانگیں یہیں بھول گیا۔'' کمرے میں لٹکتی محض ٹانگوں کو دیکھ کر زوار نے تفکر سے سوچا اور باقی ماندہ ٹیپو کو ٹخنوں سے پکڑا اور باہر لڑھکا دیا۔ ٹیپو لڑھکنیاں کھاتا عین لڑکیوں کے پاس جا رکا۔ دونوں کی چیخیں بے ساختہ تھیں۔ ٹیپو اس ناگہانی آفت سے سنبھلا تو نظر ارم پر پڑی۔ فوراً اپنے حواس سنبھالتا ہوا بولا تھا۔

''میں اکثر اسی راستے سے آتا جاتا ہوں۔ تو کیا کہہ رہی تھیں آپ۔''

ٹیپو کی ٹانگ اس کے سر سے محض دو انچ کے فاصلے پر رکی تھی۔ اس نے شرربار نگاہوں سے ٹیپو کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

''چلتی ہوں سمانہ! اور ہاں......'' وہ جاتے جاتے پلٹی۔ ''اگر ٹنکی صاف کرنے والا تمہارا ملازم فارغ ہو تو ہمارے ہاں بھجوا دینا۔ ہماری پانی کی ٹینکی بہت گندی ہو گئی ہے۔''

''ارے یہ وہ تھی۔'' ٹیپو تحیر سے سمانہ کی طرف پلٹا' پھر اس کے خطرناک تیور دیکھ کر اس نے امی...... امی کے نعرے لگاتے ہوئے اندر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

* * *

''کیا ہو رہا ہے؟'' رمنا وارڈروب کھولے نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ جب سلمان نے اندر جھانکا۔

''کچھ خاص نہیں۔ دیکھ رہی تھی آپ لوگوں کی منگنی پر کون سا سوٹ پہنوں۔'' اس نے الماری بند کی۔ سلمان نے ایک لمحے کو سوچا۔

''فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ تم لوگوں کو شاپنگ کروا لاتا ہوں۔ بس جلدی کرو۔'' رمنا حیران حیران سی اس کے پیچھے باہر نکلی۔

''امی جی! میں ان لوگوں کو شاپنگ کروا لاؤں۔'' سلمان نے باہر آ کر خود ہی امی سے پوچھا۔

''کیسی شاپنگ۔'' وہ چونکیں۔

''ان کے گفٹس ڈیو ہیں مجھ پر۔ اصولاً امریکہ سے واپسی پر مجھے ان کیلئے گفٹس لانے چاہئیں تھے۔ میں یوں ہی خالی ہاتھ چلا آیا۔''

''چھوڑو بیٹا! کیوں تکلیف کرتے ہو تم۔'' انہوں نے ٹالنا چاہا۔

''حالانکہ اس بات پر تو سلمان کو جرمانہ ہونا چاہئے تھا۔'' زوار نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''جناب میں جرمانہ بھرنے کو تیار ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے پر سمانہ کو رہنے دو۔'' امی نے کچھ سوچ کر کہا۔

''امی جی! منگنی تو کل ہے۔ آج تک جانے دیں۔''

سلمان نے بوکھلا کر مدد طلب نگاہوں سے زوار کی طرف دیکھا۔

''جانے دیں چچی جان! پابندیاں کل سے عائد کر دیجئے گا۔'' زوار نے مسکراتے ہوئے سفارش کی تو وہ مسکرا کر چپ ہو گئیں۔

''تم نہیں چل رہے؟'' سلمان نے زوار کو یونہی بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں یار! میں بہت تھک گیا ہوں۔'' زوار اٹھ کر باہر آیا۔ حسب توقع کٹی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

''اگر تم اس طرح کرو گی تو وہ لوگ سوچیں گے تم پچھتا رہی ہو۔ ان کے ساتھ نارمل بی ہیو کرو۔ اٹھو تیار ہو جاؤ۔''

زوار کے سمجھانے پر وہ تیار ہو گئی۔ بازار میں حسب معمول بہت رش تھا۔ رمنا اور سمانہ چوڑیوں کے اسٹال کی طرف لپکیں۔

''سنو! دھنک میں کتنے رنگ ہوتے ہیں۔'' سلمان نے سمانہ کے پیچھے کھڑے ہو کر پوچھا۔

''سات۔'' وہ چوڑیاں پسند کرتے ہوئے بے خیالی سے بولی۔

''ساتوں رنگوں کی چوڑیاں پیک کروا لو اپنے لئے۔''

”اتنی ڈھیر ساری چوڑیاں کیا کروں گی میں۔“

”تمہاری کلائی میں چوڑیاں بہت بجتی ہیں۔“ اس نے ذرا سا جھک کر اس کے کان پر سرگوشی کی۔ سمانہ کے گال دہک اٹھے۔

”افوہ! آپ تو پیچھے ہٹیں یا آپ کو بھی چوڑیاں پہننی ہیں۔“ کسی منچلی نے جگہ کی تلاش پر جھنجھلا کر سلمان کو دھکیلا۔ وہ خجل سا ہو کر پیچھے ہٹا تو نگاہ لکی پر گئی۔ جو یونہی کھڑی شیشے کے جھانک رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں لیا تھا۔

”آپ چوڑیاں نہیں لے رہیں تحریم۔“

”میری کلائی میں چوڑیاں زیادہ اچھی نہیں لگتیں۔“ وہ بغیر اس کی طرف دیکھے بولی۔ سلمان شرمندگی کے کسی گہرے احساس میں گھر گیا تھا۔ لکی یونہی آگے بڑھ گئی۔

”بس تھوڑا انتظار اور تحریم۔“ سلمان نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر ٹیپو کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ ٹیپو کے ہزار انکار کے باوجود اسے جینز اور شرٹ دلا کر واپس آیا تو وہ تینوں دکان کے سامنے انہیں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ لوگ۔“

”یہیں تھے کیا خریدا تم لوگوں نے۔“ سلمان نے پوچھا۔

”ہم نے بہت اچھی چوڑیاں لی ہیں۔“ رمنا نے دیکھا۔

”اور تو کچھ بھی نہیں لینا تھا ہمیں۔“

”نہیں بھئی ایسے تو نہیں چلے گا۔“ اس نے والٹ نکال کر کئی نوٹ نکالے اور رمنا کی مٹھی میں تھما دیئے۔

”اپنے اور تحریم کیلئے اچھا سا سوٹ پسند کر لو۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے سلمان۔“ تحریم نے سختی سے منع کرنا چاہا۔

”پلیز میری طرف سے گفٹ سمجھ کر۔“

”مگر سلمان بھائی!......“

”بھائی صرف کہتی ہو سمجھتی نہیں۔“ سلمان نے پیار بھری خفگی سے رمنا کو دیکھا۔ اس کے لہجے میں مان بھرا اصرار تھا۔ رمنا نے لکی کی طرف دیکھا۔ وہ لب بھینچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”اوکے۔ لیکن آپ سمانہ کو گفٹ نہیں دیں گے۔“ رمنا نے گویا اپنے آپ فیصلہ کیا۔

”اگر اجازت ہو تو تھوڑی شاپنگ میں سمانہ کو اپنی پسند سے کروا دوں۔“ سلمان نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ سمانہ کی تو جان ہی نکل گئی۔

”نن نہیں۔“

”کھسکنا چاہتے ہیں آپ۔“ رمنا ہنسی۔

”کھسکنا ہوتا تو کیا اجازت مانگتا۔“ سلمان نے مسکرا کر کہا۔

”ہم نہیں دیتے اجازت۔“ رمنا اکڑ گئی۔

”اوکے ہم اجازت لیتے ہی نہیں۔ ٹیپو ٹھیک آدھے گھنٹے بعد یہیں ملیں گے۔“ دوسرے لمحے وہ سمانہ کا ہاتھ تھام کر تن زیب میں گھستا چلا گیا۔ ہکا بکا ٹیپو ان دونوں کی طرف پلٹا۔

”امی نے اس کے بارے میں تو کوئی ہدایت نہیں کی تھی۔“

”بکو نہیں۔“ لکی کو نجانے کیوں شدید غصہ آ گیا تھا۔

”چلو سمانہ ڈیر! پسند کرو اچھا سا سوٹ۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ سمانہ جھنجھلا کر بولی۔ خجالت و شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”آپ کو ذرا شرم نہیں آتی ٹیپو بھی وہیں تھا اور لکی آپا کیا سوچتی ہوں گی۔“

”یہ بعد میں سوچیں گے۔ پہلے کوئی سوٹ پسند کرو۔“ سلمان نے اطمینان سے کہا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ سمانہ کو پتا تھا واپسی پر رمنا اور ٹیپو کس طرح اس کا ریکارڈ لگائیں گے۔ سلمان نے اپنی پسند سے پنک سوٹ خرید لیا' جس پر دبکے کا خوبصورت کام ہوا تھا۔ ساتھ میں میچنگ چوڑیاں بھی۔

”منگنی کی شام یہی سوٹ پہننا۔ بہت اچھی لگو گی۔“

”دیکھوں گی۔“ وہ خفا سے لہجے میں گویا ہوئی۔

”اچھا بابا!...... خفگی چھوڑو اور ایک ڈریس تحریم کیلئے پسند کر لو۔“ سلمان نے کہا۔

”مگر وہ تو۔“

”مجھے پتا ہے' وہ نہیں خریدے گی۔“ سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔ تو وہ قدرے سہولت سے لباس پسند کرنے لگی۔

* * *

اوائل بہار کی خوشبو میں بھیگی سبز ہوا مائل بہ شرارت تھی۔ بار بار اس کے آنچل سے لپٹ جاتی۔ ادھ کھلے گلابوں کی خوشبو کسی رازداں چنچل سہیلی کی طرح اس کے گالوں کو چھو جاتی تو اس کے چہرے پر ایسے ایسے رنگ بکھر جاتے کہ نگاہ ٹھہرانی مشکل تھی۔ وہ اپنے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو محسوس کر کے جھینپ رہی تھی۔ کبھی آنچل میں چہرہ چھپانے کو ہاتھ اٹھاتی تو چوڑی کنگن ایک ساتھ نئی دھن سنانے لگتے۔ کبھی جھمکا اس کے کان میں سرگوشی کر دیتا۔ وہ ان سب کی شرارتوں سے

تنگ آ کر شرماتی تو کبھی جھنجلا جاتی۔

''یار! یہ سمانہ کو کیا ہوگیا ہے یہ اتنی خوبصورت تو کبھی نہ تھی۔'' اس کی ایک سہیلی بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''محبتوں کا اعجاز ہے میری جان۔'' دوسری نے آہ بھری۔

''اس پر تو لگتا ہے محبتیں کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوگئی ہیں۔ ورنہ منگنی تو ہماری بھی ہوئی تھی۔'' پہلی کے لہجے میں ہلکی سی جلن تھی۔

''ماشاء اللہ بھی تو کہہ دیں نا۔ کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔'' پاس سے گزرتی رمنا نے کہا۔ وہ بہت مصروف تھی۔ تحریم اور وہ کچن میں لگی تھیں۔ مہمانوں کی تواضع کیلئے کچے قیمے کے کباب، پکوڑے، رول، سینڈوچز اور چائے گھر پر ہی تیار کئے تھے جبکہ پھل، مٹھائی اور کوک ابھی ابھی زوار لے کر آیا تھا۔ تقریب کا انتظام لان میں ہی کیا گیا تھا۔

''ماشاء اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے تم دلہن بن کر کتنی خوبصورت لگو گی۔'' اس نے دھیرے سے سمانہ کی بندیا کو چھو کر کہا۔ یہ سمانہ کی وہی فرینڈ ارم تھی۔

''ہمارے دولہا بھائی بھی کم نہیں ہیں۔ ایک دم شہزادہ لگ رہے ہیں۔'' رمنا نے ٹکڑا لگایا۔

''تو کہاں چھپا رکھا ہے ذرا نکالو تو۔''

سلمان آیا تو اس کی نگاہ گویا جم کر رہ گئی تھی۔ پنک سوٹ میں وہ اتنی مقدس اور پیاری لگ رہی تھی کہ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''سمانہ! یہ تم ہو؟''

''نہیں سمانہ کا بھوت ہے۔'' رمنا ہنسی۔

''تم سچ مچ اتنی خوبصورت ہو یا مجھے لگ رہی ہو۔'' وہ بے خود ہو رہا تھا۔

''اللہ سلمان بھائی کچھ شرم کریں۔'' کسی نے اس کا کندھا جھنجوڑا۔ وہ جیسے ہوش میں آیا پھر ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا۔

''شرم کیسی۔ اگر سمانہ واقعی اتنی خوبصورت لگ رہی ہے میں کیا کروں۔''

''دولہا بھائی! آپ کو تو واقعی شرم نہیں آتی۔ کیسے سرعام تعریف کئے جا رہے ہیں۔'' ... نے اعتراض جڑا۔

''کسی غیر کی تو تعریف نہیں کر رہا اور اول تو دولہا بنے نہیں ہیں ہاں بن جائیں اگر ... ابھی مان جائے تو۔'' سمانہ کا سر مارے شرم کے گھٹنوں سے جا لگا تھا۔

''اف فوراً انگوٹھی نکالیں سلمان بھائی! آپ کی تو نیت بدل رہی ہے۔'' رمنا ان کے ... آ بیٹھی۔

''انگوٹھی۔'' سلمان اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ تب ہی سارے بزرگ بھی آگئے۔ سب ہی نے ان دونوں کے سروں پر پیار کر کے دعائیں دیں۔

''انگوٹھی نکالیں سلمان بھائی۔''

''وہ تو شاید میں لانا ہی بھول گیا۔'' سلمان نے بے چارگی سے کہا۔

''کیا؟ آپ انگیج منٹ رِنگ بھول گئے۔ سمانہ ڈیئر ابھی سوچ لو۔ کیسے بھلکڑ شخص سے واسطہ پڑا ہے۔ کل کلاں کو تمہیں نہ بھول جائیں۔'' سمانہ کی سہیلی اس کے کندھے پر جھکی۔

''ان کو کون بھول سکتا ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پھر جیب سے انگوٹھی نکال کر اس نے تنبیہی نگاہوں سے سب کو گھورا۔ ''تم لوگ ورغلاؤ مت سمانہ کو۔''

''انگوٹھی پہنائیں انگوٹھی۔'' شور بلند ہوا۔

''لیکن اس سے پہلے ایک گانے کے بول سن لیں۔

وہ کیا کہا ہے کسی نے کہ۔'' ٹیپو نے باقاعدہ گا کر انہیں سنایا۔

جب جب کسی کی عقل جائے ماری

کرتا ہے پھر وہ شادی کی تیاری

جواباً زوار نے دھپ لگائی تھی۔

''تم اسے الٹی پٹیاں مت پڑھاؤ۔''

''چلیں نہیں پڑھاتے۔'' ٹیپو نے اپنی گردن سہلائی۔ ''مگر اب ذرا جلدی کریں۔ کچن سے اٹھنے والی خوشبوئیں میرے صبر کا ضرورت سے زیادہ امتحان لے چکی ہیں۔''

''تمہیں تو ہر وقت کھانے کی سوجھتی ہے۔'' رمنا اور اس کی اپنی ہی نوک جھوک شروع ہوگئی تھی۔

''چلو بیٹا بسم اللہ کرو۔'' تائی اماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''پلیز۔'' سلمان نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سمانہ کے ہاتھوں میں لرزش سی اتر آئی تھی۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اٹھایا اس سے قبل کہ سلمان اسے تھام کر انگوٹھی پہناتا۔ دروازے پر ہونے والی تیز دستک نے سب کو چونکا دیا۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' ٹیپو جھنجلایا۔

''شاید کوئی مہمان ہو جاؤ دیکھو۔'' ابو نے کہا تو وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''فرمایئے۔'' اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا، پھر ٹھٹک گیا۔ سامنے کھڑے اونچے لمبے

نوجوان نے اپنا سفری بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور مسکراتی نگاہوں سے ٹیپو کو دیکھا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تم ٹیپو ہو۔"

اس کی آواز و انداز' مسکراتی آنکھیں اور وہی مہربان مسکراہٹ' ٹیپو نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"آپ؟" ٹیپو کا تحیر آمیز استفہامیہ لہجہ' نووارد کے لبوں پر مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔

"اندر تو آنے دو۔ بہت دور سے آیا ہوں۔"

ٹیپو نے غیر ارادی طور پر رستہ چھوڑا۔ وہ مستحکم قدم اٹھاتا اندر آیا۔ پھر کسی تقریب کے اثرات دیکھ کر ذرا سا رکا۔

"شاید میں بہت اچھے وقت پر آیا ہوں۔"

کسی گہرے احساس میں گھر کر سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ جن میں سرفہرست سلمان احمد صدیقی تھا۔

"تم۔" سلمان کی سرسراتی آواز ابھری۔ نووارد کی آنکھوں میں تحیر امڈ آیا۔

"تم یہاں؟"

"بیٹا! کون ہیں آپ؟" ابو نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ نوارد کے لبوں پر مضمحل سی مسکراہٹ جاگی۔

"میرا خیال تھا آپ لوگ مجھے پہچان لیں گے۔" اس کی متلاشی نگاہوں نے چاروں طرف سفر کیا۔ مگر کہیں ٹھہری نہیں۔

"میں سلمان احمد صدیقی ہوں۔" ایک دھماکہ ہوا تھا۔ ایک لمحے کو تو سب کی سماعتیں بہری ہو گئیں۔

"کیا کہہ رہے ہو۔ سلمان احمد تو یہ ہے۔"

نووارد کی گہری نگاہیں سمانہ کے ساتھ کھڑے شخص پر رکیں۔ پھر وہ قدم قدم چلتا اس کے عین سامنے رکا۔

"بتاؤ ناں ان کو تم کون ہو؟" اس نے اصرار آمیز لہجے میں کہا۔

سمانہ کے ساتھ کھڑے شخص نے انگوٹھی مٹھی میں بھینچ کر سمانہ کو دیکھا۔ وہ مضطرب سی [illegible] تھی۔ پھر وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولا تھا۔

"میں...... میں زنیر احمد صدیقی ہوں۔"

* * *

احمد صدیقی ملتان کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کا پتا بتانے کیلئے بس اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ لال حویلی چلنا ہے۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی ان کی تایا زاد تھی۔ مگر ایک بیٹی اور بیٹے کو جنم دے کر بیماری کے بعد رحلت فرما گئیں۔ کچھ عرصہ تو احمد صدیقی مرحومہ بیوی کی یادوں سے ہی نہ نکل سکے۔ پھر قریبی رشتہ داروں نے ان کی توجہ بچوں کی طرف دلائی تو انہیں بھی احساس ہوا کہ ان تمام ذمہ داریوں سے تنہا عہدہ برآں نہیں ہو سکتے۔ ان کے حامی بھرتے ہی ان کے قریبی ماموں نے ایک دور پار کی رشتے دار کی غریب و یتیم بیٹی کے ساتھ ان کا عقد ثانی کروا دیا۔

قدسیہ خاتون سمجھدار اور سلیقہ شعار عورت تھیں۔ انہوں نے نہ صرف حویلی کا نظم و نسق انتہائی خوش اسلوبی سے سنبھالا بلکہ بن ماں کے بچوں کو بھی محبت دینے کی کوشش کی تھی کہ اشفاق احمد اور ابصار احمد کی پیدائش کے بعد بھی ان دونوں بچوں پر ان کی توجہ کسی صورت کم نہیں ہوئی تھی۔ چار سالہ خدیجہ نے تو بہت آسانی کے ساتھ انہیں ماں کی جگہ قبول کر لیا تھا۔ مگر احتشام احمد انہیں کسی صورت قبول نہیں کر پایا۔ نجانے کہاں سے ڈھیر ساری نفرت ان کے دل میں جمع ہو کر پروان چڑھتی رہی۔ باپ کے سامنے تو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ البتہ ان کی وفات کے بعد اس نے گویا سارے بدلے چکا دیئے۔

احتشام احمد کی توجہ شروع ہی سے زمینداری کی طرف تھی جبکہ اشفاق اور ابصار نے ملازمت کو ترجیح دی۔ باپ نے چاروں بچوں کی شادی اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ زمینداری مکمل طور پر احتشام احمد کے ہاتھ میں تھی۔ جیسے ہی احمد صدیقی نے آنکھیں بند کیں احتشام احمد نے اپنے وکیل کے ساتھ ملا کر ان کی پوری وصیت ہی تبدیل کروا دی۔ جس کی رو سے چاروں بچوں کو جائیداد برابر تقسیم ہوئی تھی۔ مگر اب ساری جائیداد صرف احتشام احمد صدیقی کے نام تھی۔

قدسیہ بیگم بھونچکی رہ گئیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ احمد صدیقی کبھی اس طرح نہیں کر سکتے۔ ابصار احمد نے چاہا کہ وہ اس وصیت کو عدالت میں چیلنج کریں۔ مگر اشفاق احمد جو ان دنوں ساہیوال اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے ان سب کو وہیں لے گئے۔ شوہر کی وفات کے ساتھ ساتھ عمر کے اس آخری دور میں قدسیہ بیگم کو لال حویلی سے دربدری کسی صورت گوارہ نہ تھی سو لال حویلی سے نکلنے کے بعد محض ایک سال تک زندہ رہ سکی تھیں۔

احتشام احمد نے خدیجہ کو (جو اپنے شوہر کے ساتھ حویلی میں ہی مقیم تھیں) صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اشفاق و ابصار کے ساتھ تعلق رکھیں گی تو انہیں احتشام احمد کو چھوڑنا ہوگا۔ خدیجہ بھائی کی اس درجہ سنگ دلی پر دل مسوس کر رہ گئیں۔ مگر وہ کسی طرح چھوٹے بھائیوں کو چھوڑ نہیں سکتی تھیں

سو احتشام احمد سے چوری چھپے ان سے ملتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب تحریم پیدا ہوئی تو انہوں
نے چپکے سے اپنے اکلوتے بیٹے سلمان احمد کے نام کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی تھی۔
کی دہلیز پر قدم رکھتے سلمان کے ذہن میں انہوں نے پوری طرح یہ بات بٹھا دی تھی کہ اس کی
شادی بس تحریم کے ساتھ ہوگی۔ وہ جب بھی ساہیوال سے واپس آتیں تو سلمان کو تحریم کی ہر
ایک بات بتاتیں۔ یوں سلمان کے ذہن و دل میں ایک تصویر سی بنتی چلی گئی۔

وہ یوں چلتی ہے۔ یوں بات کرتی ہے اسے یہ پسند ہے یہ ناپسند۔ مگر اس سے قبل کہ وہ
بھائی کو اس رشتے کے بارے میں بتاتیں۔ ہلکا سا ہارٹ اٹیک بہانہ بن گیا۔ تب تک وہ اپنی
بیٹیوں کی شادی کر چکی تھیں۔ سلمان احمد امریکہ پڑھنے چلا گیا تھا۔ جب باپ اور ماموں نے اس
کی شادی کرنا چاہی تو اس نے وہیں سے انہیں اپنی اور مرحومہ ماں کی پسند بتا دی۔ احتشام احمد تو
بھڑک اٹھے۔ سلمان کے والد نے اس سلسلے میں چپ سادھ لی تھی۔ وہ اکلوتے بیٹے کو اس کی خوشی
سے محروم نہیں کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی اس صورت میں جائیداد ہاتھ سے جانے دینا چاہتے تھے۔

احتشام احمد نے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ تحریم سے شادی کرے گا تو ان کا اپنے بہنوئی اور
بھانجے سے کوئی رشتہ نہیں ہوگا۔ سلمان احمد تنہا اس محاذ پر لڑتا رہا۔ لال حویلی کے باقی افراد ماموں
بھانجے کی اس چپقلش سے بے خبر تھے۔ حتیٰ کہ زنیر احمد صدیقی بھی۔ جو احتشام احمد کا اکلوتا بیٹا
اور طبیعتاً احتشام احمد کے بالکل برعکس تھا۔ نرم مزاج اور حلیم طبع یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا کوئی نہیں
جانتا تھا۔ مگر وقت نے اس کا فیصلہ احتشام احمد کی موت کی صورت کر دیا۔ یوں لال حویلی پر چھائی
بائیس سالہ نفرت و عداوت کی خود ساختہ فضا دم توڑ گئی اور اس عرصے میں سلمان احمد لال حویلی سے
سارے ناتے توڑے تن تنہا خود کو اسٹیبلش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حویلی کے سارے معاملات اب زنیر احمد صدیقی کے ہاتھ آ گئے تھے تب آصفہ بیگم نے
بائیس سالوں پر محیط یہ کہانی زنیر احمد صدیقی کے گوش گزار کر دی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ جانتا ہی نہ
تھا کہ اس کے چچا بھی موجود ہیں۔ آصفہ بیگم ان سب کو ان کا حق واپس دلانا چاہتی تھیں اور زنیر
احمد کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔ بلکہ وہ تو تڑپ اٹھا تھا۔ اپنوں سے ملنے کو اور اپنے باپ کی
غلطیوں کی تلافی کیلئے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ چچا وغیرہ اسے احتشام احمد کے بیٹے کی حیثیت
سے قبول کریں گے یا نہیں۔ ماں نے بتایا تھا کہ تمہاری پھوپھو اپنے بھائیوں سے ملتی رہی
تھیں۔ سلمان نجانے کہاں غائب تھا کہ اس نے سارے رابطے ہی توڑ لئے تھے۔ سو اس نے
سلمان کی حیثیت سے وہاں جانا مناسب سمجھا۔ اسے تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ سلمان اور تحریم کے
درمیان کوئی رشتہ بھی ہے۔ وہ تو بس ان لوگوں میں اس طرح شامل ہو جانا چاہتا تھا کہ وہ لوگ

صورت اسے خود سے الگ نہ کر سکیں۔ پھر وہ سب ہوتا چلا گیا اور اب وہ ان سب کے سامنے سر
جھکائے مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

* * *

کھلی ہتھیلی پر دھری انگوٹھی پر وہ نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔
"کیا خوابوں کے مقدر میں بس خاک ہونا ہی لکھا ہے۔ تو پھر یہ آنکھیں خواب کیوں پروتی
ہیں۔"
"بے مہر ہواؤں کے سامنے چراغ اپنا وجود کھو دیتے ہیں۔ تو ہمارے وجود میں کھڑکیاں سی
کیوں کھلتی ہیں۔ سلمان احمد صدیقی اگر یہی سب کرنا تھا تو میرے سنسان رستوں میں خوشبو کیوں
بکھیرتے رہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا۔"
"ککی آپا ککی آپا!" رمنا آندھی و طوفان کی طرح بھاگتی آئی تھی۔ اس نے مٹھی بند کر کے
اس کی طرف دیکھا۔
"ککی آپا وہ وہ۔" اس کی سانس الجھ رہی تھی۔
"کیا ہوا؟" اس نے رسانیت سے پوچھا۔
"ککی آپا! سلمان، سلمان بھائی آئے ہیں۔"
نجانے کیوں وہ بار بار ہنستی تھی اور پھر رو دیتی تھی۔
ککی نے اس کے عقب میں دیکھا۔
"کیا وہ کہیں گئے تھے؟"
"ککی آپا وہ، وہ سلمان بھائی نہیں تھے۔ سلمان بھائی اب آئے ہیں۔"
"کیا کہہ رہی ہو رمنا!" وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھے گئی۔ تب رمنا نے اس کا ہاتھ تھاما۔
"آئیں میرے ساتھ۔" اور اسے کھینچتی چلی گئی۔ لان میں ایک گہری چپ تھی اور زنیر کہہ
رہا تھا۔
"خدا گواہ ہے چچا جان! میں نے یہ سب پوری نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا۔ آپ لوگوں میں
شامل ہونے کیلئے اور اب میں آپ سب کے اس قدر قریب آ چکا ہوں کہ واپسی ناممکن ہے، آپ
مجھے دھتکاریں گے۔ میں تب بھی نہیں جاؤں گا۔"
سب کی نظریں ابصار احمد پر جمی تھیں۔ نوجوان نسل کے چہرے پر اشتیاق تھا۔ جو کچھ ماضی
میں ہوا وہ ان کیلئے کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔ یہ خوبصورت نوجوان ان کا کزن ہے، وہ بہت پہلے اسے
تسلیم کر چکے تھے۔ خواہ کسی بھی حیثیت سے سہی۔ سمانہ کی آنکھوں میں سہما سہما سا خوف اتر آیا تھا

اور وہ ٹکٹکی باندھے باپ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جن کے ہونٹوں پر چپ تھی' گہری چپ لکی عین سلمان کے عقب میں رکی تھی اور سلمان گویا اسے اس کی خوشبو سے پہچان گیا تھا۔ تب ہی تیزی سے پلٹا۔ نظروں سے نظریں ملیں اور اس نے بے اختیار پکارا۔

''لکی!''

اور تحریم نے لڑکھڑا کر سہارے کیلئے رمنا کا ہاتھ تھاما تھا۔ سلمان کے لہجے میں وہی شدتیں تھیں جو اس کے لفظوں میں نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں تحیر آمیز اشتیاق تھا' جس کے عقب سے محبت اسی شام تر بے قراری کے ساتھ جھانک رہی تھی۔

تحریم کا وجود ساکت ہوگیا' اس کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔

''یہی تو ہے۔''

تب ہی ابصار احمد نے سر اٹھا کر سب کو دیکھا۔ تب بھی ان کے لبوں پر لطیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''وہ تو ٹھیک ہے زنیر بیٹا! مگر پہلا حق تو لکی اور سلمان کا ہے نا۔''

فضا ایک دم مہک اٹھی تھی۔ ایک شور سا اٹھا تھا۔

''انگوٹھی نکالیں سلمان بھائی۔''

''انگوٹھی۔'' وہ دونوں ایک ساتھ بول اٹھے۔

''افوہ! ہم اصلی سلمان سے کہہ رہے ہیں۔'' سب نے حسب توفیق زنیر کو گھورا۔

''مگر میں انگوٹھی تو لایا ہی نہیں۔'' سلمان پریشان ہوا۔

''اب انگوٹھی کہاں سے لائیں۔ سلمان میرا مطلب ہے زنیر بھائی! آپ ہی ذرا سی دیر کو انگوٹھی دے دیں۔'' رمنا نے کہا۔

''نہیں بھئی ہم تو اپنی انگوٹھی نہیں دے رہے۔'' زنیر نے صاف انکار کر دیا۔

''ہائے انگوٹھی۔'' چاروں طرف انگوٹھی کی ڈھنڈیا مچ گئی تھی۔ لکی نے دھیرے سے اپنی ہتھیلی سلمان کے سامنے کھولی۔ سلمان نے چونک کر دیکھا۔ پھر اس کی ہتھیلی سے انگوٹھی اٹھا کر اس کی انگلی میں پہنا دی۔

''میں نے کہا تھا نا میں سرخ گلابوں کے موسم میں آؤں گا۔'' سلمان نے جھک کر سرخ گلاب کی ادھ کھلی کلی توڑی اور اس کے بالوں میں سجا دی۔ تحریم کو لگا۔

سرخ گلابوں کے موسم اس کے آنگن میں ہی نہیں دل میں بھی آ ٹھہرا ہے۔

* * *

خوشبو سے رنگ ملتے ہیں

اس نے خاصی بیزاری سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سب پر سرسری سی نگاہ دوڑائی تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی سرگرمیوں میں اور باتوں میں مصروف تھا۔ بشریٰ بلیک بورڈ پر کارٹون بنانے میں مصروف تھی۔ علینہ کو شعر یاد آ رہے تھے۔ وہ بہت خوبصورتی سے شعر لکھ رہی تھی گویا خوش خطی میں انعام حاصل کرنا ہو۔ دونوں نے علیحدہ سے درمیان میں لکیر کھینچ کر بلیک بورڈ آدھا آدھا بانٹ رکھا تھا۔ ثمینہ روسٹرم پر کھڑی نجانے کس کو اپنی تازہ لکھی انگلش پوئم سنا رہی تھی۔ اب کوئی نادیدہ ہستی سامنے تھی تو معلوم نہیں ورنہ کلاس روم میں تو کوئی اور نہیں سن رہا تھا۔ روحہ بڑے جوش و خروش سے اپنے گروپ کو بمعہ ایکشن دی لاسٹ ورلڈ کی کہانی سنا رہی تھی۔ فضہ کا گروپ فرحت عباس شاہ کی شاعری پر تبصرہ کر رہا تھا۔ ریحان کو خاندانی مسئلہ درپیش تھا۔ وہ سرگوشیوں میں اینہ کے ساتھ سر جوڑے ڈسکس کر رہی تھی۔ عریشہ اپنے گروپ کو ملک کی سیاسی صورتحال سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ مرعوب سی ہو کر سن رہی تھیں۔ نائلہ کا گروپ سب سے بے نیاز اپنے نوٹس اور تیاری ڈسکس کر رہا تھا۔ عنبرین کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ خاندان میں اکٹھی چار شادیوں پر وہ کون کون سے سوٹ پہنے۔ اس کے عقب میں عظمیٰ زور زور سے سمری کو رٹا لگانے میں مصروف تھی۔ کچھ خاموش چہرے تھے۔ کچھ دوسروں کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے محظوظ ہوتے اور کچھ اس کی طرح بیزار اس نے ایک بار پھر سب کو دیکھا۔ یوں لگتا تھا یہی آخری موقع ہے بات کرنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا۔ اس کے بعد یہ چھت سر پر آ گرے گی یا سب گونگے ہو جائیں گے۔

ایک ساتھ اتنی ساری آوازوں پر توجہ دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے لگا ایک تالاب میں کئی بطخیں ہیں جو اکٹھی قیں...... قیں...... کر رہی ہیں۔

اس نے گھبرا کر ونیزہ کا کندھا ہلایا جو عمارہ سے رشین سلاد کی ترکیب لکھوا رہی تھی۔

''ونی! چلو کلاس بنک کرتے ہیں۔''

''ہیں..... وہ کیوں؟''

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''ابھی دوسرا پیریڈ ہے۔''

''تو میں نے ناشتہ نہیں کیا نا؟''

''ناممکن۔''

''سچ کہہ رہی ہوں۔ پھر دیکھو ناں فاری بھی نہیں آئی۔ لگتا ہے اس کا بھی لینے کا موڈ نہیں ہے۔''

''یار! اب میڈم سٹاف روم سے نکل چکی ہوں گی۔'' اس نے عذر پیش کیا۔

''ہم ان سے پہلے نکل جائیں گے۔'' وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور اسے بھی کھینچ لیا۔

''بس اتنی سی بات تھی۔'' اس نے کلاس روم سے باہر آ کر کہا' پھر دو قدم چل کر رک گئی۔

''میرا بیگ کلاس روم میں رہ گیا ہے۔''

''شاباش......'' ونیزہ نے گھورا۔

اس نے مزید کچھ بھی سنے بغیر پیچھے کی طرف دوڑ لگائی۔ بہ عجلت بیگ گھسیٹا۔ ایک لڑکی سے ٹکرائی۔ دوسری کرسی سے اور تیسری کرسی عین دروازے میں زمین بوس ہوئی تھی۔ کاریڈور کے آغاز میں مس ممتاز ظہیر کی جھلک نظر آتے ہی انہوں نے دوڑ لگا دی تھی۔

''اب فارینہ کو کہاں ڈھونڈیں۔'' فائن آرٹس روم کے سامنے کھڑے ہو کر سانس درست کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''چلو' ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ تب تک برگر بھی بن جائیں گے۔'' برگر والی ڈبل روٹی کے دونوں بڑے لفافے اسلم بھائی کے موٹر سائیکل کے دائیں بائیں جھول رہے تھے اور وہ جانتی تھیں اس موقع پر کینٹین میں داخل ہوئیں تو اسلم بھائی دونوں ہاتھ اٹھا کر کہہ دیں گے۔''

''ڈبل روٹی میں ابھی لے کر آیا ہوں۔ چنے کا پتیلا چولہے پر ہے اور سموسوں کا میدہ ابھی تیار نہیں ہوا۔''

فائلوں پر انگلیاں بجاتی وہ پرسوں والے مینا بازار کو ڈسکس کرتے ہوئے راؤنڈ لگانے لگیں۔

''وہ عائزہ کی جو کزن آئی تھی وہ کتنی پیاری تھی نا۔ گوری گوری سی......'' چنیا نے خیال آرائی کی۔

''ہاں مگر اس کی ناک بہت موٹی تھی۔'' ونیزہ نے جواب دیا۔

''اچھا......!'' چنیا نے ذہن میں اس کی ناک لانے کی کوشش کی' پھر ناکام ہو کر بولی۔

''میں نے اس کی ناک پر غور نہیں کیا۔ ویسے تو پیاری تھی اور حمنہ کی باتیں سنی تھیں۔ اب تو اس کے گھر میں سب کچھ آ گیا ہے کہہ رہی تھی۔

''ہر کمرے میں کارپٹ آ گیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر سے لے کر کمپیوٹر تک ہر چیز۔''

''ہاں اس کے دونوں بھائی جو باہر چلے گئے ہیں۔ مگر مجھے تو گپ بازی لگ رہی تھی۔ سوٹ دیکھا تھا اس کا دو سال پرانا پرنٹ......'' ونیزہ نے ناک چڑھائی۔

''میں نے اس کے سوٹ پر غور نہیں کیا۔'' چنیا نے نفی میں سر ہلایا۔

''دوپٹہ پچاس روپے والا اور جوتا سیل کا۔'' اس نے مزید بتایا۔

''یہ سب تو میں نے نہیں دیکھا......'' چنیا نے مخصوص جواب دیا تھا۔ روش کو چھوڑ کر وہ فوراً گراؤنڈ میں آ گئیں۔ گھنے درختوں کی چھایا میں سرسبز گھاس فوارے کا پانی موتیوں کی طرح گر رہا تھا۔

''تم فائزہ سے ملی تھیں جو میٹرک میں ہمارے ساتھ ہوتی تھی؟'' ونیزہ کو یاد آیا۔

''ہاں وینی! وہ تو بہت بدل گئی ہے۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے۔'' چنیا کی وہی عادت ہر چیز کا مثبت پہلو دیکھنا۔

''گھر بیٹھ بیٹھ کر موٹی ہو گئی ہے۔ پیٹ دیکھا تھا' کیسے پھولا ہوا تھا۔ لگتا ہے گھر بیٹھ کر کھاتی رہتی ہے۔''

چنیا نے قدرے تحیر سے اسے دیکھا۔

''وینی! تو نے اس کا پیٹ بھی دیکھ لیا تھا؟'' جواباً اس نے دھپ لگائی تھی۔

''تو یہ بتا' مینا بازار پر اتنا لیٹ کیوں آئی تھی؟''

وہ واقعی تایا ابو کی وجہ سے لیٹ ہو گئی تھی۔ کالج پہنچی تو فنکشن اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ اور وہ دونوں بے تابانہ گیٹ کے اردگرد چکرا رہی تھیں۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی اسے گھسیٹ لے گئیں جہاں فورتھ ایئر کی نبیلہ ''جتی قصوری'' پر پنجابی فلموں کی ہیروئن کی نقل اتار رہی تھی۔ سرخ لاچا' سبز کرتا' لمبی ڈانگ اس پر اس کا بھاری بھرکم وجود۔ ٹرو کاپی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد کچھ خاکے' ڈرامے جن پر بس ہوٹنگ ہی ہوتی رہی لیکن جب جواد کا...... ''اچیاں مجاجاں'' والی پر سیکنڈ ایئر کا گروپ ڈانس کیلئے آیا تو باقی سب تو ایک طرف فارینہ کو کون روکتا۔ اس نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر وہ ڈانس کیا۔ کہ چنیا اس کے بازو اور ونیزہ کی اس کی ٹانگیں دبوچنے کی کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ بمشکل اسے ہاتھ جوڑ کر بٹھایا گیا۔ چنیا اس بات پر غصہ ہوتی رہی کہ اس نے ندا آپی

کی شادی پر ڈانس کرنا تھا۔ فارینہ نے اسے ایک اسٹیپ بھی نہیں دیکھنے دیا۔

"ہم تو جھولے لیں گے۔"

فنکشن ختم ہونے کے بعد برگر، کوک اور فروٹ چاٹ ٹھونس کر وہ لوگ فوارہ گراؤنڈ کی طرف لپکیں، جہاں پینگ بھی موجود تھی اور بجلی سے چلنے والے جھولے بھی۔ چنیا نے تو گراؤنڈ پر قدم رکھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مگر وہ اسے بہلا پھسلا کر جھولے تک لے آئی۔ اس کے ہاتھ سے بیگ کھینچ کر زمین پر پٹخا۔ جس میں میک اپ کا سامان، چنیا کا کیمرہ، ونیزہ کے بھائی کی شادی کی مووی، جو وہ چنیا کو دینے کیلئے لائی تھی۔ پاس کھڑے ایک گروپ کو بیگ کا خیال رکھنے کا کہہ کر دونوں نے کھینچ کھانچ کر جب جھولا اوپر چڑھنے کو تیار تھا اور بھاری زنجیر ہٹا لی گئی تھی، اسے بھی سوار کروالیا۔ وہ پہلے تو خاموش ہی رہی۔ جھولا آہستہ آہستہ اوپر اور پھر اوپر سے نیچے آیا اور اگلے چکر میں جو اس نے اسپیڈ پکڑی تو چنیا کے گویا ہفت آسمان گھوم گئے تھے۔ چیخیں مارتی ہائے امی ہائے امی کہتی فارینہ کی گود میں جا سمائی۔ نہ جھولا رکتا تھا نہ اس کی چیخیں اور جھولا چلانے والے دانت نکال نکال کر ہنس رہے تھے۔ بعد میں دونوں نے مل کر خوب اس کا مذاق اڑایا۔ مگر وہ شرمندہ ہونے کی حالت میں نہ تھی۔ چکراتے سر، اتھل پتھل ہوتے دل اور پیلی رنگت لئے گھاس پر ڈھیر ہوگئی۔

"ارے بیگ کہاں گیا؟" ونیزہ کو اچانک خیال آیا۔ نہ بیگ تھا نہ فورتھ ایئر کا گروپ۔

"شاید نورین وغیرہ اپنے ساتھ لے گئی ہوں۔"

ونیزہ نے خیال آرائی کی۔ لیکن جب نورین وغیرہ کو ڈھونڈا گیا تو انہوں نے کہا۔

"گاڈ.....! ہمیں تو خیال ہی نہیں رہا۔"

غصہ تینوں کو بہت آیا تھا مگر یہ غصہ نکالنے کا تو وقت نہیں تھا۔ سارا گراؤنڈ چھان لیا۔ فارینہ فوارے کے پانی میں بھی جھانک آئی۔ ہر کسی سے پوچھ لیا۔ وقت ہو گیا تھا۔ گیٹ بھی کھل گیا۔ باہر رکشے، وین گاڑیاں ٹانگے اکٹھے ہو چکے تھے۔

چنیا کا رنگ فق ہوگیا۔ پچیس ہزار کا "مولٹا" کا کیمرہ تھا۔ سلمان بھائی نے باہر سے بھجوایا تھا۔ تائی اماں تو دے ہی نہیں رہی تھیں کہ اتنی مہنگی چیز ہے۔ مگر وہ ضد کر کے آئی کہ آٹومیٹک کیمرہ ہے۔ رزلٹ بھی بہت اچھا دیتا ہے۔

ونیزہ خود پریشان تھی۔ مووی نجانے کس کے ہاتھ لگ جاتی۔

میڈم سے بات کی انہوں نے تحمل سے سنا، پھر ان کی لاپروائی پر لیکچر دینے لگیں۔ مس طاہرہ کو ترس آیا تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی۔

"جائیں، چوکیداروں سے پتا کریں۔ گیٹ کھل گیا ہے۔ چور بیگ سمیت غائب ہو جائے گا۔" وہ مایوس اور فکر مند چہرے لئے دوبارہ سے گراؤنڈ کی طرف آئیں۔ جہاں کی رونق اب ماند پڑنے لگی تھی۔ تب ہی ایک طرف بیٹھے اپنی چھاتی سے کالے کلوٹے بچے کو چمٹائے دودھ پلاتی مائی نے اشارے سے انہیں پاس بلایا۔ وہ شاید کوئی فقیرنی تھی۔ رش کا فائدہ اٹھا کر انکل (چوکیدار) کی نظر بچا کر اندر گھس آئی تھی۔

"کوئی چیز گم ہوگئی ہے؟" اس کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

چنیا کے آنسو چھلک جانے کو بے تاب ہوگئے۔

"وہ جو جھولے کے اس طرف کالی چادر نہیں پڑی۔ اسے اٹھا کر نیچے دیکھو۔"

ان کے بتانے پر اس نے راز دارانہ انداز میں بتایا تھا۔ انہوں نے لپک کر چادر اٹھائی۔ نیچے بلیک لیدر کا بیگ پڑا تھا۔ انہوں نے تیزی سے کھول کر دیکھا۔ ہر چیز اندر موجود تھی۔ جب بیگ اٹھا کر واپس آئیں تو ونیزہ نے مائی کو پچاس روپے کا نوٹ دیا تھا۔ وہ دعائیں دیتی بچے کو کندھے سے لگائے چلی گئی۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ بیگ کس نے اٹھایا تھا۔ جو بھی تھا، وہ تو بیگ سینے سے لگا کر تایا جان کی گاڑی میں جا گھسی تھی۔

"تم نے گھر جا کر بتایا تھا ونی......؟" چنیا نے پوچھا۔

"نہیں یار! بھائی سے ڈانٹ کھائی تھی۔ ان سب کے لیکچر ایک طرف مگر یہ سبق تو مل گیا کہ اپنی چیزوں کی حفاظت خود کرنی چاہئے۔"

"میں نے مانہ کو بتا دیا تھا اور ان کی ڈانٹ بھی سنی تھی۔"

"ہاں۔ تم سے کہاں رہا جاتا...... یہ دیکھو......" ونیزہ ٹھٹک کر رکی۔ جھولے ابھی تک وہیں ایستادہ تھے اور نچلے بکس میں فارینہ مزے سے چھپی بیٹھی "خواتین ڈائجسٹ" کا مطالعہ کر رہی تھی اور اتنی منہمک تھی کہ ان کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی تھی۔

"بدتمیز......" دونوں نے مل کر زور سے جھولے کو جھٹکا دیا۔

فارینہ کی چیخ نکل گئی۔

"اب مزا آیا......" وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

"شرم تو نہیں آتی......" فارینہ نے گھورا۔

"تمہیں آتی ہے......؟ گھر سے پڑھنے نکلی ہو اور یہاں بیٹھ کر ڈائجسٹ پڑھے جا رہی ہیں۔" ونیزہ نے اس کے ہاتھ سے ڈائجسٹ جھپٹا۔

"ونی! ونی......! بس تھوڑا سا رہ گیا ہے گھر میں تو امی نہیں پڑھنے دیتیں کہ ایگزام قریب

ہیں۔"

"وہ بالکل ٹھیک کرتی ہیں۔" وہ ڈائجسٹ کی ورق گردانی کرنے لگی۔

"تم نے ابھی تک پڑھا نہیں۔ میں نے تو شعاع پورا پڑھا ہے۔" چنیا نے لوہے کے جنگلے میں پاؤں پھنسایا اور اچک کر جھولے میں جا بیٹھی۔ لوہے کی زنجیر قیدیوں سے لے کے اڑنے سے تو رہا۔

"پڑھ لیا ہے۔ بس وہ زیب چوہدری کا ناول آیا ہے۔"

اور لسٹ میں زیب کا نام ڈھونڈنے لگی۔

"کیونکہ اگر تمہیں پتا چلتا تو تم نے فوراً ڈائجسٹ منگوا لینا تھا اور مجھے سلسلے وار ناول پڑھنے تھے اس لیے نہیں منگوایا۔"

ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت انہیں کالج کے بعد ہی ملی تھی اور وہ بھی زیادہ نہیں' صرف اس کا حل انہوں نے یہ ڈھونڈا کہ تینوں ڈائجسٹ خرید لیتی تھیں بعد میں ایک دوسرے لے لیتیں۔ چنیا کی فیورٹ رائٹرز میں ٹاپ دالسٹ زیب چوہدری تھیں اس قدر خوبصورت وشنگ ناول لکھتیں کہ پڑھنے والا متواتر قہقہے لگاتا اور چنیا کی تو عادت تھی جہاں اپنی فیورٹ رائٹر یا افسانہ دیکھتی وہ ڈائجسٹ اپنے قبضے میں کر لیتی۔ پھر ان پر کور چڑھا کر سنبھال کر اپنے بک ریک میں رکھتی' اپنی تمام تر لاپروائی اور لاابالی فطرت کے بعد باوجود یہ کام وہ بہت شوق اور انہماک سے کرتی تھی۔

"کیسا ہے ناول؟"

بہت دلچسپ۔ پتا ہے ناول کا ہیرو......" وہ جوش میں شروع ہونے والی تھی کہ چنیا نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"پلیز...... پلیز سنانا نہیں۔"

"سنا نہیں رہی۔" بس وہ اینڈ میں......"

چنیا نے آگے بڑھ کر اس کا منہ دبایا اور دھمکی آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

"ایک لفظ بھی اور منہ سے نکالا تو گلا دبا دوں گی۔"

"ہونہہ......" وہ کچھ خفا ہو کر جھولے سے باہر نکل آئی۔ چنیا نے اس کی جگہ پر قبضہ جما لیا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ چلو کینٹین پر چلیں۔" ونیزہ نے جولے کو جھٹکا دیا۔

"نہیں۔ تم لوگ یہیں لے آؤ...... پیریڈ تو چھوڑا ہی ہے۔ میں ذرا یہ ناول پڑھ لوں۔"

"یہ فائل ہے چنیا۔" وہ ڈھیٹ بن گئی۔ ہاتھ میں زیب چوہدری کا ناول ہو تو اسے کچھ اور سوجھتا ہی کہاں تھا۔

"اٹھ جا چنیا کی بچی۔"

وہ دونوں جھولا ہلانے لگیں۔

"شاباش...... شاباش...... مزا آرہا ہے۔" وہ آرام سے گویا ہوئی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ باری باری ایک دوسرے کو جھولے دیتے ہیں۔" فارینہ کو یہ آئیڈیا خاصا پسند آیا تھا۔

"پہلے میں......" چنیا نے اندر موجود ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ وہ دونوں جھولے کو حرکت دینے لگیں۔ بلکہ فارینہ باقاعدہ گنگنانے لگی۔

"جھولا جھولوری سکھی ساون آیا۔"

"نومبر کے مہینے میں ساون......" چنیا ہنسنے لگی۔ وہ دونوں کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آگئی تھیں۔ چنیا کو بھی مزا آرہا تھا۔ نجانے کیا ہوا' شرڑ...... شرڑ ڑ...... ڑ کی آواز کے ساتھ زنجیر ایک دم کھلی اور آن واحد میں جھولا ہاتھوں سے نکل کر پرواز کر گیا۔ دوسرے معنوں میں اڑن کھٹولا سکھی کو لے اڑا تھا۔ نہ ان کی کچھ سمجھ میں آیا نہ چنیا کے منہ سے آواز نکلی اور دوسرے پل اس نے آسمان کو دو ہاتھ کے فاصلے پر دیکھا تو چیخوں سے درختوں کی پھننگ پر بیٹھی چیلیں بھی اڑا دیں۔ نیچے والی نجانے کیوں چیخنے لگی تھیں۔ ذرا حواس بحال رکھتیں تو مسئلے کا حل بھی نکل آتا' مگر اوپر جھولا جھولتی سکھی اب ساون کی جگہ ہائے امی' ہائے امی چیخ رہی تھیں۔ نیچے "بچاؤ بچاؤ" کے نعرے لگ رہے تھے۔ آن واحد میں سارا کالج جمع ہو گیا۔ کلرک آفس سے سر نذیر اور سر حبیب بھاگے آگئے۔ کینٹین سے اسلم بھائی' کیاریوں میں سے میرو بابا اور دوسرے کونے سے اماں نور جہاں اپنے بھائی بھر کم وجود کے ساتھ لڑھکتی آئیں۔ طالبات کے ساتھ ساتھ لیکچرار بھی آگئیں۔ پہلے ڈپٹ کر نیچے والی دونوں احمقوں کو خاموش کروایا۔

پھر اسلم بھائی کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جوتا اتارا۔ ادھر ادھر ڈنڈوں پر پاؤں رکھتے اوپر بڑھے۔ ایک جمپ کے ساتھ چنیا والے جھولے کا کنارہ پکڑ کر لٹک گئے۔ جھولا ان کے بوجھ سے نیچے آنے لگا۔ تو سر نذیر نے آگے بڑھ کر زنجیر کو دوبارہ ہک میں پھنسا دیا۔ اندر نیم بے ہوش سکھی کو کھینچ کھانچ باہر نکالا۔ اسلم بھائی بھاگ کر کینٹین سے کوک لے آئے۔ چنیا نے نیم وا آنکھوں سے اپنے اردگرد موجود ہجوم' سکھیوں کے فکرمند چہرے اور ان کے عقب میں جھانکتے پرنسپل کے چہرے کو دیکھا تو مکمل بے ہوش ہو جانا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ فارینہ نے اسلم بھائی کے ہاتھ سے کوک پکڑی اور غٹا غٹ چڑھا گئی۔

* * *

سہ پہر کا ٹھہرا ٹھہرا' خاموش سا وقت تھا۔ موسم بدلنے لگا تھا۔ لوگوں نے لمبی نیند لینا شروع کر
دی تھی۔ مگر کالج سے آ کر یونہی غنودگی سی چھا جاتی تھی۔ کالج سے آ کر کھانا کھانے کے بعد
ساتھ سارے دن کی روئیداد سمانہ کے گوش گزار کر کے ذرا دیر کے صوفے پر نیم دراز ہوئی تو دو گھڑی
کیلئے غافل ہو گئی۔ یونیفارم بھی نہیں بدلا تھا۔

تائی امی حسب معمول بڑبڑائیں۔

مگر سمانہ نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچی نیند سے اٹھ کر وہ کچھ زیادہ ہی
جھنجھلاتی تھی۔ مگر پوسٹ مین کی مخصوص تیز بیل پر وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ ایک پل کو لگا' وہ کسی جھولے
میں بیٹھی ہے تو تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ پھر آنکھیں ملتی پوسٹ مین کو کوستی ننگے پاؤں واپس آئی۔ تو بینا
آپی کے ہاتھ میں خط تھا۔ امی کا انہماک دیدنی تھا جبکہ سمانہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

"کس کا خط ہے؟"

اس کے سوال کا جواب ندارد تھا۔ وہ بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر واش بیسن تک آئی
اور رگڑ رگڑ کر منہ ہاتھ دھونے لگی اور حسب عادت اس عمل میں پانچ دس منٹ تو لگنے ہی تھے۔ بغیر
تولیے کو چھیڑے وہ چارپائی تک آئی اور قریب پڑی کرسی پر دھپ سے بیٹھ کر پاؤں بھی اوپر رکھ
لئے۔

"مانہ! کچھ کھانے کو ملے گا۔"

"سیب لے لو۔" سمانہ نے آہستگی سے کہا۔

"مانہ! پلیز لا دو۔۔۔۔۔" گردن کو ہلکے ہلکے دباتی وہ تساہل سے بولی کہ ایک ہی زاویے پر
لیٹے لیٹے گردن اکڑ گئی تھی۔

سمانہ خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

چنیا نے گردن دباتے ہوئے قدرے حیرت سے تائی امی کی طرف دیکھا جنہوں نے اپنا
مخصوص پسندیدہ جملہ "بڑی بہن سے کام کرواتے شرم نہیں آتی تمہیں" نہیں بولا تھا۔ مگر وہاں
منظر ہی کچھ اور تھا۔ جگمگاتا چہرہ' روشن آنکھیں۔ کچھ یہی عالم بینا آپی کا بھی تھا۔

"کیا ہوا امی؟" اس نے حیرت سے پوچھا پھر ہاتھ بڑھا کر خط اٹھا لیا۔

مگر انہوں نے پہلے ہی بتا دیا۔

"تمہاری امریکہ والی خالہ کا بیٹا آ رہا ہے۔"

"تو اس میں اتنا خوش ہونے والی کیا بات ہے۔" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا اور خط
کھولنے لگی۔ امریکہ والی خالہ نے کبھی بھولے سے بھی انہیں یاد نہ کیا تھا سو اس کے ساتھ جذباتی

وابستگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر خط پڑھتے پڑھتے وہ چونک گئی۔ خالہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ
اگر ان کے بیٹے کو سمانہ پسند آ جائے تو دونوں کی منگنی کر دی جائے۔

"ہرگز نہیں۔۔۔۔۔" اس نے جھنجھلا کر خط واپس پھینکا۔

سمانہ پلیٹ میں سیب اور چھری لے کر آ گئی۔ وہ گود میں پلیٹ رکھ کر سیب کاٹتے ہوئے
بولی۔

"صاف انکار کر دیں امی! بلکہ خط لکھ دیں کہ ان کو یہاں آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم
کوئی شادی وادی نہیں کر رہے مانہ کی۔"

"لو خوامخواہ ہی۔" تائی امی فٹ سے بولیں۔ "پتا بھی ہے کتنی امیر ہے تمہاری خالہ' محل جیسا
گھر وہ بھی امریکہ میں۔ پھیلا ہوا کاروبار' قسمت والوں کو ملتا ہے ایسا رشتہ۔ سمانہ تو عیش کرے
گی۔"

"کوئی عیش نہیں کرے گی امریکہ میں اور ہم مانہ کو اتنی دور بھیج بھی نہیں رہے اور اگر بھیجنا
ہی ہے تو۔۔۔۔۔"

"تمہارے لئے بھی ساتھ ہی رشتہ ڈھونڈیں۔ بے فکر رہو۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی ہے۔" بینا
ہنسی۔

"آپ کو زیادہ شوق ہے نا امریکہ جانے کا تو خود ہی کر لیں دونوں سے شادی۔" پلیٹ پٹخ
کر وہ کمرے میں جا گھسی۔

"پاگل ہے بالکل۔۔۔۔۔" بینا ہنسنے لگی۔

"عادل بھائی آتے ہیں تو بات کرتی ہوں ان سے اور تمہارے ابو سے بھی۔ دیکھیں' وہ کیا
کہتے ہیں۔" تائی امی بینا سے کہہ رہی تھیں پھر خاموش کھڑی سمانہ سے پوچھنے لگیں۔

"تمہاری کیا رائے ہے مانہ!"

"میں۔۔۔۔۔ مجھے کیا پتا۔۔۔۔۔" وہ کچھ گھبرا کر گویا ہوئی' پھر پلٹ گئی۔

"بن ماں کی بچیوں کو ماں بن کر پالا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہو گا۔ خدانخواستہ ذرا
بھی اونچ نیچ ہو گئی تو الزام تو مجھ ہی پر آئے گا۔"

"کوئی اندھا ہی بات کرے گا۔۔۔۔۔ ورنہ سب جانتے ہیں۔ آپ نے کبھی مجھ میں اور سمانہ
وغیرہ میں کوئی فرق نہیں رکھا۔" بینا چنیا کا چھوڑا ہوا سیب کھانے لگی تھی۔

* * *

"کیا امریکہ۔۔۔۔۔؟" ان دونوں نے سنا تو چیخ اٹھیں۔

چنیا نے سر اٹھا کر ناگواری سے انہیں دیکھا۔ جو اپنے سامنے رکھے گرما گرم سموسوں کو بھلائے اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ پاگل ہو۔

''تم پاگل ہو......'' گویا تصدیق چاہی۔

''یہی سمجھ لو......'' اس نے فارینہ کے سامنے سے چٹنی کی پلیٹ اٹھا کر اپنے سموسوں پر ڈالی۔

''احمق! ایسے چانس بار بار نہیں ملتے۔'' ونیزہ جھنجھلائی۔

''بھلے ساری زندگی نہ ملیں۔'' اس نے اطمینان سے چٹنی ڈالی اور سموسوں کا کچومر نکالنے لگی تھی۔

''خوش قسمتی صرف ایک بار دستک دیتی ہے۔''

''ہم دروازہ نہیں کھولیں گے اور ایسی خوش قسمتی...... بھاڑ میں جائے۔''

''خواب دیکھتے ہیں لوگ وہاں جانے کے۔''

''کبھی دیکھا کرتے تھے۔ اب تمہیں تو جیسے پتا ہی نہیں کہ وہاں مسلمان کیسی خوفزدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے انہیں دہشت گرد قرار دے دیتا ہے چاہے......''

''دیکھو بی بی تانیہ......!'' ونیزہ نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔

''ہم تمہارا لیکچر سننا نہیں چاہتے۔ بس سیدھے سیدھے ثمانہ آپی کی شادی وہاں ہونے دو۔''

''خوامخواہ ہونے دوں......'' اس نے چمچ پٹخا...... ''وہ آ کر تو دیکھیں یہاں اور مانہ سے شادی کے بارے میں سوچیں تو سہی۔''

''یہ لڑکی انہیں یہاں سے بھگا کر ہی دم لے گی۔ ابھی آئے تو ہیں نہیں۔ اس نے دشمنی باندھ لی ہے۔ کاش...... کاش کوئی میرے کزن ہوتے۔'' فارینہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''گولی مارو کزن کو...... بریک ختم ہونے میں چند منٹ ہیں۔'' اس نے اعلان کیا۔ خود ہاتھ صاف کر کے کوک کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''تم نے زیب کا ناول پڑھ لیا؟''

''زبردست'' وہ جوش سے بولی۔ ''کل اتنی ٹینشن تھی۔ رات کو ناول پڑھا تو ساری اڑنچھو ہو گئی۔''

''مزے کی بات یہ کہ ناول میں بھی ہیرو باہر سے آتا ہے۔''

''زیب کے ناولوں میں کتنی ڈھیر ساری کزنز ہوتی ہیں۔'' چنیا نے حسرت سے کہا۔

''صرف ہوتی نہیں ''ہوتے'' بھی ہیں۔'' ونیزہ نے لقمہ دیا۔

''نجانے کس دنیا کے ہوتے ہیں۔ بلا کے شوخ' شرارتی' پھر ایک دوسرے پر جان قربان کرنے کو تیار...... جیسے اس ناول میں ہوا' بڑوں کے درمیان اتنی لڑائی کہ گھروں کے درمیان دیوار کھنچ گئی۔ مگر کزنز کا ملنا جلنا کم نہ ہوا۔ ایک ہمارے چچا کے بچے ہیں' ہمہ وقت مقابلہ بازی کو تیار۔ ہر تیسرے دن کسی نہ کسی بات پر لڑائی۔'' فارینہ اپنے جھگڑالو کزنز کے ہاتھوں خاصی تنگ تھی۔

''تو حقیقت میں ایسا تھوڑی ہوتا ہے۔ یہ تو ایک پیغام ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے باوجود یوں بھی رہا جا سکتا ہے۔''

''فاری! تم نے کبھی زیب کا انٹرویو پڑھا ہے؟'' چنیا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بھئی' جب سے میں نے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کئے ہیں ان کا کوئی انٹرویو نہیں پڑھا۔ میرا خیال ہے وہ دیتی ہی نہیں ہیں۔''

''تصویر بھی نہیں دیتیں۔ حالانکہ اتنا جی چاہتا ہے انہیں دیکھنے کو۔''

''خوبصورت تو یقیناً ہوں گی۔ ان کی ہر ہیروئن بے حد حسین ہوتی ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔ حسین نہ ہوں۔ اس لئے ان کی ہیروئن اتنی حسین ہوتی ہو۔'' ونیزہ نے نکتہ نکالا۔

''یقیناً ینگ ہیں اور ڈھیر ساری کنزنز میں رہتی ہیں۔'' چنیا نے خیال آرائی کی۔

''تم ان کا فون نمبر کیوں نہیں لے لیتیں۔'' فارینہ نے کہا۔

''کہاں سے؟''

''آفس فون کر کے۔ ڈائجسٹ پر نمبر تو ہوتے ہی ہیں۔''

''وہ دے دیں گے۔''

''ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔''

''ٹھیک ہے آج ہی ٹرائی کرتی ہوں۔'' چنیا فوراً مان گئی۔ مگر گھر گئی تو پھپھو اور پھوپھا جان چیچہ وطنی سے آئے ہوئے تھے۔ بینا آپی کی شادی کی تاریخ لینے۔ ریحان بھی ساتھ تھے۔ بینا کی شادی ریحان سے بڑے فیضان سے طے تھی۔

''آپ ویک اینڈ کا کہہ کر گئے۔ آج چار دن بعد آئے ہیں۔''

چنیا ان سے لڑنے لگی۔ ریحان کی جاب یہیں تھی۔ وہ قانون دان تھے۔ تحصیلداری کا امتحان پاس کر رکھا تھا مگر ابھی تک سیٹ نہیں ملی تھی۔ روز چیچہ وطنی سے ساہیوال آتے۔ زیادہ دیر ہو جاتی تو یہیں رک جاتے۔ ایک کمرہ مستقل ان ہی کیلئے سیٹ ہوتا۔ سنجیدہ' بردبار اور سادہ سے انسان تھے۔ مگر چنیا اپنے لاڈ ہر کسی سے اٹھوا لیا کرتی تھی۔ ریحان کے ساتھ تو بچپن ہی سے فری

تھی۔ کبھی وہ اسے کالج چھوڑنے جاتے تو وہ چیخنے لگتی۔

''تحصیلدار ہاؤس والی سڑک سے جائیں۔'' اور جب اس سرکاری گھر کے گرد لان میں جھاڑ جھنکاڑ اگا دیکھتی جس کو نجانے کب سے رنگ و روغن نصیب نہیں تھا تو فوراً ان کے کان پر جھک کر کہتی۔

''جب یہ گھر آپ کو ملے گا تو سب سے پہلے اس کا لان ٹھیک کروایئے گا۔ میں روز آیا کروں گی۔''

''تمہیں تو مستقل اپنے پاس رکھوں گا۔'' وہ اسے خوش کرتے۔

''آپ کی بیوی رہنے دے گی۔'' وہ ناک چڑھا کر کہتی۔

''نہیں رہنے دے گی تو کان سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا یا پھر ہم بیوی ہی ایسی ڈھونڈیں گے جو ہماری چنیا کو برداشت کر سکے۔''

ریحان تسلی دیتے تو وہ خوش ہو کر اثبات میں سر ہلاتی اور اس وقت کا انتظار کرتی جب یہ گھر ریحان بھائی کو الاٹ ہوتا۔

''بس زمینوں پر کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔'' ریحان بھائی نے بتایا۔

بینا اور سمانہ کچن میں مصروف تھیں۔ بڑے سب ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ نجانے کون کون سے معاملات ڈسکس ہو رہے تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھی ریحان بھائی سے باتیں کرتی رہی۔ پھر ریحان کو بھی ابو اور تایا ابو نے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی...... بینا کے لبوں پر ایک مستقل مسکراہٹ ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔

''اتنا کیوں خوش ہو رہی ہیں۔ جانا تو آپ کو چیچہ وطنی کے چک 44 میں ہے۔'' چنیا چڑ کر گویا ہوئی۔ جب سے بینا نے سمانہ کو امریکہ بھیجنے کی حمایت کی تھی وہ اس سے خاصا جھگڑنے لگی تھی۔

''اب ہر کسی کی قسمت سمانہ جیسی تو ہوتی نہیں۔ ویسے لاہور میں فیضان کا اپنا فلیٹ ہے اور بقول پھپھو کچھ دنوں کے بعد وہ مجھے وہیں بھجوا دیں گی۔'' بینا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

وہ منہ بنا کر باہر نکل گئی' کچھ دیر ادھر ادھر گھومتی رہی۔ پھر یاد آیا تو ڈائجسٹ میں نمبر دیکھ کر نمبر ملانے لگی۔ مگر مدیرہ نے اس کی لاکھ منتوں کے باوجود اسے زیب کا نمبر دینے سے انکار کر دیا تھا۔

''آپ انہیں بذریعہ ڈائجسٹ خط لکھ دیں۔ پھر اگر وہ چاہیں تو آپ کو نمبر دے دیں گی۔ یوں ہم کسی کا نمبر نہیں دے سکتے۔''

اس نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔

* * *

''ہیں! بینا آپی کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔'' وہ دونوں اچھل ہی تو پڑیں۔

''تو اور کیا۔ دھڑا دھڑ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ پھپھو تو پیسے دے گئی ہیں کہ بری کیلئے جوڑے بینا کی پسند کے خرید لو۔ آج بینا آپی کو ساتھ لے کر زیور کا آرڈر دینے جائیں گی۔''

وہ نچلی سیڑھی پر ٹانگیں پھیلائے جو گر چڑھائے پاؤں جھلانے میں مصروف تھی۔ کبھی کبھی جھک کر گھاس کا تنکا توڑ کر اس کی پتیاں نوچنے لگتی۔ چھوٹی چھوٹی دو چوٹیوں میں بھالو کی شکل کے پنک ہیر کیچ لگے تھے۔ پنک دوپٹہ' سیکنڈ ایئر کی علامت گلے میں مفلر کی طرح ڈالا تھا۔ شاہد آفریدی کے کور والی فائل اور بھالو کی شیپ کا بیگ لاپروائی سے اوپر والی سیڑھی پر رکھا تھا' بالکل اسی حلیے میں فارینہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ادھر سے ادھر چکرا رہی تھی۔ کبھی کبھی ونیزہ کے پاس رک کر بغور اس کی ادھوری تصویر دیکھنے لگتی۔ جو ایزل لگائے کالج کے ایک گراؤنڈ میں آخری کونے میں ایستادہ اک خزاں رسیدہ قدیم درخت کو پینٹ کرنے میں مصروف تھی۔ جس کے نیچے ایک گدھے کا بچہ گھاس پر ادھر ادھر منہ مار رہا تھا۔

''تم نے تو شادی پر ڈانس بھی کرنا تھا۔'' ونیزہ نے براؤن رنگ نکالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں تو اور کیا۔ تم کسی دن گھر آنا۔ گانا بھی سلیکٹ کریں گے اور مجھے اسٹیپ بھی سکھا دینا۔''

جب سے اس نے ونیزہ کو اپنے بھائی کی شادی میں ڈانس کرتے دیکھا تھا اس کے پیچھے پڑی تھی کہ اسے بھی ڈانس سکھائے۔

ان دونوں کا پیریڈ فری تھا۔ ونیزہ کو اپنی اسائمنٹ مکمل کرنا تھی۔ سو فرصت سے بیٹھی مہندی کے فنکشن کو ڈسکس کرتی رہیں۔ ونیزہ ساتھ ساتھ پینٹ کرتی رہی تھی۔ اس کا درخت اب اپنے خدوخال واضح کر رہا تھا۔

چنیا کا ارادہ مہندی کے فنکشن میں پائجامے کے ساتھ شارٹ شرٹ سلوانے کا تھا۔ مگر ونیزہ کے بقول اس لم ڈھینگ وجود پر ایسا ڈریس اور اس پر ڈانس اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ ونیزہ کا نقشہ ایسا مضحکہ خیز تھا کہ اس نے فوراً یہ ڈریس ویسے کیلئے اٹھا رکھا۔

''ارے...... تم نے وہ کل ڈائجسٹ کے آفس فون کیا تھا۔'' اس ساری گفتگو کے درمیان فارینہ کو اچانک خیال آیا تھا۔

''ہاں کیا تھا مگر انہوں نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ کہنے لگیں ڈائجسٹ کی معرفت خط لکھ

دیں جیسے پہنچا ہی دیں گی۔" چنیا منہ بنا کر گویا ہوئی۔

"ارے تو لکھتے ہیں۔ کیا پتا' پہنچ ہی جائے۔" فارینہ نے کہا۔ تو ونیزہ نے بھی تائید

"چلو ٹھیک ہے۔" چنیا نے فوراً فائل گھٹنوں پر رکھی۔ اس میں سے ایک صاف صفحہ بال پوائنٹ ہاتھ میں پکڑا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"اوپر کیا لکھوں؟"

"پیاری زیب!" فارینہ نے کہا اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"اپنی سہیلی کو خط نہیں لکھ رہی ہو۔ لکھو...... محترمہ زیب چوہدری صاحبہ" ونیزہ نے ٹوک کر کہا۔

"اتنے فارمل الفاظ۔ ہم تو غالب کے اسٹائل میں خط لکھیں گے۔"

فارینہ نے ایک چھوٹا سا کنکر اٹھا کر تاک کر گدھے کے سر پر دے مارا' جواب عین ان کے سامنے آ کر گھاس چرنے لگا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ناگواری سے اس کو دیکھا جس نے اس کی محویت میں خلل ڈال دیا تھا۔ جواب اس کے کندھے پر جھکی خط لکھوا رہی تھی۔ ہر کسی کی اپنی اپنی اور اپنی بات تھی۔ خاصے شور شرابے میں خط لکھا جا رہا تھا۔ بیل کب کی ہو گئی تھی۔ پلے گراؤنڈ میں جو اِکا دُکا لڑکیاں تھیں' وہ بھی پیریڈ لینے چلی گئیں۔

"بھاڑ میں جاؤ' تم جو مرضی لکھو۔"

چوتھی بار فرینہ کی بات رد ہوئی تو وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہوئی اور سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔ ہاتھ میں پکڑا "وٹا" بے چارے گدھے کو دے مارا۔ وہ گدھا کچھ زیادہ بے چارا بھی نہ تھا۔ کب سے اس کے "وٹے" برداشت کر رہا تھا۔ تیورا کر لپکا۔ فارینہ کی آنکھوں میں امڈ آنے والا خوف ایک لمحے کا تھا۔ (کب خبر تھی ایسا بدھو اور بے چارا سا گدھا بدلہ لینے پر اتر آئے گا) دوسرے ہی پل اس نے ایک لمبی چیخ سکھیوں کو خبردار کرنے کیلئے ماری تھی۔ چنیا کے ہاتھ سے فائل اور ونیزہ کے ہاتھ سے رنگ چھوٹے۔ ایک حیرت انگیز منظر ان کے سامنے تھا۔ فارینہ کے ہاتھ میں اس کا جوتا صلح کے پرچم کی طرح لہرا رہا تھا اور جوتا ندارد۔ گدھے کی رفتار تیز تھی اور فارینہ کی تیز تر۔ دونوں گویا اولمپک میں حصہ لے رہے تھے۔ چنیا اور ونیزہ نے بھی ان کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔

"بچاؤ...... بچاؤ اور پکڑو...... پکڑو" کے نعروں سے سارا کالج گونج رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس نے گدھے کو۔ سامنے جو لڑکی بھی آتی' ایک لمحے کو ساکت رہ جاتی۔ آنکھیں پھٹی پھٹی۔ دوسرے پل وہ آگے آگے دوڑنا شروع کر دیتی۔ مگر گدھے کو سوائے فارینہ کے اور کسی کے ساتھ کوئی سروکار نہ تھا۔ فارینہ نے لانگ جمپ کا مظاہرہ کیا۔ اور لان کی باڑ پھلانگ گئی۔ اس کا

مڑ جانے والا پاؤں سیدھا ہی کر رہی تھی جب گدھے صاحب آرام سے ذرا سا مڑ کر لان کے دروازے سے اندر داخل ہو کر اس کے سر پر آ موجود ہوئے۔ وہ دوبارہ لان سے باہر تھی۔ پلے گراؤنڈ کرش ہال' کلرکوں کا آفس عبور کر کے وہ فوارہ گراؤنڈ میں پہنچی۔ تب ملازمین کی فوج ادھر ادھر سے نمودار ہوئی۔

فارینہ بے دم ہو کر فوارے کے پاس گری اور زار و قطار رونے لگی۔ کینٹین سے شاید اسلم بھائی نے بھی منظر دیکھا تھا۔ تب ہی کوک ہاتھ میں لئے مسکراہٹوں پر قابو پاتے نمودار ہوئے تھے۔ اگلے کئی دنوں تک فارینہ اور گدھے کو کالج میں گفتگو کا موضوع بنا تھا۔

* * *

کتاب گھٹنوں پر رکھے سیڑھی پر بیٹھی کینو چھیل چھیل کر کھاتے ہوئے وہ ریحان بھائی کو فارینہ اور گدھے کا قصہ سنا رہی تھی بلکہ سنا زیادہ رہی تھی' کھا کم رہی تھی۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ تمہارے کالج میں گدھا کیا کر رہا تھا۔"

دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر انگلیوں پر ٹھوڑی جمائے ان کی توجہ پوری کی پوری کہیں اور تھی۔ سوال تو محض چنیا کو مصروف رکھنے کیلئے کیا گیا تھا۔ پورے صحن میں دھوپ پھیلی تھی۔ نئے نکور لحافوں میں روئی بھروائی گئی تھی۔ شنیل کے کور ایک طرف پڑے تھے۔ یہ بینا کے جہیز کے لحاف تھے۔ جس پر کور چڑھا کر ڈورے ڈالنے تھے۔ تائی امی چھیماں اور اس کی بیٹی کو بار بار ٹوک رہی تھیں کہ وہ ٹانکا اتنا بڑا کیوں لگا رہی ہیں۔ بینا اندر کمرے میں ہی تھی۔ اسے تائی امی آج کل یوں بھی کوئی کام نہیں کہتی تھیں۔ سامنہ البتہ ساتھ لگی ہوئی تھی۔ شاید نہا کر نکلی تھی۔ سیاہ سیدھے بال پشت پر بکھرے تھے۔ ریحان کی موجودگی کی وجہ سے اگرچہ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا مگر گھنے بال چہرے کے اطراف میں پھیلے تھے۔ دھلا دھلایا تر و تازہ گلابی چہرہ' جو نجانے دھوپ کی تپش یا کسی کی نگاہوں کے اثر سے تپا تپا سا تھا۔

"ہمارے کالج کی اپنی ذاتی گدھا گاڑی ہے۔"

"اچھا......!" ریحان ہنسے "ماشاء اللہ تمہارا کالج کنوینس کے معاملے میں خاصا خود کفیل ہے۔"

"آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔" مالٹا چھیلتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

"ہرگز نہیں' لیکن اس کے باوجود گدھے کو یہ اجازت تو نہیں دی جا سکتی کہ یوں لڑکیوں کا پیچھا کرے۔"

"نہیں' وہ خاصا شریف گدھا ہے۔ نجانے اس دن اس کو کیا ہو گیا ہے۔"

چنیا کے لہجے میں تشویش سی تھی۔ تب ہی بینا سوپ کا پیالہ لے آئی۔

"اب بند کرو یہ گدھے اور فارینہ کا قصہ اور یہ کتاب کیا نمائش کیلئے رکھی ہے۔ سامنے ایڈمیشن ٹیسٹ سر پر ہیں' پھر روتی ہوئی آ جاؤ گی۔ مجھے فلاں سوال نہیں آتا......" بینا نے اسے ٹھیک ٹھاک ڈانٹا۔ پھر ریحان کے ہاتھ میں پیالہ دیا۔

"اور تم بھی کب سے بیٹھے اس کی فضول باتیں سن رہے ہو۔ ڈانٹ نہیں سکتے۔"

"سب کیا آپ کی طرح ہو جائیں۔"

"کتاب اٹھاؤ اور اندر میرے پاس آؤ۔" بینا نے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا تو وہ آدھا کھایا کینو وہیں چھوڑ کر اندر چلی گئی جو کہ ریحان اٹھا لیا۔

"توبہ ہے لوگ بیماری کا بہانا بنا کر خدمتیں تو کرواتے ہیں مگر پرہیز......" سمانہ نے ان کے ہاتھ سے مالٹا لے لیا۔ وہ وہاں دھاگا لینے آئی تھی۔

"یہ شکوہ تو خدمتیں کرنے والے کریں۔ لوگ تو حال پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔" سوپ میں چمچہ ہلاتے ہوئے وہ متبسم لہجے میں گویا ہوئے پھر بینا سے پوچھنے لگا۔

"کیوں بینا؟"

"ریحان بھائی! بینا تو آپ کی سائیڈ لے گی ہی۔ لیکن مجھ سے یہ شکوہ بے بنیاد ہے۔" سمانہ نے قدرے خفگی سے انہیں دیکھا۔ ریحان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تائی امی نے صبح سے سمانہ ہی کی دوڑیں لگوائی تھیں۔

تب ہی کال بیل بج اٹھی۔

تائی امی کے اشارے پر چھیماں دیکھنے گئی تھی۔

'باجی جی...... امریکہ سے فراز صاحب آئے ہیں۔"

"ہیں......" تائی امی افراتفری میں کھڑی ہوئیں۔

"فراز؟" ریحان نے سوالیہ نظروں سے سمانہ اور بینا کی طرف دیکھا۔

"فرزانہ خالہ کے بیٹے......" بینا نے جواب دیا تھا۔ اتنے میں تائی امی ایک خوبرو لمبے قد والے وجیہہ شخص کا یوں بازو تھامے اندر داخل ہوئیں جیسے اس کے فرار کا خطرہ ہو۔ ریحان پیالہ سمانہ کے ہاتھ میں دے کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحے تعارف میں صرف ہوئے۔ آنے والا بہت سنجیدہ اور کچھ پزل نظر آ رہا تھا۔ ہیلو ہائے سے زیادہ بات نہیں کی۔ تائی امی اسے لے کر اندر چلی گئیں۔ بینا بھی ساتھ تھی۔

"یہ اچانک تمہارے رشتے دار کو پاکستان کیسے یاد آ گیا؟"

انہوں نے مڑ کر سمانہ کی طرف دیکھا۔ اس نے خاموشی سے پیالہ ان کے ہاتھ میں دیا اور کچن میں چلی گئی۔ ریحان نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا' پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ طبیعت خراب تھی۔ دھوپ کی گرمائش رگ و پے میں اتر کر سکون بخشتی۔ وہ خواہش نہ ہونے کے باوجود سوپ پینے لگے کہ بعد میں دوا بھی لینی تھی' تب ہی چنیا دھپ دھپ کرتی آئی اور ان کے قریب سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"بینا سے زیادہ ڈانٹ پڑ گئی ہے؟"

وہ خاموشی سے منہ پھلائے دیوار سے لپٹی آئیوی کی بیل کے زرد ہوتے پتے نوچتی رہی۔

"کیا ہوا چنیا گڑیا؟"

"آپ کو پتا ہے' یہ کیوں آئے ہیں؟" ان کے ہمدردانہ لہجے پر وہ پھٹ پڑی۔

"کون؟"

"فراز صاحب۔"

"مانہ آپی سے شادی کرنے......"

ریحان کا ہاتھ جہاں تھا' وہیں ساکت ہو گیا۔

"تم سے کس نے کہا؟" کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے پوچھا تھا۔

"خود خالہ نے خط لکھا تھا۔ لیکن ایک بات تو طے ہے میں مانہ کو کسی صورت امریکہ نہیں جانے دوں گی۔" وہ مصمم ارادے سے گویا ہوئی۔

"اور اگر سمانہ نے خود ایسا چاہا تو......؟" ریحان کے سوال پر وہ کچھ ٹپٹا کر انہیں دیکھنے لگی۔ پھر الجھ کر بولی۔

"سمانہ ایسا کیوں چاہے گی۔؟"

جواباً ریحان مبہم سا مسکرائے اور سوپ کا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے کر باہر نکل گئے اور رات کو تائی امی فون پر انہیں ڈانٹ رہی تھیں کہ وہ بغیر بتائے گھر واپس کیوں گئے تھے۔

* * *

ایک تو شادی کی تیاریاں' اوپر سے مہمان کی خاطر داریاں' چنیا دیکھ رہی تھی۔ مانہ گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ پھر پھیکے کھانے کھا کھا کر چنیا کے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا تھا۔ مرچ کا تو کھانوں کے پاس سے بھی گزر نہ ہوا تھا۔ اوپر سے موصوف خاصے نازک مزاج اور بے تکلف واقع ہوئے تھے۔ چند دنوں میں کھل کر سامنے آ گئے۔ ہر روز ایک نئی فرمائش گویا سمانہ کی کوکنگ چیک ہو رہی تھی۔ پہلے دن ہی شام کو کچن میں آ کر سمانہ سے پوچھنے لگے۔

''تمہیں اٹالین کھانے بنانے آتے ہیں۔''

''بنانا تو درکنار۔ میں نے تو ان کے نام بھی نہیں سنے۔'' وہ پہلے سٹپٹائی۔ پھر صاف گوئی سے بولی تھی۔

''چائنیز۔''

''کسی حد تک بنالیتی ہوں۔''

''پاکستانی......''

''اس میں تو خیر ایکسپرٹ ہے۔'' بینا نے لقمہ دیا۔ پتا نہیں مطمئن ہوئے یا نہیں۔ بس سر ہلا دیا تھا۔ پھر کمرے کی باری آئی۔ جس میں بہت سی تبدیلیاں کروائی گئیں۔ اگلے دن وہ کچن میں گھسے سانہ کو اٹالین ڈش بنانا سکھا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ فرمائشوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ دہی بڑے بنتے یا چکن کڑھائی' سب مرچ مسالوں کے بغیر ہوتا۔ اب تو تائی امی بھی بیزار ہوگئی تھیں۔

''ارے اماں باوا تو یہیں سے گئے تھے۔ یہ اپنے آپ کو انگریز کی اولاد سمجھتا ہے۔'' زیادہ غصہ تو اس بات پر آتا جب انہیں صاف تولیے پر بھی داغ نظر آجاتے۔ ایک دن بولے۔

''آپ پانی بوائل کر کے استعمال کیا کریں۔''

سادگی میں کہا گیا جملہ ان کیلئے مصیبت بن گیا۔ اب ہر صبح پانی کا پتیلا ابال کر ٹھنڈا کرنا اور پھر کولر میں بھرنا۔

''ارے'' چک میں میٹھا پانی نہیں ملتا تھا۔ آدھی عمر اس کی ماں نہر سے چلو بھر بھر پانی پیتی رہی۔ اب یہ آیا ہے ڈاکٹری پڑھانے۔ بے چاری بچی کو ہلکان کر چھوڑا ہے۔ میں کہتی ہوں کل کو مہمان آنا شروع ہوں گے تو میں کیا دیگ چڑھایا کروں گی پانی ابالنے کو......'' وہ کلس کر کہتیں۔

''آپ ان کیلئے منرل واٹر منگوالیا کریں۔'' چنیا نے مشورہ دیا جو انہیں خاصا پسند آیا۔ مگر منرل واٹر کی بوتل دیکھ کر وہ خاصے خفا ہوئے تھے۔

''صحت کی بات آپ لوگوں کو اچھی نہیں لگتی۔''

''ارے میاں! ہم پچاس سالوں سے یہی پانی پی رہے ہیں اور اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

وہ کچھ بیزاری سے گویا ہوئیں تو موصوف پریشان ہوگئے۔

''آپ کو شاید میری بات اچھی نہیں لگی۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی دخل اندازی کرنے لگا ہوں۔''

''ارے نہیں بیٹا! یہ بات نہیں......'' تائی امی کچھ گھبرا گئیں۔

''نہیں۔ یہی بات ہے۔ آئی ایم سوری۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''بڑی جلدی عقل آگئی۔'' بینا کارڈ میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔

''بات یہ نہیں ہے فراز بیٹا۔ دراصل شادی والا گھر ہے۔ کام بہت بڑھ گیا ہے اور اکیلی سانہ اب کیا کیا کرے۔'' انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

''ہاں۔ مجھے خیال رکھنا چاہئے تھا۔''

فراز نے آہستگی سے کہتے ہوئے سانہ کو دیکھا' جو سارے کام سمیٹ کر اب مشین سنبھالے بیٹھی تھی۔ بینا اس کے پاس مختلف میگزین کھولے بیٹھی تھی۔ کپڑا پھیلا ہوا تھا۔ قینچی ہاتھ میں تھی اور زور و شور سے ڈیزائن کی باریکیوں پر بحث کی جا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔

''کہیں مائنڈ تو نہیں کر گئے۔'' سانہ نے انہیں جاتے دیکھ کر تشویش سے پوچھا تھا۔

''ہو بھی سکتا ہے......'' بینا نے لاپروائی سے کہا تھا۔

شام کو ریحان آئے تھے۔ چنیا ان کے کان میں گھسی نمک مرچ لگا کر سب کچھ بتاتی رہی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ مبہم سی مسکراہٹ لبوں پر تھی۔

''رات کو تو یہیں رکیں گے نا......'' چنیا نے پوچھا تھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر فراز کو دیکھنے لگے۔ جو بڑی حیرت سے بھاری بھاری زیور دیکھ رہے تھے اور بینا سے پوچھ رہے تھے۔ وہ اتنا سب کچھ کیسے پہنے گی۔

چنیا اٹھ کر کچن میں آگئی۔ سانہ کھانا پکا رہی تھی۔ مرچوں کے استعمال میں اب بھی کنجوسی تھی۔ چنیا چڑ گئی۔ مرچوں کا ڈبہ اٹھایا اور دو دو چمچ بھر کر ہر سالن اور بریانی کے مسالے میں ڈال دیا۔ سانہ ''ارے ارے'' ہی کرتی رہ گئی۔

''یہ کیا کیا تم نے؟''

''ہم سے نہیں کھائے جاتے یہ پھیکے کھانے۔'' وہ بگڑ کر بولی۔

''اب فراز بھائی کیسے کھائیں گے۔''

''کھالیں گے۔ ہم نے بھی تو ان کی خاطر اتنے بدمزہ کھانے کھائے ہیں اور آج تو ریحان بھائی بھی یہیں کھانا کھائیں گے۔''

''چنیا! وہ مہمان ہیں......''

''ایک دو دن رہیں تو مہمان۔ یہ تو نجانے کب تک رہیں گے۔''

تب ہی تائی امی نے کھانا لگانے کیلئے آواز دے دی۔ اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چنیا کو صلواتیں سناتے ہوئے کھانا لگا دیا۔ سب نے ہی مزے لے لے کر کھایا۔ اگر چہ پہلے بھی سب اپنی اپنی پلیٹ میں حسب ضرورت نمک مرچ کی مقدار بڑھا لیتے تھے مگر وہ ذائقہ تو نہ بنتا تھا۔ سمانہ نے تو نظر اٹھا کر بھی فراز کو نہ دیکھا تھا' جن کی ناک اور آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ حالانکہ بینا اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بار بار اس کا پاؤں دبا رہی تھی۔ فراز نے تھوڑا سا کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ریحان نے ان کے سامنے سویٹ ڈش رکھ دی۔ انہوں نے بھی پلیٹ بھر کر رس ملائی نکالی۔ تب جلتے ہوئے منہ کو قرار آیا۔ مانہ تو فوراً ہی چائے بنانے اٹھ گئی تھی۔

تایا اور ابو آپس میں کچھ معاملات ڈسکس کر رہے تھے۔ تائی امی ریحان سے ادھر کی تیاریوں کے بارے میں دریافت کرنے لگیں۔ چنیا نے اٹھ کر ٹی وی کھول دیا۔ اس کا فیورٹ ڈرامہ آنا تھا۔ فراز کچھ لمحے بیزاری سے دیکھتے رہے۔ گھر میں ڈش تھی نہ کیبل۔ وہی دو تین بور سے پاکستانی چینل۔ وہ بیزار سے اٹھ گئے۔

''میں کافی لوں گا۔'' انہوں نے کچن کے دروازے میں رک کر کہا۔ سمانہ نے بغیر ان کی طرف دیکھے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں اپنے کمرے میں ہوں۔''

سب کو چائے دینے کے بعد وہ کافی کا مگ لئے ان کے کمرے میں آئی تو وہ کسی کتاب کی ورق گردانی میں مشغول تھے۔

''کافی......!''

انہوں نے چونک کر سر اٹھایا پھر اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔

''کچھ اور تو نہیں چاہئے۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر پوچھنے لگے۔

''یہ کتابیں یہاں کس نے رکھی ہیں؟''

''میں نے یونہی رکھ دی تھیں۔ شاید آپ کو لٹریچر سے کوئی دلچسپی ہو۔''

''اچھی لوکیشن ہے۔ لگتا ہے تمہیں لٹریچر سے خاصی دلچسپی ہے اور خاص طور پر انگلش لٹریچر میں۔''

''انگریزی' اردو دونوں میں ہی مگر ماسٹرز انگلش لٹریچر میں کیا ہے۔ اب سوچ رہی ہوں اردو ادب میں بھی کرلوں۔''

''ریئلی۔'' انہوں نے قدرے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تم نے

ماسٹرز کیا ہے' وہ بھی انگلش لٹریچر میں۔''

''آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔'' سمانہ کو ان کی حیرت پر حیرت ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ جانتے ہیں۔

''تمہیں ہر دم کچن میں دیکھ کر تو یہی خیال آتا تھا کہ تم نے ہوم اکنامکس کالج میں تعلیم حاصل کی ہے۔''

سمانہ ہنس دی۔

''وہ الگ بات ہے۔''

''ہاں۔'' فراز نے قدرے غور سے اسے دیکھا۔

''آپ کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''ہاں۔'' انہوں نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے مگ کو دیکھا۔ پھر مسکرائے۔

''آج کھانا اچھا بنا تھا۔'' پھر قدرے رک کر جملے میں اضافہ کیا۔ ''لیکن مرچ کی مقدار آہستہ آہستہ بھی تو بڑھائی جا سکتی تھی۔''

وہ بری طرح خجل ہو گئی۔

''آئی ایم سوری مگر وہ چنیا......''

''اٹس اوکے...... ہو جاتا ہے۔''

انہوں نے بے حد دلچسپی سے اس کے چہرے پر پھیلے شرمندگی کے رنگوں کو دیکھا۔ گھنی خم دار پلکوں اور چہرے پر پھیلی ہلکی سی سرخی کو۔ انہیں پہلی بار لگا' ان کا یہاں آنا بے فائدہ نہیں گیا۔

* * *

خالہ کا فون آیا تو فراز نے اپنی رضامندی بتا دی تھی۔ پھر خالہ کا فون ابو کے پاس آیا تھا۔

''میں نے تو اپنی بچیوں کو بھابی کی گود میں ڈال دیا تھا۔ ان کے بارے میں فیصلہ وہی لوگ کریں گے۔'' ابو نے صاف کہا تھا۔ پھر بند کمرے میں لمبی لمبی بحثیں ہوتی رہیں۔ چنیا سمانہ سے لڑتی۔

''مانہ! تم کہہ دو ناں! تمہیں نہیں کرنی ان سے شادی۔''

''لو خوامخواہ کہہ دوں۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر کہتی اور اپنے کاموں میں مگن رہتی۔ گویا فیصلہ اس کے بارے میں نہیں کسی اور کے بارے میں ہونا ہو۔

تائی امی جو یہی سوچتی تھیں کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ اپنی بیٹی کیلئے رشتہ نکال بھی لیا اور وہ بن ماں کی بچیاں...... ان کی کوئی پرواہ ہی نہیں۔ کیونکہ سمانہ اور بینا ہم عمر تھیں۔ تایا ابو اتنی دور بھیجنے

سے کتراتے تھے مگر فراز میں کوئی ایسا عیب بھی نہیں دیکھتے تھے۔ جسے بنیاد بنا کر رد کر سکیں۔

پھر خالہ کا آخری فون آیا۔

"وہ میری بہن کی نشانیاں ہیں۔ ساری زندگی ان سے دور تڑپتی رہی ہوں۔ آپ کے سامنے ہوتی تو جھولی پھیلا کر قدموں میں بیٹھ جاتی۔ تب تک نہ اٹھتی جب تک میری مراد پوری نہ ہوتی۔ مگر کیا کروں، ہزاروں میل دور بیٹھی ہوں۔"

ان کی سسکتی ہوئی آواز، سب کے دل پسیج گئے۔ تایا ابو کا خیال تھا کہ بینا کی شادی کے موقع پر ان کی منگنی کا اعلان کر دیا جائے۔

* * *

"ٹھیک ٹھاک سردی تھی۔ سب لوگ کھانے کے بعد ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اوپر آ گئیں۔ بلکہ سمانہ کو بینا کھینچ لائی تھی۔ جو آج کل اپنے وزن کے بارے میں خاصی کونشس ہو گئی تھی۔

"مرو تم! اتنی سردی میں قلفی جم جائے گی....." سمانہ کے دانت بجنے لگے تھے۔ اسے تو یوں بھی سردی کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔

"کوئی بات نہیں تھوڑی دیر واک کریں گے تو خود بخود جسم کچھ گرم ہو جائے گا۔" بینا نے لاپروائی سے کہا تھا اور ادھر سے ادھر چکرانے لگی۔

"سمانہ! امریکہ میں زندگی کیسی ہو گی۔" کچھ دیر کے بعد بینا نے پوچھا تھا۔

"مجھے کیا پتا....." اس نے لاپروائی سے جواب دیا اور ادھورے چاند کو دیکھنے لگی۔

"تم خوش تو ہو نا.....؟"

"ہاں۔ ٹھیک ہے....."

"کیا ٹھیک ہے، ڈھنگ سے جواب دو نا!" بینا جھنجلا گئی تو سمانہ ہنس دی۔

"تمہیں پتا تو ہے۔ میں نے قبل از وقت کسی چیز کو سر پر سوار نہیں کیا۔ جب وقت آئے گا اور سر پر پڑے گی تو خود ہی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔"

"چوبیس گھنٹے کچن میں رہ رہ کر تمہارے دماغ میں آٹے دال کا بھاؤ ہی ہو سکتا ہے۔ سخت زہر لگتی ہو ایسی باتیں کرتی۔" بینا ہمیشہ سے اس کی اس عادت سے چڑتی تھی۔

"تو کیا کروں۔ تمہاری طرح میں بھی فراز کی تصویر تکیے کے نیچے رکھ کر سوؤں۔ ہمہ وقت یہ سوچوں کے جب شادی ہو گی تو شوہر کو کس طرح قابو کرنا ہے۔ اس سے اپنی فلاں فلاں فرمائش کس طرح منوانی ہے..... یار! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔"

"تمہیں ضرورت بھی کیا ہے یہ سب کرنے کی۔ چوبیس گھنٹے تو موصوف نظروں کے سامنے ہوتے ہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔ اسی لمحے فراز سب سے اوپر والی سیڑھی پر نمودار ہوئے تھے۔

"لو آ گئے ہیں۔"

"مجھے معلوم تھا، تم لوگ یہیں ہو گے۔" فراز نے قریب آ کر کہا۔ جبکہ سمانہ نیچے جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"کیا آپ ہمیں چند منٹ دیں گی۔" فراز بے حد شائستگی سے بینا سے کہہ رہے تھے۔ "دراصل میں سمانہ کو اپنے ساتھ واک پر لے جانا چاہتا ہوں۔"

"جی....." بینا نے حیران ہو کر سمانہ کو دیکھا۔ پھر مسکراہٹ دبا کر کہنے لگی۔

"آپ کو سمانہ سے کوئی بات کرنی ہے تو یہیں کر لیں۔"

"یہاں واک کا کیا مزا۔ موسم اچھا ہے۔ میرا خیال ہے، باہر چلتے ہیں۔" اب کے وہ براہ راست سمانہ سے مخاطب ہوئے تھے۔

اس نے گڑبڑا کر بینا کو دیکھا۔ اس نے کندھے اچکائے اور مڑ گئی۔

"ارے بینا! رکو، وہ فراز۔ مجھے کچھ کام یاد آ گیا ہے....." وہ بگٹٹ بینا کے پیچھے بھاگی۔

فراز حیرت سے کھڑے دیکھتے ہی رہ گئے۔

"تم انتہائی بدتمیز لڑکی ہو....." سیڑھیوں کے اختتام پر وہ بینا سے لڑنے لگی تھی۔ جبکہ بینا کی ہنسی نہیں تھم رہی تھی۔

"چلی جاتیں اس کے ساتھ واک کرنے....."

"ہاں چلی جاتی اور یہ سب لوگ کیا سوچتے میرے بارے میں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا بھی اور اس کا بھی۔"

"ارے بھئی! کیا ہو گیا۔" ابو باہر نکلے تھے۔

"کچھ نہیں ابو۔" دونوں کھسیا کر کچن میں جا گھسی تھیں۔

* * *

فراز کا التفات اور والہانہ پن۔ ابھی تو منگنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ چاہتے سمانہ کے ساتھ پورا شہر گھوم آئیں۔ سمانہ پہلے تو سٹپٹائی۔ پھر کترانے لگی۔ بات کرتے تو ان کے لہجے کے والہانہ پن کو یکسر نظر انداز کر کے اپنا انداز نارمل اور سادہ رکھتی۔ وہ بھی کیا کرتی ان کے ہاں ایسی بے تکلفی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بینا کی منگنی دو سال رہی۔ فیضان نے کبھی بھولے سے بھی یہاں کا رخ نہیں کیا نہ کبھی فون نہ خط۔ یہاں فراز سب کے سامنے ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتے کہ اس کا

بس نہیں چلتا کہ کہاں منہ چھپائے۔ واک پر ساتھ جانے کی فرمائش کئی بار ہوئی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ٹل گئی۔ سوچا عقلمند کیلئے اشارہ ہی کافی ہے۔

"اگر عقل ہی نہ ہو تو......" بینا اس سچویشن کو انجوائے کرتی' ایک دن کہنے لگے۔

"سانہ! میکڈونلڈ چلیں......"

سانہ کا ضبط جواب دے گیا' مگر تحمل سے ان کی طرف پلٹی۔

"ضرور۔ میں ابھی بینا اور چنیا کو بلاتی ہوں۔"

"ان کو کس لئے؟" اللہ رے معصومیت۔

"ان کے ساتھ جائیں گے۔ کیونکہ اکیلی تو میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکوں گی۔"

"لیکن سانہ! میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ یہاں تو ایک پل نہیں ملتا دل کی بات کہنے کو۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی سر پر سوار رہتا ہے۔" وہ جھنجلائے۔

"یہ تو ممکن نہیں۔" اس نے بھی صاف انکار کردیا۔

"کیوں؟ ہماری منگنی ہونے والی ہے۔"

"منگنی کے بعد ہمارے ہاں زیادہ احتیاط کی جاتی ہے۔ کیونکہ بہت ہی ناپائیدار رشتہ ہوتا ہے۔ خوامخواہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے ساتھ اموشنلی انوالو ہوجائیں اور بعد میں اگر کوئی......"

"تم لوگوں کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟"

"بات اعتبار کی نہیں اصول کی ہے۔ پسند ونا پسند کی ہے' ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

"ہماری منگنی ہونے والی ہے۔ کیا یہ ضروری نہیں ہم لوگ ایک دوسرے کو جان لیں۔" سانہ نے بے حد حیرت سے انہیں دیکھا۔ سارے معاملات طے ہوجانے کے بعد جاننے اور سمجھنے کا مرحلہ آیا تھا۔

"مجھے آپ کو جتنا جاننا تھا جان چکی۔ آپ کو مجھے جتنا سمجھنا ہے' اسی گھر میں رہ کر سمجھ لیجئے۔ میرا آپ سے کوئی پردہ نہیں ہے آپ کے سامنے ہی ہوں۔ لیکن آپ کے ساتھ باہر جانا یا ہوٹلنگ کرنا میں افورڈ نہیں کرسکتی۔"

ٹھوس لہجے میں کہہ کر وہ چلی گئی تھی۔ فراز لب بھینچے نجانے کیا سوچنے لگے تھے۔

* * *

مونگ پھلی کھاتے ہوئے وہ زیب چوہدری کا نیا ناول پڑھنے میں مصروف تھی۔ دھیرے دھیرے مونگ پھلی فراموش کرکے مکمل طور پر ناول میں مگن ہوچکی تھی۔ جب بینا ہاتھ میں سفید

لفافہ لئے اوپر آئی۔

"چنیا! یہ تمہارے نام کوئی خط آیا ہے۔" وہ بے حد حیرت سے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف چنیا کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ زیب کی چلبلی ہیروئن نیا معرکہ انجام دے رہی تھی۔ چنیا کے چہرے پر جوش ہی جوش تھا۔

بینا کے دو تین بار پکارنے پر بھی کوئی جواب نہ پاکر اس نے چنیا کے ہاتھ سے ڈائجسٹ کھینچ لیا۔

"ہائے اللہ! آپی نہیں......" وہ چیخ اٹھی۔

"پہلے اسے کھولو' کس کا خط ہے؟" بینا نے اس کے ہاتھ میں لفافہ دیا۔ تو وہ حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"میرے نام خط؟"

اس نے لفافہ کھولا۔ بینا نے مونگ پھلی کی پلیٹ اٹھالی۔ اندر موجود خط کا متن مختصر مگر جامع تھا۔ وہ جیسے جیسے پڑھتی گئی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔

"آ......آ......" اک تیز چیخ ابھری۔

بینا کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹی۔ یہاں سے وہاں تک مونگ پھلی کے دانے بکھرے۔ اسٹیل کی پلیٹ کسی بیلے ڈانسر کی طرح گول گول گھومتی ریلنگ کے پاس جاکر رکی تھی۔ چنیا نے سرپٹ نیچے کو دوڑ لگائی۔ سیڑھیوں پر فراز تھے۔ دائیں سے بائیں...... بائیں سے دائیں کئی بار ادھر ادھر ہونے کے بعد بھی رستہ نہیں ملا تو فراز نے اسے کندھوں سے تھام کر کھڑا کیا۔ پھر گویا اس افراتفری کی وجہ دریافت کرنا چاہی تھی مگر وہ جھٹ سے آخری دو سیڑھیاں پھلانگ کر سانہ کی طرف دوڑی۔

"سانہ...... سانہ! مجھے زیب چوہدری کا فون نمبر مل گیا ہے۔"

"ارے یہ زیب کون ہے......؟" تائی امی ہولتے ہوئے عقب سے نمودار ہوئیں۔ وہ تو باتھ روم میں جارہی تھیں۔ اسے یوں بھاگتے دیکھا تو لپکتی ہوئی پیچھے آئیں۔

"تائی امی! آپ کو نہیں پتا۔ بہت بڑی لکھنے والی ہیں۔" وہ جوش میں بولی۔ سانہ اس کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھنے لگی۔

"کیا عمر ہوگی اس کی؟" تائی امی نے سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

"امی! عمر نہیں بڑی' لکھتی بہت بڑا ہیں۔"

"اچھا بڑا بڑا لکھتی ہے۔ کاغذ کا تو ضائع ہی ہوا ناں۔ مگر تم کیوں اتنا چیخ رہی تھیں۔ جیسے

خدانخواستہ کرنٹ لگ گیا ہو۔" وہ اسے لتاڑنے لگیں۔ اس نے نظر انداز کر کے تیزی سے ریسیور اٹھا کر وینزہ کا نمبر ملایا اور جوش میں یہ خبر سنائی۔ دوسری طرف وینزہ کے ڈیڈی نے تحمل سے پوری سنی۔ پھر اسے بتایا کہ وینزہ گھر پر نہیں ہے۔ وہ شرمندہ ہوگئی۔ پھر فارینہ کو کیا تو پہلے تصدیق چاہی۔

"چنیا کی بچی! اب مجھے بھی نہیں پہچانتی ہو۔"

"زیب کا نمبر مل گیا ہے اور مزے کی بات بتاؤں، وہ ہمارے شہر میں آئی ہوئی ہیں۔"

"ہائے سچ۔"

"ہاں۔ انہوں نے مجھے خط لکھا ہے خود۔ ٹھہرو، میں تمہیں ان کا خط سناتی ہوں۔" اس نے سمانہ کے ہاتھ سے خط لے کر حرف حرف سنانا شروع کیا۔ تائی امی سر جھٹک کر باتھ روم میں چلی گئیں۔ سمانہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"مجھے بھی فون نمبر لکھواؤ......"

"ابھی نہیں۔ پہلے میں بات کرلوں۔" اس نے آرام سے کہہ کر رابطہ منقطع کیا۔ پھر سمانہ سے پوچھنے لگی۔

"مانہ! ابھی فون کرلوں......"

"کرلو بھئی......" وہ ہنس دی۔ جانتی تھی کرے گی تو ابھی۔ بس اپنی جھجک مٹانے کو پوچھ رہی ہے۔

چنیا نے بہت دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر ملایا۔ دوسری طرف جب تک بیل جاتی رہی وہ جملے مرتب کرتی رہی۔

"ہیلو۔" مردانہ آواز ابھری۔

"زیب، زیب چوہدری سے بات کرنا ہے۔" تھوک نگلتے ہوئے کہا گیا۔

"تو کیجئے۔"

وہ کچھ لمحے منتظر رہی کہ شاید اسے بلایا گیا ہے۔ مگر دوسری طرف مکمل خاموش چھائی تھی۔ وہ کچھ جھجک سی گئی۔

"پلیز انہیں بلا دیں۔"

"یعنی میں انہیں بلانے کیلئے طارق بن زیاد کالونی جاؤں۔" بے حد حیرت سے پوچھا گیا۔

"کیا مطلب وہ گھر پر نہیں ہیں۔" چنیا کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"نہیں۔"

"واپس کب آئیں گی۔"

"کل شام کو۔"

"اچھا وہ آئیں تو ان سے کہہ دیجئے گا کہ تانیہ کا فون آیا تھا۔"

"تانیہ...... ارے آپ تانیہ بات کر رہی ہیں۔"

دوسری طرف سے جس انداز میں کہا گیا وہ سٹپٹا گئی۔

"ڈریں نہیں۔ زیب اپنے خط ہر کسی کو نہیں پڑھواتیں۔ مگر میری بات اور ہے۔ میں ان کا بہت ہی خاص الخاص سیکرٹری سمجھ لیں مجھے...... اس لئے مجھے ہر بات کی خبر رہتی ہے۔ آپ ان سے ملنے گھر کیوں نہیں آ جاتیں۔"

"جی......"

"ایڈریس میں سمجھا دیتا ہوں۔ آپ کہاں رہتی ہیں۔"

چنیا اپنا ایڈریس بتاتے بتاتے ایک دم چپ ہوئی۔ ایک اجنبی کو کیسے ایڈریس بتا دیتی۔ جبکہ دوسری طرف اس کا ایڈریس فرفر بولا گیا۔

چنیا کچھ گھبرا گئی۔

"اب یہ بتائیں، آپ کے گھر کے سامنے کیا ہے۔"

"سڑک ہے۔"

"اس سے آگے؟" وہ ہنسا۔

"ابرار انکل کا گھر ہے۔" چنیا نے کچھ حیرت سے بتایا۔

"ہاں، وہاں سے کچھ آگے چلتے آئیں تو لین کا آخری بنگلہ کس کا ہے؟"

"افتخار صاحب کا ہے۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ الجھ گئی۔

"تو وہیں چلی آیئے۔ زیب سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ چلائی۔

"یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"آپ مذاق کر رہے ہیں؟......"

"میرا اور آپ کا مذاق کا رشتہ ہے محترمہ......؟"

دوسری طرف سے خاصی سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

"وہ تو زیب نے آپ کا خط پڑھنے کے بعد کہا تھا کہ میں اس لڑکی سے ملنا پسند کروں گی تو میں نے آپ کو ایڈریس سمجھا دیا۔ ورنہ وہ ہر کسی سے نہیں ملتی ہیں۔

"یاہو......" اس نے ریسیور رکھ کر نعرہ لگایا تھا۔

* * *

کب سے وہ تائی امی سے کہہ رہی تھی کہ اسے کچھ پیسے چاہئیں۔

"آخر تجھے کرنا کیا ہے پیسوں کا۔ چنیا! تو بہت فضول خرچ ہوتی جا رہی ہے۔ مہینہ ابھی آدھا نہیں گزرتا کہ پیسے ختم ہوجاتے ہیں۔ کہوں گی تیرے باپ سے کہ روز کے روز دیا کرے۔" وہ زچ ہوکر بولے گئیں۔

"تائی امی! کہہ دیجئے گا مگر ابھی تو دیں نا سو روپیہ۔" اس نے لاڈ سے گلے میں باہیں ڈالیں۔ جتنا ان سے لڑتی تھی' پیار بھی اتنا ہی کرتی تھی۔ لڑ جھگڑ کر ہر چیز اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی۔ انہیں اچھا لگتا۔ خوب تنگ کرنے کے بعد ہی دیتیں۔

"کیا کرنا ہے تجھے سو روپے کا۔"

"زیب کیلئے پھول لے کر جانے ہیں۔" وہ ان کے کان میں چلائی۔ جواباً انہوں نے دھمو کا سر پر جڑا تھا۔

"ایک تو میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان موئے پھولوں میں رکھا کیا ہے۔ ایک دن میں مرجھا کر پیسے برباد۔ بندے کو لے جانا ہی ہے تو کوئی پھل فروٹ لے جائے اور کوئی تحفہ لے جائے۔ یادگار تو رہے گا۔ یہ پھول......نری پیسے کی بربادی۔

"تائی امی! ابھی فارینہ اور ونیزہ آجائیں گی۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"لو ان کو بھی بلا رکھا ہے۔"

"میں فراز بھائی سے مانگ لوں گی۔" اس نے گویا دھمکی دی۔

"اے ہے۔ دماغ چل گیا ہے۔" انہوں نے گھبرا کر فراز کو دیکھا جو چارپائی پر نیم دراز بڑی فراغت سے نرم گرم دھوپ کا مزا لے رہے تھے۔ اگرچہ چہرے کے تاثرات میں بیزاری ا اکتاہٹ نمایاں تھی۔

"پھر میں جا رہی ہوں۔" چنیا کھڑی ہوئی۔

تائی امی نے جھنجھلا کر اس کا بازو کھینچا۔ سو روپیہ بٹوے سے نکال کر اسے تھمایا اور زیر لب بڑبڑائیں۔

"جی تو چاہتا ہے ایک لگاؤں......"

"لگالیں......" چنیا نے سعادت مندی سے سر جھکایا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بدتمیز......"

"لیکن پھول لینے میں جاؤں کس کے ساتھ؟" نیا مسئلہ درپیش ہوا۔

"مجھے نہیں پتا......"

"فراز بھائی سے کہہ دیں......" چنیا نے جھک کر کان میں سرگوشی کی۔ انہوں نے کچھ سوچا پھر فراز کو آواز دی۔ وہ گردن موڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔

"فراز بیٹا! فارغ ہو تو ذرا بچی کو پھولوں کی دکان تک لے جاؤ۔"

"بائیک کی چابی لے آؤ......" وہ گویا تیار بیٹھے تھے۔

چنیا بھاگ کر چابی لے آئی۔ کندھوں پر پھیلا دوپٹہ سر پر بھی اوڑھ لیا۔

"پھول کسے دینا ہیں؟" بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"میری فیورٹ رائٹر آج کل ساہیوال آئی ہیں۔ ان سے ملنے جانا ہے۔"

فراز نے سر اٹھا کر اس کے معصوم چہرے پر پھیلے جوش و شوق کے رنگوں کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔

"کیا لکھتی ہیں تمہاری یہ فیورٹ رائٹر......؟"

"بہت شوخ شرارتی اور زندگی سے بھرپور ناول لکھتی ہیں۔ پڑھ کر مزا آجاتا ہے۔" اچک کر ان کے پیچھے بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"یہ شوخ شرارتی اور زندگی سے بھرپور ناول تمہاری بہن نہیں پڑھتیں۔" بائیک ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ چنیا نے ان کا کندھا دبوچ لیا۔

"کون سمانہ؟"

"ہاں......"

"پڑھتی تو ہے مگر اسے سنجیدہ لکھنے والے زیادہ پسند ہیں۔ وہ منیزہ سید اور فریدہ اشفاق کو زیادہ شوق سے پڑھتی ہے۔ ویسے وہ ڈائجسٹ کم ہی پڑھتی ہے۔ اس کے پاس تو کتابیں ہی ڈھیر ساری ہیں۔"

"ہاں۔ خاصی قدیم روح سمائی ہوئی ہے تمہاری بہن میں۔"

"وہ سنجیدہ مزاج ہیں مگر آپ انہیں قدیم تو نہیں کہہ سکتے۔" وہ خفا ہوئی۔

"کبھی ریستوران آئے ہو تم لوگ؟" انہوں نے موضوع بدلا۔ اس وقت وہ چائنا ٹاؤن کے سامنے سے گزرے تھے۔

"میکڈونلڈ اور چائنا ٹاؤن تو کئی بار آئے ہیں۔ جب ریحان بھائی نے تحصیلداری کا امتحان پاس کیا تھا تو "فائیو ویز" میں لنچ بھی کروایا تھا۔"

"سوپ پیوگی؟"

"اس وقت نہیں، پھر آئیں گے تائی امی سے پوچھ کر۔"

"ہوٹلنگ کرنا پسند ہے تمہیں؟" چنیا کے بات کرنے کے انداز میں بے ساختگی و معصومیت
تھی۔ وہ یونہی بات بڑھانے کو چھوٹے چھوٹے سوال کرنے لگے۔ اس سے قبل کبھی بات کرنے
موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ کتراتی تھی ان سے۔

"بہت مگر کم کم ہی موقع ملتا ہے۔ ابو تو کسی بات سے منع نہیں کرتے۔ مگر تایا ابو کو نہیں پسند
مگر میری بات وہ نہیں ٹالتے۔ میں تو اکثر ان سے ایسی باتیں بھی منوا لیتی ہوں۔" چنیا نے فخریہ
لہجے میں بتایا۔

"ہاں۔ انسان چاہے تو بہت کچھ منوا سکتا ہے۔ لیکن اگر خود ہی نہ چاہے تو......"

وہ زیر لب بڑبڑائے تھے۔ چنیا کی سمجھ میں نہ آیا تو خاموش رہی۔ بائیک صدر میں مشہور
فلاور شاپ کے سامنے جا رکی۔ پچھلے چند دنوں میں وہ سارا شہر گھوم چکے تھے۔ اکثر راستے از بر
ہو گئے تھے۔ چنیا بہت دیر تک مختلف گلدستے دیکھتی رہی۔ مگر کوئی پسند ہی نہ آ رہا تھا۔ پھر دکان میں
گھس کر فریزر کھلوا لیا۔ ایک ایک پھول چن چن کر نکلوایا۔ بڑا سا بوکے پیک ہوا تو پیسے کم پڑ گئے۔
اس نے بے تکلفی سے فراز سے مانگ لئے۔ سمانہ کے رک رک کے جھجکنے اور تکلف لئے ہوئے انداز
کے برعکس چنیا کے انداز میں بہت اپنائیت محسوس ہوئی تھی انہیں۔ وہ اس کی ایکسائٹمنٹ پ
مسکراتے رہے۔

گھر پہنچے تو فارینہ اور ونیزہ پہنچ چکی تھیں۔ ونیزہ اک بڑا سا چاکلیٹ کیک خود بیک کر کے
لائی تھی۔ چنیا کے ہاتھ میں بوکے دیکھ کر فارینہ روہانسی ہو گئی۔

"کسی نے مجھ سے ذکر نہیں کیا اور میں احمق خالی ہاتھ چلی آئی۔"

سمانہ نے اسے یوں روہانسا ہوتا دیکھا تو چکن نوڈلز رول جو وہ شام کی چائے کیلئے بنا رہی
تھی۔ پلیٹ میں نکال کر خوبصورت سے کاٹن نیپکن سے ڈھانپ دیئے۔

"پہلے معلوم تو کر لو۔ زیب گھر پر ہیں یا نہیں۔ یوں منہ اٹھا کر کسی کے گھر چلے جانا بھی
ٹھیک نہیں۔" بینا نے کہا تو چنیا نے یہی دعا کرتے ہوئے کہ زیب گھر پر ہی ہوں، نمبر ملایا تو
دوسری طرف وہی صاحب تھے اور آج شاید خاصے مصروف تھے تب ہی بعجلت اتنا بتا کر زیب گ
پر ہیں۔ فون بند کر دیا۔

"مانہ! میں ٹھیک لگ رہی ہوں؟" براؤن پائجامے اور پرنٹڈ قمیص دوپٹے اور براؤن لو
شوز میں اسٹیپس میں کٹے سیاہ بالوں کو سلیقے سے سنوارے وہ کچھ پزل سی بے حد کیوٹ لگ ر

تھی۔ فریج کا دروازہ کھولتے فراز نے ستائشی نظروں سے جدت، معصومیت اور خوبصورتی کے
امتزاج کو دیکھا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

"اس پر کارڈیگن پہن لوں۔"

"رہنے دو۔ آج تو یوں بھی سردی نہیں ہے۔ تمہارا سوٹ بھی موٹے کپڑے کا ہے۔"

پہلی بار کسی رائٹر سے ملنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ تینوں ایکسائیٹڈ تھیں۔ فارینہ نے تو بوتیک
سے جا کر نیا سوٹ لیا تھا۔ کیونکہ قریب ہی جانا تھا۔ اس لئے وہ تینوں تائی امی سے کہہ کر باہر نکل
گئیں۔

"بچوں جیسی ایکسائٹمنٹ ہے اس کی بھی۔" سمانہ نے ہنستے ہوئے کہا اور باقی کے رول تلنے
لگی۔ فراز نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ سادہ گھریلو سا حلیہ۔ سارے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا سا بنایا ہوا
تھا۔

"ایکسائٹمنٹ ہونی چاہئے۔ اس سے زندگی کا احساس ہوتا ہے اور چنیا میں زندگی اپنی تمام
تر خوبصورتی اور رنگوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" مانہ کے لہجے میں بہن کی محبت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"مجھے چنیا کی یہی بات اچھی لگی۔ وہ زندگی سے اپنا حصہ لڑ جھگڑ کر بھی وصول کر لیتی ہے۔
ورنہ لوگ تو یہی سوچتے رہ جاتے ہیں کہ دوسرے کیا سوچیں گے......"

سمانہ نے پلٹ کر حیرت سے انہیں دیکھا۔ پھر ہنس دی۔

"آپ ابھی تک خفا ہیں......"

"کیا نہیں ہونا چاہئے؟" ان کی خفگی ان کے لہجے سے بھرپور انداز میں چھلکی۔

"ہونا تو نہیں چاہئے۔ ہر ماحول کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو ہمیں پورے کرنے
ہوتے ہیں۔" سادہ و مضبوط لہجہ۔

"اور چنیا...... کل وہ بھی تو میرے ساتھ گئی تھی۔" بوتل فریج میں رکھ کر دروازہ بند کرتے
ہوئے وہ پورے کے پورے اس کی طرف گھومے۔

سمانہ نے چند رول فرائنگ پین میں ڈالے پھر اسی انداز میں گویا ہوئی۔

"چنیا کی بات اور ہے۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی ہے۔ ابھی تک کسی کو احساس بھی نہیں
ہوا کہ وہ بڑی ہو چکی ہے؛ پھر اس کی عادتیں بھی بچوں جیسی ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے ابو اس کی ناک
میں لونگ پن دیکھ کر حیرت سے پوچھ رہے تھے کہ چنیا نے کوکا ابھی سے پہن لیا۔ وہ بھی اپنے

چھوٹے ہونے کا اکثر اڈوانٹیج لے لیتی ہے۔ اب آپ بھی ذرا باہر چل کر بیٹھیں میں چائے لے کر ابھی آتی ہوں۔"

بات کرتے کرتے اس نے یوں موضوع کو لپیٹا جیسے وہ کوئی خاص بات ہی نہ کر رہے ہوں۔

"مجھے نہیں پینی تمہاری چائے۔"

"ارے کیوں' میں نے تو رول صرف آپ کیلئے بنائے تھے۔"

فراز نے لب بھینچ کر اسے دیکھا جو اک خاص جملہ عام سے لہجے میں کہہ کر اب ٹرے میں ٹماٹو کیچپ اور چلی ساس رکھ رہی تھی۔

"تم کبھی نہیں سدھرو گی۔" وہ زیر لب بڑبڑائے تھے۔

* * *

"ویسے ایک بات طے ہے' تمہارے فراز بھائی ہیں زبردست پرسنیلٹی کے مالک۔"

ونیزہ نے کچھ دور آ کر کہا تھا۔

"تمہارے؟" فارینہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ونیزہ نے اسے گھور کر اپنا جملہ مکمل کیا۔

"سانیہ آپی کے ساتھ ان کا کپل پرفیکٹ ہوگا۔"

"یہ تو ہے۔" گھر میں متواتر ہوتی بحثوں نے چنیا کا بھی مائنڈ میک اپ کر دیا تھا۔

"میں نے تو رات کو بیٹھ کر زیب چوہدری کے سارے ناولوں کے نام یاد کئے تھے۔ تمہیں تو پتا ہے مجھے نام یاد نہیں رہتے۔" فارینہ نے بتایا تو چنیا اترا کر بولی۔

"مجھے تو ویسے ہی سب یاد ہیں۔"

"ہاں۔ اس معاملے میں تمہارا دماغ خوب چلتا ہے۔ ویسے تو دو کا پہاڑہ کہو تو یاد نہ آئے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"اب اپنا چھوہارے جیسا منہ بند کرلو۔ ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں۔"

ونیزہ نے اعلان کیا۔ پٹھان چوکیدار نے مونچھوں کو سنوارتے ہوئے خاصی کینہ توز نظروں سے چنیا کو دیکھا تھا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اکثر وہ دیوار سے جھانکتے سفید پھولوں کے گچھے توڑ لیا کرتی تھی اور کبھی ہاتھ نہ آئی تھی۔ لیکن اس نے خاموشی سے چھوٹا گیٹ کھول دیا تھا۔ کیونکہ ہدایات پہلے سے دی جا چکی تھیں۔ اپنی اس اہمیت پر چنیا کی گردن اکڑ گئی۔

خوبصورت لان میں خزاں اپنے قدم جمانے میں مصروف تھی۔ سرسبز پتوں کے بدن زردی

مائل ہو رہے تھے۔ سرخ روش عبور کر کے وہ کاریڈور میں آ گئیں۔ جہاں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے شخص کی ان کی طرف پشت تھی۔ نجانے وہ اتنی محویت سے کس کام میں مگن تھا کہ ان کے ایک دو بار کھنکھارنے پر بھی متوجہ نہ ہوا۔

"بات سنیں۔ چنیا نے ذرا آگے کھسک کر اور ذرا سا اچک کر عقب سے اس کی مصروفیت جاننے کی کوشش کی۔ تب ہی وہ ایک دم کھڑے ہو کر پلٹا اور چنیا کے منہ سے اک دلدوز چیخ نکلی۔ دونوں سکھیوں نے طوطا چشمی کی حد کرتے ہوئے دوڑ لگانے کو پر تولے' مگر چنیا کے ہاتھ میں ونیزہ کا بازو تھا۔ اور فارینہ گیٹ پر چوکنا کھڑے چوکیدار کو دیکھ کر پلٹی تھی۔ چنیا کی حالت اس بکری جیسی تھی جس کے گلے پر چھری رکھی گئی ہو۔ باہر کو ابلی آنکھیں۔ تھر تھر کانپتا وجود۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بندوق کی اس نال کو دیکھ رہی تھی جو اس کی ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔

سامنے کھڑے شخص نے پہلے تینوں لڑکیوں کا پھر ان کے ہاتھوں میں پکڑی چیزوں کا جائزہ لیا۔

"نام......؟" سخت کھردرا لہجہ۔

دونوں نے کھٹ کھٹ اپنے نام بتائے۔

"اور تمہارا......؟"

سارا منظر غائب تھا۔ لان' کاریڈور' ونیزہ' فارینہ اور سامنے کھڑا شخص بس بندوق کی اک نال تھی۔ جو اس کی نظروں کے سامنے گول گول گھوم رہی تھی۔ اس نے سامنے پڑی اپنی خونم خون لاش کو دیکھا۔ تب ہی بندوق کی اس نالی نے گھرک کر اس کا نام پوچھا۔

"چ......چ......چ......"

"چہ...... چہ...... چہ......" اس نے تاسف سے زرد پڑتی لڑکی کو دیکھا اور بندوق ہٹا کر کرسی پر لٹکائی۔

"ہم......ہم چلتے ہیں......" ونیزہ نے ساکت وصامت کھڑی چنیا کو کھینچا۔

"خبردار......" بندوق دوبارہ حرکت میں آئی۔

"دیکھیں۔ ہم تو یہاں صرف زیب چوہدری سے ملنے آئے تھے' وعدہ اب نہیں آئیں گے' پلیز' ہمیں جانے دیں......" ونیزہ رو دینے کو تھی۔

"یہ کیا ہے؟......" ہاتھ میں پکڑے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

"ک......کیک......"

"میز پر رکھ دو اور تم لوگ بھی۔" تینوں نے حکم ملتے ہی چیزیں میز پر پٹخیں اور تیزی و

معصومیت سے اجازت طلب کی۔

"ہم جائیں......"

"ابھی نہیں۔" تحکمانہ لہجے میں کہہ کر اس نے ایک رول اٹھا کر جائزہ لیا۔ تب ہی عقب سے ایک دروازہ کھلا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔"

اس تحکمانہ و پرجلال آواز پر اس کے ہاتھ سے رول چھوٹ کر نیچے جا پڑا۔

"دادو! وہ......"

آواز کی درشتی، اکھڑپن۔ چہرے کی سختی و خباثت جو کہ فارینہ کو نظر آ رہی تھی۔ صاف غائب ہوگئی۔

"میں نے کہا نہیں تھا کہ جب وہ بچیاں آ جائیں تو انہیں فوراً میرے کمرے میں لے آنا۔"

انہوں نے اس درمیانہ قد، قدرے فربہی مائل وجود، صحت مندی کی علامت سرخ و سفید رنگت اور برف جیسے بالوں والی خاتون کو دیکھا تو اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔

"دادو! میں تو یہاں دادا جان کی بندوق صاف کر رہا تھا۔ یہ خوامخواہ ہی ڈر گئیں۔"

"خوامخواہ؟" تینوں ہی چیخ اٹھیں اور ایک ساتھ شروع ہوگئیں۔ جھوٹ سچ نمک مرچ لگا کر جو منہ میں آیا بول دیا۔ دادو نے بھی دل کھول کر سب کے سامنے ٹھیک ٹھاک بے عزتی کی۔ لبوں میں ہلکی ہلکی مسکراہٹ دبائے نیچے گرے رول پر نظریں جمائے وہ بظاہر بے حد شرافت سے ڈانٹ سنتا رہا۔

"اب تمہاری سزا ہے کہ تم ہم سب کیلئے چائے بناؤ گے۔"

"نہیں۔ ہم اب چلتے ہیں......" وہ تینوں ایک ساتھ بول اٹھیں۔

اس نے نیچے جھک کر رول اٹھا کر واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے بے حد شرارتی انداز میں پوچھا۔

"زیب سے نہیں ملیں گی؟"

"ابھی تو برخوردار! تمہیں اس بات کی بھی معافی مانگنی ہے۔ جب زیب گھر پر نہیں تھی تو کیوں جھوٹ بولا تم نے۔" دادو نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

"کیا زیب گھر پر نہیں ہیں۔" تینوں چیخیں۔ ساتھ ہی خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔ فارینہ نے دانت یوں کچکچائے تھے۔ جیسے اسے کچا چبا رہی ہو۔ جواباً وہ بڑی بے نیازی سے اپنے بال انگلیوں سے سنوارنے لگا تھا۔

"میں معافی چاہتی ہوں بیٹا! زیب کو اچانک واپس لاہور جانا پڑا۔ اس کے ماموں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ انہوں نے بلوا لیا۔"

"اس بات پر تو میں معذرت کرنے کو تیار ہوں۔ مگر دادو اگر یہ لوگ نہ آتیں تو یہ اتنے مزے کی چیزیں کہاں سے آتیں۔" جینز کی جیب میں دونوں ہاتھ اڑستے پنجوں پر زور ڈال کر للچائی نظروں سے چیزوں کو دیکھا تھا۔

"تم ابھی تک یہیں ہو۔ جاؤ، چائے لے کر آؤ۔"

دادو نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ شرافت سے اندر کی طرف مڑ گیا۔

"دادو! ہم چلتے ہیں......" چنیا نے افسردگی سے میز پر رکھے بوکے کو دیکھا۔ کس چاؤ سے ایک ایک پھول چن چن کر لگوایا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ اب دادو کہا ہے تو دادو کی بات بھی ماننی ہوگی۔ فوراً بیٹھ جاؤ۔"

دادو نے ان کے چہرے پر چھائی مایوسی و اداسی کو دیکھا تو مشفقانہ لہجے میں ڈپٹ کر کہا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئیں۔ تب ہی وہ باہر سے آیا تھا۔ چیزوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

"یہ لے جاؤں......؟" خاصا شریفانہ انداز تھا۔ ان تینوں نے دانستہ نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"لے جاؤ۔" دادو نے اجازت دی۔ پھر ان سے مخاطب ہوئیں۔

"بھئی بچیو! یہ کیا تکلف تم لوگوں نے......"

"ہم لوگ زیب کیلئے لائے تھے۔" چنیا کی اداسی اب بھی کم نہ ہوئی تھی۔

"یہ تو پہلی بار تھا۔ مگر آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔"

"آئندہ آئیں گے تب نا......" فارینہ بڑبڑائی۔

"یہ میرا پوتا ہے احمر! بس ذرا شرارتی زیادہ ہے۔" ان کے لہجے میں ہلکا سا پیار چھلکا۔ چنیا، منہ ہی منہ میں نجانے کیا بڑبڑائی تھی۔ دادو مسکرائیں اور سہولت سے موضوع زیب کی تحریروں کی طرف موڑ دیا۔ تب ہی احمر چائے کی ٹرالی گھسیٹتا آ گیا۔ ونیزہ کا بنایا کیک، رول، کباب اور دہی بھلے۔ بڑی خاموشی اور شرافت سے چائے سرو کرنے کے بعد اپنی پلیٹ فل بھر کر ذرا سائیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔ موضوع گفتگو زیب کی تحریریں تھیں سو ذرا سی دیر میں ان کی تالو سے چپکی زبانیں بھی کھل گئیں۔ کیک کھاتے کھاتے فارینہ کو یاد آیا کہ اس نے رات ہی بیٹھ کر نام یاد کئے تھے۔ جو سب کے سب ذہن کے کسی کونے کھدرے میں جا گھسے تھے۔ کھینچ کھانچ کر ایک ناول باہر نکالا۔ جو ابھی پچھلے مہینے ہی پڑھا تھا۔

"ہاں، وہ زیب نے وہ ناول بھی تو لکھا تھا نا۔" مہندی، چوڑی، آنچل۔

پانی کا گھونٹ بھرتی چنیا کو اچھو سا لگا۔ جبکہ فارینہ نے بڑے جوش میں پلیٹ ٹیبل پر رکھی اور نان سٹاپ ناول کی تعریف وتوصیف میں شروع ہوگئی۔ دادو کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جبکہ احمر شاید اس کے زبان وبیان سے متاثر ہوا تھا۔ تب ہی پلیٹ ہاتھ میں لئے پورے کا پورا اس کی طرف پلٹ گیا اور حیرت سے فارینہ کو دیکھنے لگا۔ جو حاضرین کی یہ توجہ دیکھ کر جوش میں آکر کچھ اور پھندنے ٹانکنے لگی تھی۔

چنیا کی گھوریاں، میز کے نیچے سے پاؤں دبانا، ونیزہ کا کھنکھارنا بھی اس کا منہ بند نہ کرسکا۔

"یہ غالباً فائزہ افتخار چندا کا ناول ہے۔" احمر سے مزید صبر نہیں ہوا تھا۔

"ہیں۔" اس کی فراٹے بھرتی زبان کے سامنے اسپیڈ بریکر آگیا تھا۔ کچھ گھبرا کر سکھیوں کو دیکھا۔ جن کی گھورتی نگاہیں گویا تصدیق کررہی تھیں۔ اس نے تیزی سے پلیٹ اٹھا کر کیک کھانا شروع کردیا۔

"ہاں، وہ بچی بھی بہت اچھا اور رواں لکھتی ہے۔" دادو نے اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کا بمشکل گلا گھونٹ کر سادگی سے کہا تھا۔

"دادو! آپ بھی ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔" چنیا نے پوچھا۔

"کالج کے زمانے میں بہت پڑھتی تھی۔ حور اور زیب النساء تو باقاعدگی سے گھر آتے تھے پھر گھرداری میں الجھی تو چھوڑ دیئے۔ مگر جب سے زیب نے لکھنا شروع کیا تو دوبارہ سے پڑھنے لگی ہوں۔" دادو نے بتایا وہ کچھ دیر بیٹھیں پھر اجازت لے کر کھڑی ہوگئیں۔

"زیب! کب تک واپس آئیں گی دادو......"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ رات کو فون کروں گی تو پوچھوں گی۔" دادو نے بہت محبت سے انہیں رخصت کیا تھا۔ دوبارہ آنے کی تاکید بھی کی تھی۔ وہ بوجھل دل سے واپس آئی تھیں۔

"مل آئیں زیب سے۔" تائی امی سب سے پہلے ٹکرائی تھیں۔

"وہ گھر پر نہیں تھیں۔" افسردہ لہجہ، فراز اس کی لٹکی صورت دیکھ کر مسکرا دیئے۔ تائی امی بڑبڑانے لگیں۔ انہیں سو روپے ضائع ہونے کا افسوس ہورہا تھا۔

"تمہاری فرینڈز چلی گئیں؟" فراز اس کے پیچھے اٹھ آئے۔

"جی دیر ہورہی تھی انہیں۔ باہر ہی سے چلی گئیں۔" اس نے شوز اتارے۔

"اتنی اداس کیوں ہورہی ہو۔ آئندہ جانا ہوا تو مجھے بتانا۔ بالکل ویسا ہی بوا کے لادوں گا۔" انہوں نے تسلی دی۔

"ہاں اب تو جیسے تائی امی مجھے پیسے دے ہی دیں گی۔" نروٹھے پن سے کہتی کانوں سے ٹاپس اتارنے لگی۔

"پاگل! تم سے پیسے مانگ کون رہا ہے۔"

"ہیں...... پھر میں بھی ساتھ جاؤں گی۔" اداسی کے بادل ایک دم چھٹ گئے۔ رخ نوخیز پر اک روشن صبح طلوع ہوئی۔ وہ جواب دینا ہی بھول گئے۔ بس کچھ لمحے مبہوت سے اسے دیکھتے رہے۔ چنیا نے بازو ہلا کر متوجہ کیا۔

"ہیں فراز بھائی! میں بھی ساتھ جاؤں گی۔"

فراز نے اپنے بازو پر دھرا اس کا ہاتھ دیکھا۔ پھر آہستگی سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بولے تھے۔

"ضرور۔"

* * *

بینا کی قمیص پر ترپائی باقی تھی۔ وہ لے کر اوپر آگئی۔ بہت اچھی دھوپ نکلی تھی۔ اس نے سوچا تھا دھوپ میں بیٹھ کر کام ختم کرلے گی۔ مگر وہاں فراز کو دیکھ کر اسے افسوس ہوا کہ پہلے ہی معلوم کرلیتی۔ موصوف کہاں ہیں۔ وہ قصداً فراز سے کتراتی تھی۔ ابھی تو منگنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ موصوف اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے رہتے۔ شاید اسے بھی امریکہ سمجھ رہے تھے کہ جہاں گرل فرینڈ کے ساتھ ہر قسم کی حرکتیں جائز تصور کی جاتی ہیں اور اگر منگیتر ہو تو پھر اللہ ہی حافظ۔

"آؤ سمانہ......" وہ جو پلٹ جانے کو تھی۔ ذرا رک گئی۔

"مجھے شاید امی آواز دے رہی ہیں۔" فراز نے قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔ پھر اس کے قریب آگئے۔

"شاید تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔"

سمانہ نے سٹپٹا کر انہیں دیکھا۔ اگر مستقبل اسی شخص کے ساتھ وابستہ ہوگیا تو یہی بات اس کیلئے مسئلہ بھی بن سکتی تھی۔ تب ہی قدرے سنجیدگی سے گویا ہوئی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے فراز......!"

"تو پھر مجھ سے کتراتی کیوں ہو؟"

عجیب بندہ تھا۔ مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔

"تمہیں نہیں پتا سمانہ! میں تصور میں تمہارا ہاتھ تھام کر کتنی دور تک نکل جاتا ہوں۔" سمانہ کو

تصور میں بھی اپنا ہاتھ تھامنے پر اعتراض تھا۔ مگر قصداً خاموش رہی۔

"سمانہ! اپنا ہاتھ دو......" فراز نے اس کے سامنے ہتھیلی پھیلائی۔

"جی......" وہ گڑبڑا گئی۔

"اپنا ہاتھ دو......" انہوں نے دوبارہ دہرایا۔ سمانہ نے سر اٹھا کر سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"فراز صاحب! نجانے ایک بار کہی گئی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی یہ مغرب نہیں ہے۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں تیزی سے سیڑھیاں اتری تھی۔ مگر درمیان میں ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ ریحان اوپر آ رہے تھے۔ انہوں نے رستہ دیتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے سمانہ پھر اوپر کھڑے فراز کو دیکھا تھا۔ سمانہ شرمندہ سی ہوگئی۔ پھر تیزی سے نکل کر کمرے میں آ گئی۔ قیمص بیڈ پر پٹخی اور سر تھام کر رہ گئی۔

"ہیں، تمہیں کیا ہوا؟" بالوں میں انڈے دہی کا لیپ کئے بیٹھی بینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں تنگ آ گئی ہوں اس انگریز کے بچے سے۔"

بینا کا منہ کھل گیا۔ پھر ہنسی نکل گئی۔

"فراز کی بات کر رہی ہو......"

"ہاں! نجانے کیا سمجھتا ہے خود کو......"

"خدا کا خوف کرو۔ منگنی ہونے والی ہے تم لوگوں کی۔"

"تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر وقت خود کو رومیو کا جانشین سمجھتا رہے۔ کبھی ساتھ واک کرنے کی فرمائش، تو کبھی سوپ پینے کی دعوت تو کبھی......" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی تھی۔

"ہائے نہ کیں، ہم سے کسی نے ایسی فرمائشیں......" بینا نے مصنوعی آہ بھری۔

"ہر کسی کا دماغ فراز صاحب کی طرح کھسکا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ تو پاکستان کو بھی امریکہ سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"یار! تھوڑی سی تو ڈھیل دو۔" بینا نے سفارش کی۔

"تھوڑی سی بھی دے دی تو موصوف بالکل ہی پھیل جائیں گے۔ جی تو چاہ رہا تھا سوئی ہتھیلی میں چبھو دوں۔' وہ بڑبڑائی۔

"ہائیں۔ یہ ہتھیلی کہاں سے آ گئی۔" بینا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں......" وہ قمیص پھیلا کر دیکھنے لگی۔ پھر اس کی توجہ بٹانے کو پوچھنے لگی تھی۔

"کیسی سلی ہے؟"

* * *

چنیا نے کچھ دنوں کے بعد دوبارہ فون کیا تھا۔ جتنی بار احمر نے اٹھایا اس نے لائن کاٹ دی۔ جب دادو کی آواز سنی تب اس نے تعارف کروایا تھا۔

دادو خفا ہونے لگیں۔

"بہت ہی بے مروت بچیاں نکلیں۔ میں نے سوچا تھا جب تک یہاں ہوں میرا بھی دل لگا رہے گا۔"

"سوری دادو...... وہ بس......" چنیا کو کوئی معقول بہانہ ہی نہیں ملا تو پوچھنے لگی۔ "زیب واپس آ گئی ہیں۔"

"کہاں...... وہ بھی تو وہیں جا کر بیٹھ گئی ہے۔" دادو سچ مچ بور ہو رہی تھیں۔ چنیا نے وعدہ کیا وہ جلد ہی آئے گی۔

"ابھی کیوں نہیں۔ اتنی اچھی دھوپ نکلی ہے میں اور احمر لان میں میٹ بچھائے چکوترے کھانے میں مصروف ہیں۔"

"ارے یہ منظر تو اکثر زیب کے ناولوں میں ملتا ہے۔ لیکن دادو...... وہ کیا ہے کہ مجھے چکوترے بالکل نہیں پسند......"

"موسمبیاں تو پسند ہیں نا......"

"وہ تو ہیں؟......"

"بس پھر آ جاؤ......"

ان کے اتنے اصرار کے بعد اسے انکار کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ تائی امی سے پوچھا تو وہ متفکر لہجہ میں پوچھنے لگیں۔

"جاؤ گی کس کے ساتھ......؟"

"آپ چلیں نا......"

"لو خوامخواہ اتنے بکھیڑے چھوڑ کر میں کس طرح جا سکتی ہوں۔ دیکھو فراز ہے تو اس سے کہو تمہیں وہاں تک چھوڑ آئے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

وہ لاؤنج میں آئی تو فراز صوبے پر نیم دراز فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ چنیا نے ٹی وی بند کر کے مدعا بیان کیا' پھر مخصوص لاڈ بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''اٹھیں نا فراز بھائی! دو منٹ کی تو بات ہے۔''

''کیا ہے چنیا! ایک تو تم تنگ بہت کرتی ہو......'' مصنوعی خفگی کے ساتھ گویا ہوئے۔

اس نے ابھی نہا کر فیروزی' ہلکی سی کڑھائی والا سوٹ پہنا تھا۔ بلیک کارڈیگن اور دوپٹہ اوڑھ کر جلدی جلدی بالوں میں برش چلا کر پونی بنائی اور ان کے ساتھ نکل آئی۔

''آج پھول نہیں لے جانے؟''

''زیب تو آئی ہی نہیں ہیں۔ میں تو ان کی دادو سے ملنے جا رہی ہوں۔''

اس نے لاپروائی سے کہا۔ تبھی نظر سامنے والے گھر کی دیوار سے لپٹی سرخ پھولوں کی بیل پر پڑی۔ جس پر ابھی تک خزاں کا سایہ نہیں پڑا تھا۔

''ابھی لیں۔'' وہ بھاگ کر ادھر گئی۔ دو بڑے بڑے پھولوں کے گچھے توڑے۔'' فراز بھائی! ذرا ادھر آئیں۔''

اس کے اشارے اور پکارنے پر وہ بھی اسی طرف آ گئے۔

''جلدی سے اوپر والے پھول توڑ دیں۔ مالی آ گیا تو خوامخواہ لڑائی ہو جائے گی۔''

فراز نے مسکراتے ہوئے پھول توڑے اور اس کی سمت بڑھا دیئے۔ وہ سب پھولوں کو جوڑ کر قدرے سوکھی ہوئی پتیاں الگ کرنے لگی۔

''لیجئے! گلدستہ تیار ہے۔''

سیاہ شال کے ہالے میں نکھرا نکھرا شاداب چہرہ اور اس پر سجی بے فکری مسکراہٹ وہ چاہتے ہوئے بھی نظروں کا زاویہ بدل نہ پائے۔

''پتا ہے فراز بھائی! مجھے پھول بہت پسند ہیں۔'' چنیا نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

''تمہارے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔'' وہ زیر لب بڑبڑائے جبکہ چنیا کہہ رہی تھی۔

''میں نے بہت سے لوگوں کو پھول گفٹ کئے ہیں۔ مگر مجھے آج تک کسی نے بھی نہیں دیئے۔ حالانکہ اتنا دل چاہتا ہے۔ میں نے ونیزہ اور فارینہ سے بھی کہہ دیا ہے۔ اس بار تو ان میں سے کوئی مجھے سرخ گلابوں کا گلدستہ برتھ ڈے پر ضرور دے۔ مگر میں جانتی ہوں وہ کبھی نہیں دیں گی۔''

''تمہارا برتھ ڈے کب ہے؟''

''6 دسمبر کو...... ارے اس بار تو آپ بھی یہیں ہوں گے۔''

''پارٹی ہوتی ہے؟......''

''نہیں' گفٹ ضرور ملتے ہیں۔ آپ سے بھی لوں گی؟'' وہ مسکرا دیئے۔

''کیا لوگی؟......''

''دعائیں دے دیجئے گا...... چنیا شریر سے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''بزرگ ہمیشہ یونہی ٹالا کرتے ہیں۔''

''واٹ ڈو یو مین بے بی۔'' فراز نے گھورا۔

''بے بی کہہ کر تصدیق کی مہر لگا دی ہے ورنہ میں نے تو یونہی کہا تھا۔'' اس نے شرارت سے کندھے اچکائے۔

فراز کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''فراز بھائی! آپ یہاں آ کر بور تو نہیں ہوئے۔''

''بور تو ہوا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تم سے دوستی پہلے کیوں نہ کر لی۔''

''بس گھر آ گیا۔'' وہ سیاہ گیٹ کے سامنے رک گئی۔

''بہت جلدی آ گیا۔ حالانکہ میں تمہارے ساتھ واک کو انجوائے کر رہا تھا۔'' انہیں واقعی افسوس ہوا تھا۔

''کسی دن شام میں واک کیلئے آئیں گے۔ پہلے تو ہم لوگ روز ہی واک کیلئے نکلا کرتے تھے۔ لیکن اب ایک تو شادی کی مصروفیت' پھر اس وقت سردی بھی زیادہ ہونے لگی ہے۔''

چنیا نے کہا۔ پھر پھولوں کا ایک گچھا الگ کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ لیں۔''

''یہ کیا؟'' فراز نے کچھ عجیب سے تاثرات کے ساتھ اس کی سمت دیکھا۔

''مانہ کو دے دیجئے گا......'' شرارت سے کہتی پھول ان کے ہاتھ میں تھماتی وہ اندر چلی گئی تھی۔ فراز کچھ لمحے پھولوں کو دیکھتے رہے پھر پلٹے پھولوں کی ایک ایک پتی الگ کرتے ہوئے ان کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ خشک پتے ان کے قدموں تلے چرچرا رہے تھے۔

''مانہ......'' اس نے زیر لب دہرایا۔ پھر پھول اٹھا کر سڑک پر دے مارے تھے۔

* * *

''دادو! یہ سارا دن گھر پر ہی ہوتے ہیں۔''

احمر کی بے تکان بولنے کی عادت چنیا کو زہر لگتی تھی۔ شاید اس لئے کہ پھر اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ تبھی چڑ کر دادو سے پوچھ لیا تھا۔

"غضب خدا کا اب کیا میرے ہی گھر میں میرا رہنا بند کروائے گی یہ لڑکی۔" احمر نے
دی تھی۔

دادو ہنسنے لگیں۔

"اس کی وجہ سے تو میرا دل لگا رہتا ہے یا پھر تم آجاتی ہو۔"

چنیا اب اکثر آجاتی تھی۔ نہ آتی تو دادو فون کر کے بلوا لیتیں۔ احمر کے بڑے بھائی سعو
میں ہوتے تھے۔ انہوں نے بلوایا تو اس کے امی ابو عمرہ کرنے چلے گئے۔ احمر تنہائی سے گھبرا
لاہور سے دادو اور زیب کو لے آیا۔ زیب تو چند دنوں میں ہی بھاگ گئی۔ دادو بے چاری خالی گھر
میں بولائی بولائی سی پھرتیں۔ لاہور کو یاد کرتیں۔ وہاں گلشن میں تین کوٹھیاں پاس پاس تھیں ان
کے تینوں بیٹیوں کی۔ کئی پوتے پوتیاں' نواسے نواسیاں بھی زیادہ دور نہیں رہتے تھے۔ کچھ دادو
بہت زندہ دل اور ہنسوڑ طبیعت کی مالک تھیں۔ ہر وقت ارد گرد میلا سا لگا رہتا۔

وہ چنیا کو سب کے بارے میں تفصیل سے بتاتیں۔ ان کی شرارتیں' نت نئے تو لطیفے گھڑے
ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر شرارتیں وہی ہوتیں جو زیب اپنے ناول میں لکھ چکی تھیں۔ وہ بہت
دلچسپی اور انہماک سے سنتی۔ مگر احمر آجاتا تو پھر اس کی اپنی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ اپنے
کے اور دوستوں کے اوٹ پٹانگ قصے سناتا رہتا۔ دادو ہنستی رہتیں۔ چنیا بور ہونے لگتی۔ اسے احمر
کے قصوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ یوں لگتا خود سے گھڑ گھڑ کر سناتا ہے۔ ایک تو
ایگزامز کے بعد فارغ تھا دوسرے دادو کی وجہ سے ہمہ وقت گھر میں موجود۔

"لیں دادو پھر میں چلتا ہوں۔ آپ کی مہمان کو ہمارا وجود گوارا ہی نہیں۔"

اس نے کھڑے ہو کر پی کیپ سر پر لی اور بائیک کی چابی اٹھالی۔ دادو کچھ بھی نہیں بولیں۔
چنیا نے تو خیر شکر ہی کیا تھا۔

"دادو! آپ تو ہمارے گھر ہی نہیں آتیں۔" اس کے جانے کے بعد چنیا نے شکوہ کیا تو
کمبل ٹھیک کرتے ہوئے مسکرا دیں۔

"اب بیٹا اس سردی نے ناکارہ کر چھوڑا ہے۔ کہیں نکلنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ وہاں تو
سردی شروع ہوتے ہی اپنے کمرے تک محدود ہو جاتی تھی۔ ناصر تو بہت ہی لڑتا تھا کہ دادو آپ
بور کرتی ہیں۔"

انہیں ناصر کی کوئی شرارت یاد آئی تو اسے سنانے لگیں۔ اب تو وہ سب کے ناموں
عادتوں سے واقف ہو گئی تھی۔ یہ ناصر وہی تھا جو مارکیٹ میں آنے والا ہر نیا چاکلیٹ دادو کے
ضرور لاتا تھا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجائے وہ انہماک سے سنتی رہی۔

"دادو! اسی لئے زیب کے سارے ناولوں میں اتنے ڈھیر سارے کزنز اور ان کی شرارتیں
ہوتی ہیں۔"

"ہاں وہ سب بہت شریر ہیں۔"

دادو یونہی اسے مختلف قصے سناتی رہیں۔ اس نے ایک بار اٹھ کر چائے بھی بنائی اور جب وہ
چائے ختم کر چکی تب احمر چلا آیا۔

"جلدی سے چنیا پلیٹیں لے آؤ۔ جھال روڈ پر نیا ریسٹوران کھلا ہے۔ "نیو لاہور بروسٹ"
وہاں سے لایا ہوں چکن تکہ۔"

چنیا پلیٹیں نکال لائی۔

"یہ تکہ ان میں منتقل کرو اور دادو......" اس نے بڑی سی لیدر جیکٹ کی زپ کھول کر اندر
سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کے نئے شمارے نکالے۔

"یہ آپ کے ڈائجسٹ......"

"ہیں......ڈائجسٹ آ بھی گئے......" چنیا تکے نکالنا ہی بھول گئی۔

"خبردار" احمر نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "تم پہلے تکے نکالو......"

"نہیں پہلے میں ڈائجسٹ دیکھوں گی۔ دادو پلیز! کہیں نا احمر بھائی سے۔"

"احمر! دے دو۔"

دادو کی سفارش پر احمر نے گھورتے ہوئے ڈائجسٹ اسے تھمائے اور خود تکے نکالنے لگا۔

"زیب نے پتا نہیں اس بار کچھ لکھا ہے یا نہیں۔" وہ ورق گردانی کرنے لگی۔

"اس بار زیب نے کچھ نہیں لکھا۔" احمر نے اطلاع دی۔

"آپ کو کیا پتا؟"

"مجھے زیب کے بارے میں ساری خبریں رہتی ہیں۔" وہ دادو کو دیکھ کر مسکرایا۔ تب ہی چنیا
کے سامنے لسٹ آگئی تھی۔ تب ہی خوش ہو کر چڑاتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ کو زیب کے بارے میں ساری خبریں نہیں رہتیں۔ ان کا اس بار مکمل ناول آیا
ہے۔"

"میں جانتا تھا بی بی! محض مذاق کر رہا تھا۔" وہ ہنس کر بولا اور چٹنیاں اور سلاد نکالنے لگا۔

"میں بھی منگوالوں گی۔ اللہ کرے آج ریحان بھائی آجائیں......"

"منگوانے کی کیا ضرورت ہے' یہی لے جاؤ۔" دادو نے محبت سے کہا۔

"ہرگز نہیں' پہلے میں پڑھوں گا۔" وہ جو خوش ہونے جا رہی تھی احمر کے بولنے پر منہ بنا کر

بیٹھ گئی۔ احمر نے بڑے سلیقے سے دونوں کو تکے سروے کئے۔ پھر اپنی پلیٹ میں ڈھیر ساری چٹنی ڈالنے لگا۔

"دادو! آپ کے پاس زیب کی تصویر ہے......" چٹنی میں ڈبو ڈبو کر تکہ کھاتے ہوئے ایک دم خیال آیا۔

"احمر کے پاس شاید ہوں......" دادو نے کہا تو وہ پلیٹ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"عمران کی شادی کی پوری البم موجود ہے میرے پاس۔"

"عمران زیب کا بھائی ہے۔" دادو نے بتایا تھا۔

احمر نے البم لا کر اس کے ہاتھ میں دی۔ چنیا نے بے حد اشتیاق سے کھولی۔ بہت سارے خوبصورت چہرے سامنے تھے۔ کسی کی مایوں کی تصویریں تھیں۔

"ان میں سے زیب کون سی ہیں؟"

"خود پہچانو......" احمر نے اشارے سے دادو کو منع کیا۔

"میں کیسے پہچانوں گی۔"

"غور کرو جو مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہو۔"

احمر کا لہجہ شرارتی ہوا۔ دادو نے دھپ رسید کی تھی۔

چنیا البم کے صفحے پلٹتی رہی۔ پھر ٹھٹک گئی۔ ہاں تھی ایک لمبے قد کی خوبصورت سی لڑکی رسموں میں سب سے نمایاں اور آگے' دادو کے ہم قدم' ہر تصویر میں احمر بھی موجود تھا۔

"یہ...... چنیا نے انگلی رکھی۔

"رائٹ......" احمر نے کہا' دادو نے بھی مسکرا کر تصدیق کی۔ چنیا نے بہت غور اور اشتیاق سے ہر تصویر کو دیکھا تھا۔ جا کر سکھیوں کو بتانا بھی تھا۔ تبھی فون کی بیل گونج اٹھی۔ احمر نے سنا اور ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔

"تمہارا فون ہے۔"

"تو ایک بار گھر آ چنیا! میں تیرا گھر سے نکلنا بند کرتی ہوں......" دوسری طرف سے چھوٹتے ہی تائی امی بولی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کلاک پر نظر ڈالی پھر دانتوں تلے زبان دبالی۔

"میں ابھی آ رہی ہوں امی......!" اس نے تیزی سے ریسیور رکھا۔ عجلت میں جوتا پہنا۔

"مروا دیا نا دادو! آج تو مار ضرور ہی پڑے گی۔"

"واقعی! وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔" دادو کو بھی احساس ہوا وہ کافی دیر سے آئی ہوئی تھی۔

"مگر اب یہ تکے کون کھائے گا۔" احمر نے کہا۔

"خود ہی کھا لیجئے گا......" چنیا نے شال کو ڈھنگ سے اوڑھا۔

"جاؤ احمر! بہن کو گھر تک چھوڑ آؤ......"

"نہیں دادو۔ میں چلی جاؤں گی' قریب ہی تو گھر ہے۔"

"جب تمہاری ماں نے کبھی اکیلے نہیں بھیجا تو میں کیسے بھیج دوں......" دادو نے کہا تو احمر اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ گھر کے دروازے پر رک کر اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے ڈائجسٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"جی نہیں' آپ خود ہی پڑھ لیجئے گا......" وہ خفگی سے گویا ہوئی۔

"اچھی لڑکی! یوں خفا نہیں ہوتے۔ یہ ڈائجسٹ میں نے تمہارے لئے ہی خریدا تھا۔ اسے پڑھ کر آنا' تبصرہ کریں گے۔"

ڈائجسٹ اس کے ہاتھ میں دے کر وہ پلٹ گیا اور وہ تائی امی کی متوقع ڈانٹ سننے کیلئے پوری طرح تیار ہو کر گھر میں داخل ہوئی تھی۔

* * *

آج بھی اسے فراز ہی کالج سے لینے گئے تھے۔

"چلیں سوپ پینے......" انہوں نے خوشدلی سے پوچھا تھا۔

"نہیں......" چنیا نے فوراً انکار کر دیا۔

"کیوں بھئی کسی اور چیز کا موڈ ہے......؟"

کل بھی کالج سے فراز نے ہی اسے پک کیا تھا۔ پھر چائنا ٹاؤن لے گئے۔

"کل جب میں نے سمانہ کو بتایا تو وہ کہنے لگی۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے یہاں کالج یونیفارم میں لوگ کسی لڑکی کو ریستوران میں دیکھیں تو اچھا نہیں سمجھتے۔ جب بھی جانا ہو شام میں امی سے اجازت لے کر جایا کرو۔"

چنیا نے سادگی سے بتایا تو فراز کی رگیں تن گئیں۔

"کیا ریحان کے ساتھ کبھی تم ریستوران نہیں گئیں۔"

"کالج سے واپسی پر تو کبھی نہیں گئی۔"

گھر تک کا فاصلہ بے حد خاموشی سے طے ہوا تھا۔ چنیا نے ہی کوئی بات کی ہو تو ہو۔ فراز تو خاموش ہی ہو گئے تھے۔

چنیا نے گھر جاتے ہی حسب عادت بھوک کا نعرہ لگایا تھا۔

''سبزیوں کی بھجیا بنائی ہے اور کھیر بھی۔ تم کپڑے بدلو میں کھانا نکالتی ہوں۔'' سمانہ بر
کپڑوں کی تہہ لگا رہی تھی۔ چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''فراز آپ کیلئے لاؤں۔''

''وہیں کھالوں گا۔'' وہ اس کے پیچھے ہی کچن میں چلے آئے۔ سمانہ نے آٹا نکالا اور سرعت سے تازہ پھلکے بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ سالن گرم کیا اور دیگر چیزیں بھی نکال کر ٹیبل پر رکھنا شروع کر دیں۔

''تم نے چنیا کو میرے ساتھ ریستوران جانے سے منع کیا تھا۔''

سلاد کی ٹرے رکھتے ہوئے سمانہ کا ہاتھ ایک پل کو رکا۔ پھر وہ پلٹ کر روٹی پلٹتے ہوئے نارمل سے لہجے میں کہنے لگی۔

''منع تو نہیں کیا مگر کالج سے واپسی پر...... یہ بات گھر والوں کو پسند نہیں آتی اور جس انداز میں امی یہ بات چنیا کو سمجھاتیں...... میں نے مناسب سمجھا کہ سادہ الفاظ میں خود ہی اسے سمجھا دوں۔''

''میں تمہیں بدمعاش نظر آتا ہوں۔'' وہ تڑخ کر بولے۔ مانہ کی ہنسی نکل گئی۔

''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔''

''تم انتہائی تنگ ذہن اور شکی مزاج لڑکی ہو۔''

''میں نہ تنگ ذہن ہوں اور نہ شکی مزاج۔ صرف احتیاط پسند ہوں۔ ورنہ مجھے آپ پر پورا اعتبار ہے اور چنیا پر بھی۔''

اس کے سادہ سے لہجے میں کہے گئے ایسے ہی جملے فراز کے اندر ابلتے غصے کو ٹھنڈا کر دیتے تھے۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھتے رہے۔ سمانہ نے گرم روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ کر ان کے سامنے رکھیں۔

''اب اگر میں یہ کہوں کہ کھانے میں میرا ساتھ دو تو یہ بھی تمہارے احتیاط پسند نقطہ نظر سے غلط ہوگا۔''

سمانہ کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

''یہ جانتے ہوئے بھی ہر بات ایسی ہی کیوں کرتے ہیں۔''

''میں کھانا کھا چکی ہوں......'' وہ چولہا بند کر کے باہر نکل گئی۔ تبھی چنیا دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے آ گئی۔ کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بے تابی سے بولی تھی۔

''شروع کریں فراز بھائی! سخت بھوک لگ رہی ہے۔''

وہ بے خیالی میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے نجانے کیا سوچنے لگے تھے۔

* * *

''آپ یہ خواتین کے ماہنامے کیوں پڑھتے ہیں۔'' بہت الجھ کر دریافت کیا گیا تھا۔ احمر نے ڈائجسٹ سے نظریں ہٹا کر تینوں لڑکیوں کو دیکھا۔ سوال فارینہ نے کیا تھا۔ آج وہ تینوں دادو سے ملنے آئی تھیں۔ دادو ابھی ابھی اٹھ کر واش روم میں گئی تھیں۔

''اس میں ایک راز پنہاں ہے۔''

''وہ راز عیاں کریں گے آپ......؟'' ونیزہ نے کہا تو وہ ڈائجسٹ رکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''خواتین کے ماہنامے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں کس قسم کے لڑکوں پر مرتی ہیں۔ کون سی باتوں پر فدا ہوتی ہیں۔ ذرا سچ سچ بتائیں۔ میں شازیہ چوہدری کے ہیرو جیسا نہیں لگ رہا۔'' کالر کھڑے کر کے اترا کر پوچھا۔

''مجھے تو آپ رخ چوہدری کے ناولوں کے ہیرو لگتے ہیں۔ جو کسی بھی لمحے اٹھ کر بندروں جیسی حرکتیں شروع کر دیتا ہے۔'' چنیا اس کی اتراہٹ پر چڑ گئی۔

''حد ادب لڑکی! زیادہ بدتمیزی میں برداشت نہیں کرتا ہوں۔''

''ایک بات تو بتائیں۔'' ونیزہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور بے حد مشکوک نظروں سے احمر کو دیکھا۔

''الٰہی خیر!'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''آپ کو زیب کی ساری کہانیوں کے بارے میں کیسے پتا ہوتا ہے۔ وہ اپنا ہر آئیڈیا آپ سے ڈسکس کرتی ہیں۔'' جس روانی سے وہ زیب کی کہانیوں کے بارے میں بات کرتا تھا اس کو کچھ اور ہی شک گزرا تھا۔

''وہ مجھ سے اپنی ساری کہانیوں کی اصلاح کرواتی ہیں۔''

''سفید جھوٹ۔'' چنیا نے جھٹلایا۔

ونیزہ پاؤں جھلاتی ٹٹولتی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

احمر اس کی سمت جھکا۔

''مجھے تمہاری نگاہوں میں زیرو زیرو سیون جیسی چمک نظر آ رہی ہے۔ جلدی بولو لڑکی تم اس وقت کیا گوا چ رہی ہو؟''

ونیزہ نے جھنجھلا کر نظروں کا زاویہ بدلا' پھر جھنجھلا کر بولی۔

''مجھے تو لگتا ہے زیب کا کوئی وجود ہی نہیں ہے آپ خود ہی اس نام سے لکھتے ہیں۔''

"ہیں۔" چنیا اور فارینہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "یہ کیا کہہ دیا ونیزہ نے....."

احمر نے کچھ تحیر سے اسے دیکھا۔ پھر اس کا بے ساختہ قہقہہ ابھرا تھا۔

"تم کیا باؤلے ہوگئے ہو۔" اندر آتی دادو نے حیرت سے اسے یوں ہنستے دیکھا۔

"دادو! ذرا سنیں' یہ کیا سوچ رہی ہیں۔"

وہ ہنستا ہوا اٹھ کر دادو کے قریب آ گیا۔

دادو اس کی بات سن کر مسکرا دیں۔

"پھر اب دو جواب۔"

"بھئی اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ زیب کی ان سے بات کروا دی جائے۔"

اس نے سائیڈ ٹیبل پر سے موبائل اٹھا کر مسکراتے ہوئے نمبر پریس کیا۔ متبسم نگاہیں ان پر جمی تھیں۔

وہ خجل سی ہو کر ونیزہ کو گھورنے لگیں۔ جواب بھی لاپروائی سے پاؤں جھلا رہی تھی۔

"ہاں زیب...... ! جانتا ہوں مصروف ہو۔ مگر اس وقت کچھ تمہاری تحریروں کی مداح بیٹھی ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ زیب کے نام سے میں خواتین کے ماہناموں میں ناول لکھتا ہوں' ارے بات تو سنو...... چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لو ان سے بات کرو۔"

اس نے موبائل ونیزہ کی طرف بڑھایا تھا مگر چنیا نے جھپٹ لیا۔ اتنے عرصے کے بعد تو خواہش پوری ہو رہی تھی۔

"بھئی! کیا ہو رہا ہے میری غیر موجودگی میں۔" زیب ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

ایک پل کو اس کی آواز سن کر چنیا کچھ کہنا ہی بھول گئی تھی۔ مگر زیب کے بے تکلفانہ اور شگفتہ لہجے نے اس کی زبان کی روانی بحال کی۔ سکھیوں کی گھوریوں کے باوجود خاصی لمبی بات ہوئی۔

"آپ ساہیوال نہیں آئیں گی۔" اس سے قبل کہ فارینہ موبائل کھینچ لیتی اس نے تیزی سے پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں' میں کچھ دنوں تک ضرور آؤں گی۔"

"فارینہ پھر ونیزہ...... احمر دہائی دیتا رہ گیا۔

"اف تم لڑکیاں بھی......" موبائل ہاتھ میں آیا تو اس کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔ جبکہ وہ تینوں خاصی خوش نظر آ رہی تھیں۔

"اب تو یقین آ گیا نا۔"

"بالکل......" ونیزہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اس کال کا بل میں آپ سے لوں گا......" وہ دادو کے قریب بیٹھا۔

"اتنے غریب لگتے ہیں نہ کنجوس......"

"دادو زیب کی انگیجمنٹ ہوگئی ہے۔" فارینہ نے پوچھا۔ یہ وہ سوال تھا جو ہر بار چنیا کرنا بھول جاتی تھی۔

"ہوئی تو نہیں مگر عنقریب ہو جائے گی۔" دادو کے بولنے سے قبل ہی احمر بول اٹھا۔

"کس کے ساتھ۔"

"میرے ساتھ۔"

دادو کی دھپ احمر کی کندھے پر پڑی۔

"کیوں فضول بولتے ہو۔"

"سچ کہہ رہا ہوں زیب میری ہے' صرف میری۔"

جذباتی انداز میں بولا گیا یہ ڈائیلاگ فلمی تھا۔ دادو اس کے کان کھینچنے لگیں۔

چنیا نے بے حد جھنجھلا کر اس کی طرف دیکھا۔

"بھلا یہ اوٹ پٹانگ سا لڑکا زیب کے قابل تھا۔" اسے واقعی افسوس ہوا تھا۔

* * *

فرزانہ خالہ کا فون آیا تھا۔ وہ اور خالو بینا کی شادی پر پاکستان آ رہے تھے۔

"ہم چاہتے ہیں اس موقع پر جب سارا خاندان اکٹھا ہو تو منگنی کے بجائے نکاح کر دیا جائے۔ کیونکہ سمانہ کے کاغذات بھی بنوانے ہوں گے۔"

تائی امی نے یہ سنتے ہی رونا شروع کر دیا۔ اتنا اچھا رشتہ ملنے کی خوشی پر سمانہ کے دور جانے کا دکھ غالب آ گیا۔ سمانہ نے انہیں اپنی بیٹی سے زیادہ سکھ دیا تھا' بزرگوں کی میٹنگ بند کمرے میں ہوئی۔

سمانہ خود ایک دم چپ ہوگئی تھی۔

فراز الجھے ہوئے تھے۔

اور چنیا بے حد اداس' بار بار آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ کمرے میں آئی تو سمانہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے گم صم سی بیٹھی تھی۔ چنیا خاموشی سے اس کے پاس بیٹھی۔ پھر اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

سمانہ کی سرخ آنکھیں اس کے سامنے تھیں۔

''مانہ! تم امریکہ چلی جاؤ گی۔''

وہ خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''مانہ! تم روئی تھیں۔''

''نہیں تو......'' سمانہ نے مسکرانا چاہا مگر ایک دم رو دی اور چنیا اس سے لپٹ کر بہت دیر تک دونوں یونہی روتی رہی تھیں دل بھرا ہوا تھا۔ آنسو ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ پھر سمانہ نے اسے پرے دھکیلا اور روتے روتے ہنس دی۔

''پاگل ہے تو بھی چنیا! خوامخواہ مجھے بھی جذباتی کر دیا۔''

چنیا گیلی آنکھیں رگڑتی رہی۔

سمانہ نے چہرہ دوپٹے سے صاف کیا اور کھڑی ہوگئی۔

''میں بھی پاگل ہوں' کھانے کے بعد سب ہی چائے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

چنیا وہیں لیٹ گئی۔ سمانہ نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور یونہی ماچس کی تیلیاں جلانے بجھانے لگی' ریحان دروازے میں ہی ٹھٹک گئے۔ شاید چائے کا کہنے آئے تھے کچھ لمحے اس کی سرگرمی کو دیکھتے رہے۔

''چائے نہیں بنی ابھی تک۔''

وہ مڑ کر جواب دینے کو تھی پھر وہاں تھم گئی۔

''ابھی بن جاتی ہے۔''

ریحان نے اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی پوری طرح محسوس کی تھی۔ تب ہی اند آ گئے۔

''سمانہ! تم خوش ہو؟'' سمانہ کا دل پھر سے بھر آیا۔

''اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو کہہ سکتی ہو۔''

''میں نے فیصلے کا اختیار بڑوں کو دے رکھا ہے۔''

''تم خوش رہ سکو گی؟''

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔'' وہ ہر قسم کی صورتحال کیلئے تیار بیٹھی تھی۔

''چائے بن جائے تو جلدی بھجوا دینا۔'' ریحان پلٹ گئے۔ وہ ان کے لہجے میں چھپی مایوسی نہ کھوج پائی تھی۔

* * *

وہ سیڑھیوں پر بیٹھی ڈائجسٹ میں مگن تھی۔ جب یہ تائی امی برس پڑیں۔

''لوٹھا کی لوٹھا ہوگئی ہے' مگر عقل رتی بھر نہیں' گھر میں ہزاروں کام بکھرے ہیں۔ مگر ہاتھ ہلانا محال ہے۔ رسالے پڑھوالو اس سے۔''

''صرف ہاتھ ہلانا ہیں تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے ہلا لیتی ہوں۔''

''بری بات چنیا......'' مہمانوں کی لسٹ سامنے رکھے' کارڈز لکھتے ریحان نے عینک کے عقب سے سرزنش کی۔'' ہر چیز اعتدال میں اچھی لگتی ہے گڑیا۔''

وہ اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھی۔

''تین کارڈز مجھے بھی چاہئیں۔''

''اب سارے کالج کو مت بلا لینا......'' تائی امی نے گھورا۔

ریحان نے تین کارڈز اسے تھما دیئے تھے' جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ تائی امی کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ریحان نے بے حد ساتھ دیا تھا۔ دونوں طرف کی دوڑ دھوپ وہی کر رہے تھے۔ سنجیدہ سے ریحان کی شخصیت میں سنجیدگی کا عنصر کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ مگر اپنے کاموں میں الجھے لوگوں میں سے کسی کو بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ فراز ہمہ وقت کن سوچوں میں الجھے رہتے ہیں' کسی کو خبر نہ تھی۔ سب مصروف تھے اور آنے والے وقت سے لاعلم۔ چنیا وغیرہ آج کل ایک نئی رائٹر کے پیچھے پاگل پھر رہی تھیں۔ ''ہم جو کہلائے طلوع مہتاب بہت دنوں تک سب کے درمیان موضوع گفتگو بنا رہا۔ شام کو فارینہ نے فون کیا تھا۔

''چنیا! تجھے پتا ہے فاخرہ جبیں ساہیوال کی رہنے والی ہیں۔''

''ہیں سچ......''

''اسی لئے تو ان کے ہر ناول میں اپنے شہر کا حوالہ ملتا تھا۔''

''یااللہ! وہ کہاں رہتی ہوں گی۔''

''سنو! تم دادو سے بات کرنا امتل سے بات کر کے ان کا فون نمبر لے لیں۔'' فارینہ نے فرمائش کی۔

''دادو کو دے دیں گی۔''

''زیب کو تو دیں گی نا...... پلیز چنیا اس بار میرے لئے......''

''میں شام کو کارڈز دینے جاؤں گی۔ تب بات کروں گی۔''

اس نے فون بند کر دیا اور خوشی خوشی یہ خبر سب کو سنائی تھی۔ شام کو کارڈ دینے گئی تو پراصرار لہجے میں بولی تھی۔

''بس دادو! اب تو آپ کو ضرور آنا ہوگا۔''

"ہاں ہاں کیوں نہیں' اب تو آنا پڑے گا۔" دادو کارڈ کھول کر دیکھنے لگیں۔

"صرف دادو......" احمر نے گھورا۔

"آپ بھی آجایئے گا۔" وہ لاپروائی سے گویا ہوئی۔

"اس طرح تو ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"اُفوہ! اب کیا میں آپ کیلئے الگ سے کارڈ لکھتی۔ دادو کے ساتھ آجایئے گا نا۔"

"تب تک تو شاید زیب بھی یہاں آجائے۔" احمر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ریئلی......!" وہ اچھل ہی تو پڑی۔ "دادو! زیب کو لے کر ضرور آنا ہے۔ میں انہیں سب سے ملواؤں گی۔"

"دادو کا تو پتا نہیں مگر میں زیب کو لے کر ضرور آؤں گا۔" احمر نے کہا۔

"ان کیلئے تو میں علیحدہ سے کارڈ بھی دے سکتی ہوں۔"

"نہایت بے مروت لڑکی ہو۔" احمر نے مایوسی سے سر ہلایا تو مسکرا کر دادو کی طرف پلٹی۔

"دادو! اب میں چلتی ہوں' بہت سے کام ہیں۔ اوپر سے دسمبر ٹیسٹ......"

وہ یوں گویا ہوئی تھی جیسے سارے کام اسی کے ذمے ہیں اور آتے ہوئے فارینہ کی فرمائش نوٹس کروانا نہیں بھولی تھی۔

* * *

ماہ دسمبر کی ابر آلود صبح تھی۔ ہلکی ہلکی دھند کا غبار اونچے اونچے درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سبز گھاس پر اوس کے موتی جھلملا رہے تھے۔ سردی تھی مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ نہیں تھی۔ دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے وہ بند فوارے کے پاس آئی۔ پھر اس کی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ لئے ادھر ادھر گھومتی موسم کی خوبصورتی کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ونیزہ اور فارینہ ابھی تک نہیں آئی تھیں اور اس کا پہلا پیریڈ فری تھا۔

اس نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں" نکال لی۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جب خوبصورت لفظ اور خوبصورت موسم اٹریکٹ کرتے ہیں۔ ڈائریاں لکھ کر ان میں تتلی کے پر اور ادھ کھلی کلیاں رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی خوش رنگ تتلی کی طرح مٹھی میں محسوس ہوتی ہے۔

بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھی خوبصورت لفظوں کو اپنے اندر اتارتی رہی' تب ہی کسی نے عقب سے آکر اس کے گلے میں بازو ڈال کر گود میں گفٹ پیک رکھ دیا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو......"

وہ دونوں گھوم کر سامنے آئیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے وہ ہمیشہ کی طرح

اس دن کی اہمیت بھول گئی تھی۔ ونیزہ اور فارینہ کے چہرے پر اس سرپرائز کی کامیابی پر جوش اور خوشی مترشح تھی۔ گفٹ خود پیک کیا گیا تھا۔ جس پر ننھی منی کلیوں سے چنیا کا نام لکھا ہوا تھا۔

"آج چھ دسمبر ہے......" دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے وہ حیرت سے کہہ رہی تھی۔

"ہم لوگ تو صبح سے آئے ہوئے ہیں بیک سائیڈ پر' تمہارا گفٹ پیک کر رہے تھے۔ دیکھو کلیاں چنتے ہوئے کانٹے بھی لگوا لئے۔" فارینہ نے انگلیاں سامنے کیں۔

چنیا کی آنکھیں اس محبت پر ہلکی ہلکی نم ہونے لگیں تو ونیزہ نے شور مچا دیا۔

"گفٹ کھولو۔"

"اتنا خوبصورت پیک ہوا ہے' گھر جا کر کھولوں گی۔"

"ہرگز نہیں' تمہارے لئے پیک کیا تھا اور تم نے دیکھ لیا ہے۔"

اس نے پہلے تو احتیاط سے کلیوں کو الگ کر کے سنبھالا' پھر ریپر اتارا۔ فارینہ نے پرفیوم اور ونیزہ نے ڈائری گفٹ کی تھی۔ خوبصورت سے درختوں میں گھری رہگزر جس پر کرنوں کی چاندنی بکھری تھی۔ ونیزہ نے یہ کارڈ خود پینٹ کیا تھا۔

چنیا نے ڈائری کھولی۔ بہت سے بیل بوٹوں' پھول پتیوں کے درمیان ہیپی برتھ ڈے لکھا گیا تھا۔ اگلے صفحے پر کچھ اشعار۔

اگر تلاش کروں تو مل ہی جائے گا
مگر کون تمہاری طرح مجھ کو چاہے گا
تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا
تمہارے ساتھ یہ موسم گلابوں جیسا ہے
تمہارے بعد یہ موسم بہت رلائے گا

"مجھے رونا آرہا ہے......" آخری شعر پڑھتے ہوئے چنیا نے گلوگیر لہجے میں اطلاع دی۔

"خبردار......خبردار......" فارینہ نے شور مچایا اور پرفیوم کھول کر اس پر اسپرے کرنے لگی۔

چنیا نے اس کے ہاتھ سے پرفیوم جھپٹ لیا۔

"رونے کی تو تمہیں عادت ہے۔ یاد ہے جب پہلی بار تم سکول آئی تھیں تو کس طرح رو رہی تھیں۔" ونیزہ نے کہا۔ وہ تینوں نرسری سے ایک ساتھ تھیں۔

تینوں وہیں بیٹھی بچپن کی شرارتیں یاد کرتی رہیں۔ چنیا کے خرچ پر گرما گرم سموسے اور فروٹ چاٹ کھائی اور ٹھنڈی ٹھار بوتلیں ہاتھ میں لئے گراؤنڈ کے طول و عرض ناپتی رہیں۔

* * *

''آنٹی! میں چنیا کو اپنے ساتھ مارکیٹ لے جاؤں۔'' فراز نے پوچھا۔

''اب آئے ہیں موصوف لائن پر......'' سمانہ نے مسکراہٹ چھپانے کو منہ نیچے کرلیا۔

''کچھ خریدنا ہے بیٹا......!'' انہوں نے محبت سے پوچھا۔ سمانہ کے حوالے سے فراز انہیں خاصے عزیز ہو چلے تھے۔

''آج برتھ ڈے ہے چنیا کا' میں اس کی پسند سے گفٹ خریدنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ چنیا جو بڑی خوشی سے اٹھی تھی تائی امی کا جملہ سن کر بیٹھ گئی جو کہہ رہی تھیں۔

''لو بیٹا! یہ کوئی بچی ہے۔ جو سالگرہ مناتے پھریں۔ پھر یہ تو غیروں کے چونچلے ہوتے ہیں۔ جو......''

''غیروں کی بات نہیں ہے آنٹی! مجھے اسے گفٹ دینا ہے۔ آخر وہ میری......'' وہ جھنجلا کر بولے تھے۔ پھر جملہ یوں ادھورا چھوڑا جیسے چنیا کے ساتھ اپنا رشتہ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ وہ ہنسنے لگی تھی۔ وہ واقعی یہی سمجھی تھی کہ فراز کو سمانہ کے حوالے سے چنیا کے ساتھ اپنا رشتہ سمجھ میں نہیں آیا۔

''اچھا بابا! لے جاؤ......'' تائی امی نے اجازت دی تو وہ خوشی خوشی تیار ہونے لگی۔

''کون سا گفٹ لوگی؟'' سوڑی گلی کے سامنے بائیک روک کر انہوں نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم؟''

''جو...... جو دل چاہتا ہے' خرید لو......'' انہوں نے فراخ دلی سے کہا۔

''جی نہیں جو آپ کا دل چاہتا ہے' لے دیں۔''

''کتاب کون سی لوگی؟''

رحمان بک ڈپو کے اندر جاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ شیشے کے اس پار قطار در قطار لگی کتابوں میں سے انتخاب مشکل ہوگیا۔ اس نے ''خوشبو'' اور ''شام کے بعد'' اٹھا لیں۔ کافی عرصے سے خواہش تھی انہیں پڑھنے کی۔

''سنی آڈیو سینٹر'' سے رحیم شاہ اور فاخر کے کیسٹ دلانے کے بعد ''تن زیب'' سے اپنی پسند کا پیچ اور بلیک کنٹراسٹ کا سوٹ پیک کروا لیا۔ دو ہزار کا تو سوٹ تھا۔ وہ نہ...... نہ کرتی رہ گئی۔

''اب اور کچھ نہیں لوں گی۔''

تائی امی سے ڈانٹ پکی تھی۔ آتے ہوئے انہوں نے سرگوشی بھی کی تھی کہ زیادہ مہنگا گفٹ نہیں لینا۔ اور یہاں اتنا مہنگا سوٹ خرید لیا۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہو جانے والی لڑکی تھی۔ وہ اسے لے کر جیولری کی طرف پلٹ گئے۔

''یہاں سے کیا لینا ہے؟''

وہ ٹھٹک کر صفدر جیولرز کے سامنے رک گئی۔

''کسی کیلئے کچھ لینا ہے' آ جاؤ۔'' پھر شرارت سے مسکرا دی۔

نت نئے ڈیزائن کے جگر جگر کرتے زیورات کا سنہری پن ہر چیز پر حاوی تھا۔ فراز بہت کچھ نکلوا کر دیکھتے رہے۔ چوڑیاں' کڑے' پازیب' لاکٹ' بریسلیٹ......

''پسند کرو۔''

''کتنے پیسے ہیں آپ کے پاس......!'' متذبذب سی سرگوشی' مگر پوچھنا ضروری تھا' پھر ہی کچھ پسند کرتی۔

''بہت ہیں' تم بس پسند کرو۔''

چنیا کی نظریں نازک سی پازیب پر رک گئیں۔ سمانہ نے ایک بار بینا سے کہا تھا اسے گولڈ کی پازیب پہننے کا بہت شوق ہے۔ فراز نے کوٹ کی اندرونی جیب سے والٹ نکالا جو نیلے' سرخ نوٹوں سے بھرا تھا۔ پازیب کا کیس انہوں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہی ڈالا تھا۔ اس کے بعد ان کی بائیک فائیو ویز کے سامنے رکی تھی۔

''آج تو کوئی اعتراض نہیں۔''

''آج تو پوچھ کر آئے ہیں۔'' وہ ہنس دی۔

''تم بیٹھ کر مینو دیکھو' میں ایک فون کر آؤں۔'' فراز کہہ کر چلے گئے وہ مینو دیکھنے لگی۔ نجانے کیا الا بلا لکھا تھا فراز کے آنے پر اس نے اپنے لئے چکن برگر اور فراز نے سوپ منگوا لیا تھا۔

''آج بہت مزا آیا۔'' وہ یہ جملہ کئی بار کہہ چکی تھی۔ فراز مسکراتے ہوئے سوپ پیتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ کافی پیتے ہوئے انہیں اپنی پچھلی سالگراؤں کے واقعات سنا رہی تھی تو ویٹر نے ادھ کھلے سرخ گلابوں کا بوکے لا کر فراز کو تھما دیا۔

''ہیپی برتھ ڈے......'' فراز نے بوکے اس کی طرف بڑھایا۔

''اوہ گاڈ......'' دونوں ہتھیلیاں گالوں پر رکھ کر حیرت کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوئے وہ شرم سے سرخ ہوگئی۔ فراز اس کی اٹھتی گرتی پلکوں میں الجھ کر رہ گئے۔

وہ بہت مسرور سی واپس لوٹی تھی۔ شاپنگ تائی امی کے سامنے ڈھیر کر کے وہ بینا کو چھیڑنے لگی۔

''مانہ کے تو عیش ہوگئے' آپ جایئے گا چک 44 میں' کبھی بھولے سے بھی کسی کو گفٹ دیا

ہو‘ کنجوس لوگ۔‘‘

’’ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔‘‘ بینا نے کان سے مکھی اڑائی۔ وہ چیچہ وطنی کے چک 44 بی بھی خوش تھی۔

چنیا سمانہ کے کان پر جھک گئی۔

* * *

ٹی وی‘ سکرین پر نظریں جمائے وہ کب سے ایک ہی زاویے سے بیٹھے تھے۔ اپنے اردگرد ہونے والی افراتفری سے یکسر لاتعلق۔ سمانہ نے ان کے سامنے چائے کی پیالی رکھی اور جلدی جلدی کچن کا بکھیڑا وہ سمیٹنے لگی۔ بینا آج خریدے جانے والے سامان کی لسٹ بنا رہی تھی۔ اور باآواز بلند سمانہ کے ساتھ ڈسکس بھی کر رہی تھی۔ تائی امی جلدی جلدی گیلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

’’گھر کا خیال رکھنا فراز بیٹا! چنیا آئے تو اس سے کہنا پہلے کھانا کھا لے۔ ہمیں تو کچھ دیر ہو جائے گی۔‘‘

فراز نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ شادی کے دن جوں جوں نزدیک آ رہے تھے۔ بازار کے تقریباً روز ہی چکر لگتے۔ چند لمحوں کے بعد ساری آوازیں معدوم ہو گئیں۔ خالی گھر پر سناٹا راج ہو گیا۔ ان کے ذہن میں نت نئے خیالات اودھم مچا رہے تھے۔ پھر ان کا ہاتھ دھیرے سے کوٹ کے اندر رینگ گیا۔ ان کی انگلیاں مخملیں کیس کی نرمی کو محسوس کر رہی تھیں۔

تب ہی بیرونی دروازہ کھلا اور چنیا کی آواز آئی۔ ان کے اعصاب تن سے گئے۔

’’ارے بھئی! کہاں چلے گئے ہیں سب......‘‘ اس نے اندر آ کر بیگ صوفے پر رکھا۔ فائل بھی رکھی‘ جوتے اتارے‘ پھر خود ہی جواب دیا۔ ’’یقیناً بازار گئے ہوں گے۔ کتنی بار کہتی ہوں میرا بھی انتظار کر لیا کریں‘ مگر مجھے تو بچہ ہی سمجھتے ہیں۔‘‘

وہ بولتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ حسب عادت ہاتھ منہ اور پاؤں دھونے کے بعد اپنا کھانا نکالا اور وہیں آ گئی۔ کوئی ڈرامہ دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ کھانا کھانے کے ساتھ تبصرہ بھی ہونے لگا۔ فراز کی انگلیاں مخملیں کیس پر رینگتی رہیں۔

’’آج کالج میں بہت بور ہوئے......‘‘ وہ کالج کی چھوٹی چھوٹی باتیں سناتی رہی۔ پھر ان کی بے توجہی محسوس کر کے ذرا سا جھک کر ان کا چہرہ کھوجتے ہوئے پوچھنے لگی۔

’’آپ ٹی وی دیکھ رہے ہیں مجھے سن رہے ہیں یا کچھ سوچ رہے ہیں۔‘‘ فراز مسکرا دیے۔

’’چائے پلواؤ گی۔‘‘

’’ابھی بناتی ہوں میرا بھی موڈ ہو رہا ہے۔‘‘

وہ خالی برتن اٹھا کر چلی گئی۔ فراز کے چہرے پر ایک بار پھر گہری سنجیدگی بکھر گئی تھی۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

’’لیں گرما گرم چائے۔ مگر آپ نے کھانا تو کھا لیا تھا نا۔‘‘ اس نے سامنے کپ رکھتے ہوئے پوچھا۔

’’ہوں......‘‘ انہوں نے کپ اٹھا لیا۔ چنیا اپنا کپ لے کر صوفے پر آ بیٹھی۔ دونوں پاؤں پھر اوپر رکھ لئے۔

وہ کچھ لمحے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر پوچھنے لگی۔

’’فراز بھائی! آپ اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہیں؟‘‘

فراز کی نظر بھٹک کر اس کے پیروں پر جا پڑی۔ صوفے میں دھنسے سپید کبوتر‘ گلابی ایڑیاں‘ صاف ستھرے ترشے ہوئے ناخن‘ نرم و نازک جلد‘ ایڑی کے پاس سیاہ تل میں کھو کر وہ جواب دینا بھول گئے۔

چنیا نے کچھ لمحے جواب کا انتظار کیا‘ پھر اپنی بات کرنے لگی۔

فراز کی انگلیوں کی پوروں میں عجیب سی بے چینی آن بسی۔ انہوں نے اضطراری انداز میں انگلیوں کو کھولا اور بند کیا۔ ان کی نظریں وقفے وقفے سے وہیں بھٹک رہی تھیں۔ پھر اسی کیفیت میں ان کا ہاتھ آگے بڑھا......

چنیا نے گویا کرنٹ کھا کر پاؤں کھینچا تھا۔ تحیر سے انہیں دیکھا۔ پھر سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

’’توبہ ہے ڈرا دیا...... کیا تھا......؟‘‘ وہ پاؤں جھٹک کر دیکھنے لگی‘ وہ سمجھی فراز نے کوئی کیڑا وغیرہ رینگتا دیکھ لیا ہے۔

’’کچھ نہیں......‘‘ انہوں نے ایک طویل سانس کھینچ کر کپ ٹیبل پر رکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کیس نکال لیا۔ ایک پل لگا تھا اور انہیں لگا فیصلہ ہو گیا ہے۔

الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ آ گیا۔

’’ارے یہ ابھی تک آپ ساتھ لئے پھر رہے ہیں۔‘‘

وہ کیس کھول کر پازیب نکال رہے تھے۔ ایک پازیب ہاتھ میں لے کر انہوں نے کیس بند کر کے سائیڈ پر رکھا۔

’’یہ ابھی تک آپ......‘‘ اگلے لمحے الفاظ زبان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ فراز نے ہاتھ بڑھا کر اس کا پاؤں تھام لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے پازیب پہنانے لگے۔

چنیا نے جھٹکے سے پاؤں کھینچا۔

"یہ...... یہ کیا کر رہے ہیں فراز بھائی...... یہ...... یہ تو مانہ کیلئے خریدی تھی۔"

"میں نے تمہارے لئے لی تھی۔" ٹھنڈے لہجے میں کہہ کر انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوگئی۔

"نہیں فراز بھائی! میں یہ نہیں لے سکتی۔"

اس نے جانا چاہا۔ فراز نے اس کی کلائی کھینچ کر دوبارہ صوفے پر دھکیل دیا۔

"میری بات سنو......"

ان کا لہجہ اتنا سرد اور سخت تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ بس پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ فراز نے اک طویل سانس لے کر پازیب ٹیبل پر رکھ دی اور اس کی طرف پلٹے۔

"پلیز ریلیکس مجھے تم سے کچھ کہنا ہے چنیا۔"

ان کا مدھم لہجہ بھی چنیا کے چہرے پر چھائی وحشت کو دور نہ کرسکا۔

"میں نے بہت جلدی کی فیصلہ کرنے میں' سمانہ اور میں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔"

فراز کی بھاری آواز نے اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔ اس کے اندر سویا خوف سانپ کی طرح پھن پھیلا کر پھنکارنے لگا۔ سامنے بیٹھے شخص کا چہرہ غائب ہوگیا۔ بس کچھ لفظ تھے جو کوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

"تم میں زندگی ہے...... زندگی کو محسوس کرنے کا جذبہ ہے۔ میں...... میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں...... چنیا...... عمروں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر جذبے ایک ہوں...... میں اور تم......"

چنیا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ فراز کو دھکیل کر وہ سرپٹ باہر بھاگی اور اپنے کمرے میں گم گئی۔ فراز کھڑے ہوئے مگر چٹخنی لگنے کی آواز پر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رہ گئے۔ چنیا کے روعمل بلکہ اتنے شدید ردعمل کیلئے وہ تیار نہ تھے۔

نجانے کتنا وقت گزرا تھا۔ ریحان کی آواز پر چونک کر سر اٹھایا۔ وہ دروازے میں کھڑے پوچھ رہے تھے۔

"سب لوگ مارکیٹ گئے ہیں؟"

فراز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور چنیا......"

"معلوم نہیں......" وہ نظریں چرا کر روکھے سے لہجے میں بولے تھے۔

ریحان واپس پلٹ گئے۔ کچن بھی خالی تھا۔ اور اس کے کمرے کا دروازہ بند۔

انہوں نے کچھ حیران ہو کر دستک دی۔

"چنیا! اندر کیوں بیٹھی ہو بھئی' باہر نکلو۔" جواب ندارد تھا۔

"چنیا گڑیا! ریحان بھائی کو ایک کپ چائے بھی نہ بنا کر دو گی۔"

ان کے پرشفقت لہجے کا حوصلہ پا کر چنیا نے دروازہ کھولا تھا۔

ریحان ٹھٹک گئے۔

"چنیا! کیا ہوا؟"

وہ سر جھکا کر دوبارہ امڈ آنے والے آنسوؤں پر بند باندھتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

"تم روئی ہو؟"

اور وہ یونہی آگے کو جھک گئی۔ ان کے کندھے پر سر رکھ کر روئی تو پھر روتی چلی گئی۔ ریحان پوچھ پوچھ کر تھک گئے۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے سر اٹھایا۔

"میں ڈر گئی تھی۔"

"کس سے......؟" انہوں نے الجھ کر پوچھا۔

"کسی سے نہیں...... بس یونہی......" وہ گویا پھر سے ڈر گئی۔ "اکیلی تھی نا!"

"مگر فراز تو گھر پر ہی تھا۔"

چنیا نے جواب نہیں دیا۔ بس آنسو پونچھتی رہی۔

"اچھا ٹھیک ہے' اب گھبرانے کی ضرورت نہیں میں گھر پر ہی ہوں۔" انہوں نے آہستگی سے سر تھپتھپایا۔ اک سرسری نگاہ اس کے وجود پر ڈالی' پھر نظر چرا کر پلٹ گئے۔ لاؤنج خالی تھا۔ ان کی متلاشی نگاہیں نجانے کس چیز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ چنیا کا بیگ' فائل جوتے چائے کے دو کپ' پھر ان کی نگاہ کی گرفت میں وہ چیز بھی آگئی۔ چنیا کا دوپٹہ صوفے پر پڑا تھا۔

اشتعال کی اک تیز لہر ان کے اندر سے ابھری تھی۔

* * *

"یہ کوئی وقت تھا بیمار ہونے کا۔ اتنے ڈھیروں کام' چند دنوں میں مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ اب تمہاری تیمارداری کروں یا باقی کام دیکھوں۔"

تائی امی کا پیار کرنے کا بھی اپنا ہی انداز تھا۔

چنیا نے کروٹ بدلی۔ ان کی گود میں منہ چھپا کر بازو کمر کے گرد کس لیا۔ گویا اٹھنے کا ارادہ

بھی تھا تو اب نہیں اٹھ سکتی تھیں۔

''اس دن صبح صبح سر دھو لیا۔ گویا شیمپو کیے بنا تجھے کالج میں گھسنے نہیں دیں گے۔ لگ گئی نا ٹھنڈ۔ اب کڑوے کسیلے سیرپ پینے پڑیں گے تو شور مچائے گی۔''

مگر اس نے سارے کڑوے کسیلے سیرپ آرام سے پی لئے۔

''اس بار چنیا کا بخار عجیب سا نہیں ہے۔'' بینا اس کے خاموش رہنے پر چھیڑتی۔ فراز طبیعت پوچھنے کمرے میں آئے تھے اس نے تائی امی کی گود میں منہ چھپا لیا۔ وہ چنیا کو سوتا سمجھ کر سرگوشیوں میں بات کرتی رہیں۔

''تب ہی سمانہ نے آ کر بتایا۔'' اوکاڑہ سے چھوٹی خالہ کا فون ہے۔''

تائی امی اتنی تیزی سے اٹھیں کہ چنیا کے ہاتھ میں محض دوپٹہ رہ گیا۔ جسے اس نے سختی سے تھام لیا۔

''کیا بچوں جیسی حرکتیں ہیں چنیا! اب فون تو سننے دے۔''

انہوں نے دوپٹہ کھینچا اور باہر نکل گئیں۔ وہ خوف سے سن ہو گئی۔ کمبل کے اندر چھپ کر دونوں ہاتھوں میں اس کے سرے دبوچ لئے۔

''چنیا......'' فراز کا لہجہ مدھم اور محبت بھرا تھا۔ وہ کانپ گئی۔

''چنیا! میری بات سنو۔'' انہوں نے کمبل ہلایا تھا۔ اس نے کچھ اور سختی سے پکڑ لیا۔

''میں تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ اور نہ میں نے یہ بات مذاق میں کہی ہے۔ آئی ریئلی لو یو...... اور ابھی بھی دیر تو نہیں ہوئی۔ میں بات کروں گا سب سے سمانہ میرے ساتھ ہے۔ نہیں کرتی۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز چنیا! تم کوئی ریسپانس تو دو۔''

وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔ تائی امی کچھ کہتی ہوئی آ رہی تھیں۔ فراز کھڑے ہو گئے۔

''میں جس رستے پر قدم رکھ چکا ہوں۔ وہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ اور تمہیں ساتھ دینا ہو گا۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئے۔

''زبیدہ کا فون تھا۔ مہندی اور مایوں کے فنکشن کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔'' انہوں نے کمبل کو ہاتھ لگایا تو اس کی گرفت خود بخود کمزور پڑ گئی۔

''ارے......!'' انہوں نے پسینہ پسینہ چہرہ دیکھا تو پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے لگتا ہے اثر کر رہی ہے۔''

اس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ گرم گرم آنسو پلکوں کی باڑ سے نکل کر کنپٹی پر بہنے لگے۔ تائی امی نے جھک کر پیشانی چوم لی۔

''فکر کیوں کرتی ہے میری بچی...... دیکھنا کتنی جلدی آرام آئے گا۔''

* * *

وہ سیڑھیوں پر بیٹھی خاموش نگاہوں سے سب کو مصروف دیکھ رہی تھی۔ اتوار کا دن تھا سب ہی گھر پر موجود تھے۔ فراز کو اس سے مزید بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ زیادہ تر مانہ یا تائی امی کے ساتھ لگی رہتی۔

''ذرا سے بخار سے کیسی کملا گئی ہے بچی۔''

تائی امی نے کہا۔ شیو بناتے ریحان نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اور دوبارہ سے مصروف ہو گئے۔ کل ڈی سی کا دورہ تھا۔ وہ رات دو بجے واپس آئے تھے اسی لئے صبح دیر سے اٹھے تھے۔

سمانہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

''اتنی خاموش کیوں ہو گئی ہو چنیا۔'' اس نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

چنیا کا دل بھر آیا۔ جی چاہا اس کے ساتھ لپٹ کر روتے روتے سب کچھ بتا دے۔ مگر پھر ڈر گئی۔

''ہمیں آج بازار جانا ہے۔ اکیلی گھبراؤ گی تو نہیں۔''

چنیا نے دہل کر سمانہ کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ دبوچ کر بولی۔

''میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔''

''پتا ہے وہاں کتنی خواری ہوتی ہے۔ ساری مارکیٹ گھماتی ہے بینا......'' سمانہ ہنس دی ''تم تھک جاؤ گی۔ گھر رہ کر آرام کرنا۔''

ریحان کی نظریں واش روم کے آئینے میں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ساتھ جانے پر بضد تھی۔ سمانہ سمجھا رہی تھی۔

''مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔''

''کس سے ڈر لگے گا فراز ہوں گے گھر پر۔ ان کے ساتھ لوڈو کھیلنا۔ ٹی وی دیکھ لینا۔'' وہ یک دم چپ ہوئی۔ مگر ساتھ جانے کی ضد نہیں چھوڑی۔ سمانہ چڑ گئی۔ نجانے اتنی ضد کیوں کر رہی تھی۔ وہاں جا کر بھی تنگ کرتی کہ گھر چلیں۔ جبکہ آج بینا کا عروسی جوڑا خریدنا تھا۔ جس کیلئے ظاہر ہے ساری مارکیٹ گھماتی۔

''کیا بات ہے بھئی، کس لئے ضد کر رہی ہے ہماری چنیا گڑیا۔''

ریحان پلٹ کر اس کے قریب آئے اور اس کے بال بکھیرتے ہوئے پوچھنے لگے۔ فراز باہر سے آ رہے تھے۔ چنیا نے چہرہ جھکا لیا۔ فراز اسے دیکھتے ہوئے اندر چلے گئے۔

"اکیلے رہنے سے گھبرا رہی ہے۔"

"گھبراہٹ کس بات کی۔ میں ہوں نا آج گھر پر۔"

چنیا نے آہستگی سے چہرہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"آپ کو کہیں جانا تو نہیں۔"

"بالکل نہیں۔"

"ٹھیک ہے سمانہ آپی! آپ چلی جائیں۔"

ان کے جانے کے بعد ریحان اسے گاؤں میں ہونے والی تیاریوں کے بارے میں بتا رہے۔ وہ کبھی اتنا نہیں بولتے تھے مگر آج بول رہے تھے۔ چنیا کا پورا کا پورا دھیان عقب والے کمرے کی طرف تھا' جہاں فراز موجود تھے۔ کتنا اتراتے ہوئے اس نے فارینہ اور دنیزہ کو اس دن کی روداد سنائی تھی۔ اپنے گفٹس دکھائے تھے۔ ان ادھ کھلے گلابوں کو سنبھال سنبھال کر ہاتھ میں رکھا تھا۔ سمانہ کی قسمت پر رشک کیا تھا' مگر سب ختم ہوگیا۔

لوگ یوں بھی کر سکتے ہیں؟

اس طرح بھی سوچ سکتے ہیں؟

پاکیزہ رشتوں کو یوں بھی پامال کیا جا سکتا ہے۔

سمانہ کے حوالے سے کتنے اونچے سنگھاسن پر بٹھایا تھا فراز کو۔

تب ہی ریحان نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر آہستگی سے پوچھا۔

"چنیا! فراز سے کیوں گھبراتی ہو؟"

چنیا نے سہم کر انہیں دیکھا۔ چہرہ ایک دم پیلا پھٹک ہوگیا۔

"ن......نہیں تو......" اس کی آنکھوں میں اتنا خوف تھا کہ ریحان کو بات بدلنا پڑی۔

"چلو! تمہیں دادو کی طرف چھوڑ آؤں' طبیعت بہل جائے گی۔" وہ بھی فوراً کھڑی ہوگئی۔

"کپڑے نہیں بدلو گی؟"

"نہیں ٹھیک ہیں۔"

دونوں باہر نکل آئے۔ ریحان متذبذب تھے۔ اس سے پوچھنا چاہتے تھے' انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ خاموشی سے سر اٹھائے چل رہی تھی۔

"زندگی میں اگر کوئی پرابلم ہو تو اسے اپنوں کے ساتھ شیئر کر لیتے ہیں۔ دل میں رکھے چھپانے سے الجھنیں صرف بڑھتی ہیں۔"

"میں کب کچھ چھپا رہی ہوں۔" وہ ان کی بات کے جواب میں گڑبڑا گئی۔

"میں نے یہ کب کہا' بس یونہی ایک عام سی بات کی تھی کہ ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار کرنا چاہئے۔ اور میں تو تمہارا بھائی ہوں نا بیٹا!" باپ جیسی شفقت لہجے میں سموئے وہ اسے اعتبار ہی تو دینا چاہتے تھے کہ وہ کچھ تو کہنے پر آمادہ ہو۔

"اور......اور......لوگ آپ ہی غلط سمجھ لیں تو......" متذبذب سی چنیا ایک ہی جملے میں اپنا خوف بیان کر گئی تھی۔ وہ اس کے ایک ہی جملے سے بہت کچھ اخذ کر گئے تھے۔

"اگر آپ غلط نہیں ہو تو کوئی کیسے آپ کو غلط سمجھ سکتا ہے اور سچائی تو اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے۔"

نرم حوصلہ بڑھاتا لہجہ۔ مگر کہنے کی ہمت اب بھی نہیں تھی۔ وہ خاموش ہی رہی۔ دادو اور احمر اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گئے۔

"اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو۔" دادو نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

"بیمار ہوگئی تھی۔"

"اسی لئے میں بھی تو محسن بھائی کے گھر چلی گئی۔ ورنہ فون کر کے ہی پتا کر لیتی۔ آج سوچ رہی تھی کہ کروں گی۔" دادو نے کہا وہ خاموش ہی رہی۔

"یہ بخار کیا تمہاری زبان بھی لے گیا۔" احمر نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔ وہ مضمحل سا مسکرائی تھی۔ پھر سارا دن اس نے وہیں گزارا تھا۔ دادو نے اپنے ہاتھوں سے اس کیلئے بہت کچھ بنایا تھا۔ دل بھی نہیں چاہتا تھا مگر دادو کی وجہ سے کچھ نہ کچھ کھانا پڑا' شام کو جب بینا نے فون کیا۔ وہ تب ہی واپس آئی تھی۔ سب بڑے کمرے میں جمع تھے۔ سامنے جگر جگر کرتے زیورات اور خوبصورت لہنگے پھیلے تھے۔

"دیکھو چنیا! یہ بینا کا لہنگا ہے۔" تائی امی نے پکارا تو وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ "اور یہ سمانہ کا۔"

"سمانہ کا......" اس نے تحیر سے سمانہ کو دیکھا۔

"ہاں تو کیا سادہ کپڑوں میں نکاح ہوگا۔ یہ سیٹ بھی خریدا ہے۔" انہوں نے زیور کا ڈبا کھول کر سامنے کیا۔ وہ کبھی سمانہ کو دیکھتی تھی تو کبھی زیورات کو۔ بینا نے ہاتھ بڑھا کر ٹیکا اٹھا لیا اور سمانہ کے ماتھے پر رکھ کر بولی۔

"دیکھو کتنا پیارا لگ رہا ہے۔"

اس کی نظریں ٹیکے سے الجھنے لگیں۔ پھر عقب میں کھڑے فراز پر نگاہ پڑی وہ کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے ڈبا چھوٹ گیا۔

''ارے دھیان سے۔''

تائی امی نے کہا۔ بینا نے شور مچا دیا کہ اب فراز سے سمانہ کا پردہ ہونا چاہئے۔ سمانہ نے کچھ چیزیں اس کے ہاتھ میں تھماویں' کچھ خود اٹھالیں۔ وہ چیزیں اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ فراز بینا کو جواب دینے کے بہانے ذرا سا آگے کھسک آئے۔

''اب بھی اگر تم چاہو تو......''

تیر کی طرح سرگوشی لگی۔ وہ گھبرا کر سمانہ کے پیچھے بھاگی تھی۔ سمانہ نے سارا سامان بیڈ پر ڈھیر کردیا' اب ایک ایک چیز الگ سے سنبھال رہی تھی۔ چنیا بے دم سی ہوکر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا چنیا! تمہیں ساری چیزیں اچھی نہیں لگیں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ امی آج یہ سب خریدیں گی۔ ورنہ تمہیں ساتھ ضرور لے کر جاتی۔'' سمانہ سمجھی وہ خفا ہوگئی۔

''مانہ! تم ان سے شادی مت کرو۔'' وہ اچانک بولی۔

''کیوں بھئی......'' سمانہ ہنس دی۔

''وہ......'' اس نے تھوک نگلا۔ ''وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔''

''کیوں......؟'' اب کے سمانہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

''وہ تمہیں مجھ سے دور لے جائیں گے۔'' کچھ نہیں سوجھا تو وہ رو دی۔ ''میں بہت اکیلی رہ جاؤں گی۔ مانہ۔''

سمانہ نے پاس آکر اسے ساتھ لگا لیا۔

''شادی کسی نہ کسی کے ساتھ تو ہونا ہی تھی چنیا! اور فراز تو بہت اچھے ہیں۔ تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ہم دونوں وہاں جا کر تمہارے لئے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈیں گے تاکہ تمہیں بھی اپنے پاس بلوا سکیں۔''

سمانہ اس کا مسئلہ نہیں سمجھ سکتی تھی' اسے کچھ اور شدت سے رونا آگیا۔

* * *

امریکہ سے خالہ اور خالو آگئے تھے۔ گریس فل سے انکل کمال' اپنی عمر سے کہیں ینگ لگتی خالہ' تائی امی نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ یہ وہی تھی گیارہ چک کی چھوٹی نہر میں بھینسوں کو پانی پلانے والی۔ اب ساڑھی باندھے۔ ڈائمنڈ پہنے' بال سیٹ کروائے۔ ایک جملے میں کئی لفظ انگریزی کے۔

''اللہ کی شان ہے۔'' وہ بس یہی کہہ پائی تھیں۔

''میری بہن کی نشانیاں۔'' ان دونوں کو اپنے ساتھ لپٹا کر بہت دیر تک پیار کرتی رہیں۔

سمانہ پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ چنیا ان سے قصداً دور دور ہی رہی تھی۔ ہفتے کو بینا کو مایوں بٹھانا تھا اور اسی دن سے مہمان آنا شروع ہوجاتے۔ خالہ اپنی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ اگرچہ صرف نکاح ہونا تھا مگر ان کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ چنیا جلے پاؤں کی بلی کی طرح پھرتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کس کو بتائے۔ چپ چاپ سمانہ کی شادی ایسے شخص سے ہوجانے دے جو اس کے ساتھ باوفا ہی نہیں تھا۔ لیکن اگر کسی کو معلوم ہوجائے کہ وہ کیا چاہتا ہے تو...... اس سے آگے وہ خوفزدہ ہوجاتی ساری ہمت دم توڑ دیتی۔ فراز کی نگاہوں سے اسے خوف آتا جو ہمہ وقت اس کا طواف کرتیں۔ وہ اس سے بچتی پھرتی۔ مگر دونوں نہیں جانتے تھے کسی اور کی نگاہیں ان دونوں کا طواف کرتی تھیں۔

وہ کچن میں برتن رکھنے آئی تھی۔ جب فراز اس کے پیچھے چلے آئے۔

''تم دیر کردو گی چنیا۔'' اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ گئے۔

''آ...... آپ چلے جائیں یہاں سے۔''

''تم دیر کردو گی تو بہت کچھ غلط ہوجائے گا' تم کچھ تو کہو......'' وہ بے حد جھنجھلائے ہوئے تھے۔

''مجھے کچھ نہیں کہنا' مجھے جانے دیں۔''

وہ راستہ روکے کھڑے تھے۔

''ٹھیک ہے' اب جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ دار تم ہوگی۔ میں کرلوں گا سمانہ سے شادی مگر یاد رکھو میں کبھی اسے خوش نہیں رکھ سکوں گا۔ پھر تم مجھے کوئی الزام نہیں دے سکوگی' نہ مجھے خود سے محبت کرنے سے روک سکتی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں چنیا اور کرتا رہوں گا یہ میری......''

کسی نے فراز کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹا اور دوسرے پل ریحان کا مکا فراز کے چہرے پر پڑا تھا۔ اس سے قبل کہ جواباً وہ کچھ کرتے وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ چنیا کو لگا وہ بے ہوش ہوکر گر جائے گی نجانے کون سی ہمت تھی جس نے اسے بھاگ کر کمرے میں گھسنے پر مجبور کیا تھا۔ باہر شور تھا آوازیں اور ہنگامہ' سب اونچا اونچا کچھ بولنے لگے تھے۔ وہ اندر تھر تھر کانپتی رہی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر اسے خبر نہیں تھی وہ رو رہی ہے۔ اسے لگتا تھا ابھی کوئی آجائے گا اور اس پر الزام رکھ دے گا۔ دھیرے دھیرے شور میں کمی ہوئی۔ ہنگامہ ماند پڑنے لگا۔ آوازیں معدوم ہوگئیں۔ نجانے کتنا وقت گزرا تھا باہر اک ہولناک سناٹا چھا گیا تھا۔ چنیا کو لگتا تھا اس سناٹے کے پیچھے اک اور طوفان چھپا ہے۔

پھر دروازہ چرچرایا۔

اس کا دل اتھاہ گہرائی میں جا ڈوبا۔
بس خوفزدہ نظروں سے دروازہ کھلتا دیکھتی رہی۔
سانہ اندر آئی تھی۔
چنیا اضطراری انداز میں کھڑی ہوئی۔ اس کی ڈری سہمی نظریں سانہ کے چہرے سے ٹکرائیں۔
جو حد درجہ سپاٹ اور سنجیدہ تھا۔
''مانہ...... میں......'' پھر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں کی روانی میں کچھ اور شدت آ گئی۔ سانہ نے اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھا۔ پھر اس کے بازو پھیلے اور چنیا کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ چنیا اس کے ساتھ لپٹ کر کھل کر روئی تھی۔

* * *

وہی گھر تھا' مگر آج اس کی فضا کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ شوخ رنگ پیراہنوں میں ملبوس' پُرمسرت شاداب چہرہ' حنا کی خوشبو' پیلے پھولوں کی بہار' ڈھولک کی تھاپ' گیتوں کی جھنکار' چنیا بھی سبز چوڑی دار پائجامہ پیلے کرتے اور دوپٹے میں ملبوس چوکتی پھر رہی تھی۔ ونیزہ اور فارینہ بھی موجود تھیں۔ آج بینا کی مایوں کی رسم ہونا تھی۔ بڑی بوڑھیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ تیل لگا لگا کر اور مٹھائی کھلا کھلا کر برا حال کر دیا تھا۔
''چنیا! آ جاؤ تم بھی تصویر بنوالو۔'' اس کا تایا زاد یاسر کیمرہ ہاتھ میں لئے پھر رہا تھا۔ اسے پکارا تو وہ بینا کے پاس گھس کر بیٹھ گئی۔
''چہ...... چہ...... اب کیا ہوگا۔ بے چاری سانہ...... ریحان کے نام تو لاہور میں کوئی فلیٹ بھی نہیں' چیچہ وطنی کے چک 44 میں زندگی گزارے گی۔'' بینا نے سرگوشی کی۔
''جی نہیں' وہ یہاں رہیں گی تحصیلدار ہاؤس میں......'' وہ تنک کر بولی تھی۔ سانہ اس کی بات سن کر ہنس دی۔ تب ہی اس کے عقب میں کوئی ہلکے سے کھنکارا وہ پلٹنے کو تھی پھر یونہی پلیٹ پکڑے کھڑی رہی۔ ہر کوئی رسم میں مگن تھا۔
''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔' وہ عقب میں کھڑے پوچھ رہے تھے۔
''میں نے فیصلہ بڑوں پر چھوڑ رکھا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔
''خوش رہ سکو گی۔''
اس نے جواب نہیں دیا۔ مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ سب کچھ کتنی جلدی بدل گیا تھا فراز لوگوں کا یہاں سے جانا اور اس کی ریحان سے منگنی اور مقررہ تاریخ پر نکاح۔

ریحان نے بروقت فیصلہ کیا۔ قسمت بروقت ان کا ساتھ دینے آئی تھی۔ وہ فوراً گاؤں سے اپنے والدین کو لے آئے۔ آناً فاناً سب ہی کچھ طے ہو گیا۔ سانہ کو خوشی تھی اس کی فراز کے ساتھ کوئی جذباتی وابستگی نہ ہوئی تھی۔ خود کو اور اپنے جذبوں کو سنبھال کر رکھنے کا فائدہ ہی ہوا۔
ریحان نے کچھ لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا پھر چنیا کی طرف جھکے۔
''اب بولو۔ ڈھونڈلی نا ویسی جو تمہیں میرے گھر میں برداشت کر سکے۔'' سانہ فوراً وہاں سے غائب ہو گئی۔ چنیا نے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔
''چنیا...... چنیا......! دیکھو کون آیا ہے۔'' ونیزہ اور فارینہ اسے گھسیٹ کر لے گئیں۔ دادو' احمر اور ساتھ میں زیب......
''مجھے...... مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ ہمارے گھر آئی ہیں۔'' چنیا اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔
''احمر! ابھی تو ایسی پذیرائی ہے مگر بعد میں......'' زیب زیرلب بڑبڑائی تھی۔
''دادو! میں ابھی آپ کو تائی امی سے ملواتی ہوں۔''
چنیا نے کہا۔ تب تک فارینہ اس کی ساری کزنز کو اکٹھا کر لائی تھی۔
''احمر......!'' زیب نے کہا۔
''اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر......'' دادو نہیں تھیں۔ احمر سر کھجانے لگا۔
''کزنز! ہم نے آپ سے کہا تھا نا کہ ہوسکتا ہے' آج ہم آپ کو کسی خاص شخصیت سے ملوائیں۔'' چنیا نے پہلے تجسس پھیلایا۔ سب متجسس نگاہوں سے آنے والے مہمانوں کو دیکھ رہی تھیں کہ ان میں سے خاص شخصیت کون سی ہے۔
''یہ ہیں ہماری فیورٹ رائٹر زیب چوہدری......'' چنیا نے لڑکی کا ہاتھ تھاما۔
''کون ہیں؟'' لڑکی نے بے حد حیرت سے کہا۔
''اوئے خبردار......'' احمر نے گڑبڑا کر روکنا چاہا۔
''بھئی احمر! بس کرو بہت ہو گیا مذاق......'' لڑکی نے کہا۔
''مذاق......'' ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
''تمہیں اپنے منگیتر کو سرعام جوتے پڑتے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' وہ جھنجھلا کر بولا۔
''بہت عرصے سے حسرت ہے۔'' وہ ہنسی۔
''آپ کیا کہہ رہی ہیں......'' چنیا نے الجھ کر پوچھا۔
''بھئی بات یہ ہے کہ......'' لڑکی نے شرارتی نظروں سے احمر کو دیکھا۔

"پہلے ان سے وعدے لے لو کہ یہ تمہارے اکلوتے منگیتر کو کچھ نہیں کہیں گی۔" وہ دادو سے عقب میں ہوا جو خاموش کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"آخر آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" فارینہ سے مزید تجسس برداشت نہیں ہوا۔

"دراصل احمر نے آپ لوگوں سے تھوڑا سا مذاق کیا ہے۔"

"کیسا مذاق؟"

"چنیا کا جب خط ملا تو احمر دادو کو لینے لاہور گیا تھا۔ اس نے جواب لکھ دیا۔"

"کیا انہوں نے جواب لکھا تھا؟"

"میرا نام عائشہ ہے اور میں احمر کی منگیتر ہوں۔ احمر نے میری تصویر دکھا دی اور مجھ سے بات کر لی۔" عائشہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔ احمر کی مسکراہٹیں بھی عروج پر تھیں۔

"تو پھر اصل زیب کون ہیں۔" وہ لوگ روہانسی ہوگئیں۔ کتنا عرصہ بیوقوف بنی رہی تھیں۔

"ہماری دادو......" عقب میں کھڑے احمر نے دونوں ہاتھ دادو کے کندھے پر رکھے اور تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر ایک ساتھ چلائیں۔

"کیا......" تینوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"بس بچو! یہ بچے کبھی کبھار شرارت کرتے ہوئے مجھے بھی سات شریک کر لیتے ہیں۔" دادو نے احمر کی طرف اشارہ کیا تو وہ تینوں اس کی طرف مڑیں' ان کے خونخوار تیور دیکھ کر احمر نے مسکین سی شکل بنائی اور اس کے انداز پر وہ تینوں ہنس دیں۔ چاروں طرف خوشیاں رقصاں ہونے لگی تھیں۔

* * *

یہ نئے سال کی پہلی ابر آلود تھی اور کلاس روم میں تقریباً وہی پچھلے سال کا منظر تھا۔ وہی منظر اور وہی انداز' بشریٰ روسٹرم پر کھڑی نئے سال کی مناسبت سے نظم تیار کر رہی تھی کہ گئے سال میں کیا کھویا' کیا پایا۔

"پتا ہے میں 2008 میں سوئی' آنکھیں کھولیں تو 2009 تھا۔ میں پورا ایک سال کی نیند لے کر آئی ہوں۔ اس لئے میرا چہرہ اتنا فریش ہے۔"

ثمینہ کھلکھلاتے ہوئے بولنے لگی۔

ہادیہ سب کو اپنی امی کے ہاتھ کے بنے بیسن کے لڈو آفر کر رہی تھی۔

"سوری......ہم ایک سال پرانی مٹھائی نہیں کھا سکتے۔"

پہلے سے خدوخال ہیں نہ پہلے سے ہیں خیال
لو ایک سال کے اندر ہم کتنا بدل گئے

بشریٰ نے بلیک بورڈ پر لکھتے ہوئے بآواز بلند پوری کلاس سے یہ شعر شیئر کرنا چاہا' مگر اس بلا کے شور میں اس کی آواز کون سنتا۔

"چلو کینٹین میں چلتے ہیں۔"

ونیزہ نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی' مگر ذہن بشریٰ کے شعر میں الجھ کر رہ گیا۔

ظاہری طور پر تو وہی خدوخال تھے' مگر اندر کہیں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔

اسے زیب کی بات یاد آئی۔

"ہر حادثہ زندگی میں اسی لئے رونما ہوتا ہے تاکہ ہم اس سے کچھ سبق حاصل کریں اور پھر اسے آزمائش رب جلیل سمجھ کر بھلا دینا چاہیے۔"

ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری اور پھر وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

* * *

سبز موسم چرا لئے ہم نے

دروازہ بجا تھا۔

صحن میں اترتی شام بری طرح چونکی۔ سکھ چین کے پیڑ پر اترتی چڑیاں ذرا سا چہچہائیں اور پھر سے اُڑ گئیں۔ امی کے منجمد اعصاب پر یہ دستک پتھر کی طرح لگی تھی۔ انہوں نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ ان کے آلو کاٹتے ہاتھ نجانے کب ساکت ہوگئے تھے۔ زیب نے عادل کے کپڑے سرف میں بھگوتے ہوئے وہیں سے پکار کر پوچھا تھا۔

''کون ہے......؟''

''میں ہوں صفدر۔'' دروازے کے دوسری طرف سے آواز ابھری۔

''آجائیں صفدر بھائی!'' زیب سب چھوڑ چھاڑ کر دروازے کی طرف لپکی تھی۔ صفدر نے اندر آکر سلام کیا۔ پھر امی کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے سبزی کی ٹوکری اٹھا کر چارپائی کے ساتھ پڑی چھوٹی گول میز پر رکھ دی۔ میز پر سفید کروشیے سے بنا میز پوش پڑا تھا۔

''آپ نے پتا کیا صفدر بھائی؟'' زیب نے پاس آکر بے تابی سے پوچھا۔

صفدر نے اڑتی پڑتی نظر اس پر ڈالی۔ سادہ ملگجے سے کاٹن کے سوٹ میں دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ بے تاب سی تھی۔ سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی لاپروائی سے سامنے جھول رہی تھی۔ گندمی رنگت والے ننگے پاؤں پانی میں بھیگ کر نکھرے نکھرے سے لگ رہے تھے۔

''نہ جانے یہ خود سے اتنی لاپروا کیوں ہوگئی ہے۔'' انہوں نے زیب کے بے حد مناسب سراپے پر سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے کوفت سے سوچا۔ شاید اس کے اس قدر رف حلیے سے وحشت سی ہو رہی تھی۔

''بتائیں نا صفدر بھائی! کیا انتظام ہوا؟'' زیب نے انہیں یونہی چپ دیکھا' تو دوسری چارپائی پر عین ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہاں ہوگیا ہے سب' میں نے پتا کیا ہے۔ فاصلہ بہت ہے۔ تقریباً چار گھنٹے کا روزانہ کا سفر ہوجائے گا تمہارا۔''

''اتنا سفر۔'' امی نے تفکر سے کہا۔ ''بیٹا! تبادلہ نہیں ہوسکتا؟''

''امی! میرا تقرر بطور انگلش ٹیچر ہوا ہے۔ تبادلہ مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہی ہے۔'' زیب بتاتے ہوئے پھر سے صفدر کی طرف متوجہ ہوئی۔

انہوں نے میز پر پہلے سے پڑا شیشے کا جگ اٹھا کر نیچے رکھا' کہ میز پر جگہ نہ تھی۔ پھر ایک کاغذ نکال کر میز پر رکھا ساتھ ہی پین شرٹ کی اوپری جیب سے نکال کر بولنے لگے۔

''یہاں سے تم رکشہ پکڑ کر سیدھا پہنچوگی 45 اڈے' وہاں سے تم نے 90 موڑ کی ویگن پکڑنی ہے۔'' انہوں نے ویگن اور اڈے کا نام لکھا۔ ''ایک ویگن سات بجے چلتی ہے' باقی پھر پندرہ منٹ کے وقفے سے' زیادہ تر صبح سبزی والے سوار ہوتے ہیں۔ کوشش کرنا پہلی وین پکڑلو کہ اس میں چار ٹیچرز پہلے ہی جاتی ہیں تمہیں سہولت ہو جائے گی۔ اب تمہیں چھوٹی چھپاسی اترنا ہے۔ اس سے قبل ایک بڑی چھپاسی بھی آتی ہے۔ خدا کیلئے وہاں مت اتر جانا وہ اور گاؤں ہے۔ وین جہاں تمہیں اتارے گی وہ نہر کا پل ہوگا۔ وہاں سے ایک سڑک بالکل سیدھی پینتالیس چک جاتی ہے تم دائیں طرف مڑ جانا۔ تقریباً آٹھ' دس منٹ کی پیدل واک کے بعد تمہارا اسکول سامنے ہوگا۔ سات بجے چلوگی تو تقریباً نو بجے کے قریب اسکول پہنچوگی۔''

صفدر بھائی نے پوری تفصیل سمجھائی' امی کچھ اور پریشان ہوگئیں۔

''اگر اڑھائی بجے چھٹی ہو تو ساڑھے چار بج جائیں گے واپسی میں۔'' وہ حد درجے پریشانی سے بولیں۔

''اتنی دیر میں تو بندہ دو چکر ساہیوال کے لگا آئے۔'' کم پریشان تو زیب بھی نہ تھی۔

''اب مجبوری ہے تمہارا تقرر ساہیوال کے بجائے چھوٹی چھپاسی کے اسکول میں ہوا ہے۔'' وہ ذرا سا مسکرائے۔

''کہاں جا کے پھینکا ہے۔ آس پاس کے سارے اسکولوں کو تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔ وہ رضیہ بھی تو ہے۔ کیسے گھر کے ساتھ دیوار ملی ہے اسکول کی۔''

''یہ تو تبادلہ کرنے والوں کی مرضی امی! اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' زیب نے رسانیت سے کہا۔

''کچھ خیال تو کرنا چاہئے۔ گھر بار' بچے سو ذمہ داریاں ہوتی ہیں عورت کی۔ اب
رات کو گھر لوٹے گی تو کیا خاک دیکھے گی گھر کو' اب مجبوری میں گھر سے نکلنا پڑ ہی گیا ہے تو
کھال تو نہ کھینچیں۔ وہ جا کے پھینکا ہے دنیا کے دوسرے نکڑ میں۔'' امی کو تاؤ ہی آ گیا تو
ہوئی سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن میں جا گھسیں۔

''اب خالہ ہانڈی بھوننے کے ساتھ حکومت اور اس کی تعلیمی پالیسیوں کو کوسیں گی۔'' صفدر
مسکرا کر بولے۔ زیب نجانے کس سوچ میں کھوئی تھی۔

''تو پھر صبح جوائن کر رہی ہو؟'' انہوں نے پوچھا تو وہ چونکی۔ وہ پھر طویل سانس لے کر
بولی۔

''کرنا ہی پڑے گا۔''

''او کے گڈ لک' اینڈ بی بریو۔'' وہ کھڑے ہو گئے۔ زیب نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھ
پھر جھجکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''صفدر بھائی! کل پہلا دن ہے' آپ ساتھ چلے چلتے۔''

''خیال تو میرا بھی تھا' مگر مجھے مال لے کر آج ہی ساہیوال جانا ہے۔'' وہ معذرت خواہ
لہجے میں بولے۔

''چلیں ٹھیک ہے۔'' زیب کے لہجے سے چھلکتی پریشانی کو محسوس کر کے وہ ذرا سا مسکرا
پھر اس کے سر کو چھو کر بولے۔

''کیوں پریشان ہوتی ہو' سب کچھ سمجھا تو دیا ہے میں نے۔'' زیب نے اثبات میں
ہلایا۔ وہ پلٹے مگر نیچے رکھا شیشے کا جگ ٹھوکر میں آ گیا۔ بس ذرا سی ٹھیس لگی اور وہ کرچی کرچی
ہو گیا۔

''اوہ۔'' وہ شپٹا گئے۔

''کوئی بات نہیں' میں اٹھاتی ہوں کرچیاں۔'' زیب جلدی سے کھڑی ہوئی۔

''آئی ایم سوری۔'' صفدر خجل سے ہو کر بولے۔

''کوئی بات نہیں صفدر بھائی! ایک جگ ہی تو تھا۔ ابھی میرے ہاتھ سے بھی چھوٹ
تھا۔'' وہ نیچے بیٹھ کر بڑے بڑے ٹکڑے اٹھانے لگی۔

''دھیان سے' شیشہ لگ جائے گا۔'' انہوں نے تیزی سے کہا پھر پوچھنے لگے۔ ''
کہاں ہے؟''

''وہ سو گیا ہے۔''

''بے وقت سو گیا۔ اچھا خالہ! اب میں چلتا ہوں۔''

''کتنی بار کہا ہے۔ ایسی نازک چیزیں سنبھال کر رکھا کرو۔'' امی ان کے جانے کے بعد کچن
سے برآمد ہوئیں۔

''یہاں تو دل جیسی نازک چیز کسی کی ٹھوکروں میں کرچی کرچی ہو گئی۔ اب جگ کا کیا سوگ
مناؤں۔''

اس کے لہجے میں ٹوٹتے کانچ کی کھنک تھی۔ امی چپ کی چپ رہ گئیں۔

* * *

آنگن میں ملگجا سا اندھیرا کھیل رہا تھا۔ سکھ چین کے پتے بھی سوئے جاگے سے تھے۔
زیب نے نماز پڑھنے کے بعد چائے کا پانی چولہے پر چڑھایا اور خود آنگن میں آ گئی۔ جھاڑو دیتے
ہوئے بھی اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کسی ایک نقطے پر ٹھہرتا ہی نہ تھا۔ کب
آنگن صاف ہو گیا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

دودھ والے نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔ پھر طویل سانس لے کر اس نے
جھاڑو چھوڑی۔ کچن سے برتن لے کر دروازے تک آئی تو دودھ والا بیزار سا کھڑا تھا۔

''باجی! تھوڑا جلدی کیا کریں۔ باقی گھر پھر شکایت کرتے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''کیا مطلب تمہارا؟ رات کو یہاں برتن رکھ جایا کروں اب آنے میں تھوڑا وقت تو لگتا
ہے۔'' زیب کو یونہی غصہ آ گیا۔ دودھ والے نے خاموشی سے برتن میں دودھ ڈالا پھر پلٹتے ہوئے
بولا۔

''کل پہلی تاریخ ہے باجی!'' اس کے سیاہی مائل ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ کم از کم زیب کو تو
استہزائیہ ہی لگی تھی۔ اسے تاؤ ہی تو آ گیا۔

''معلوم ہے مجھے۔ زیادہ دانت نکالنے کی ضرورت نہیں۔ لے جانا پیسے۔'' اس نے دھاڑ
سے دروازہ بند کیا۔

''کیوں خوامخواہ اُلجھ پڑتی ہو ان لوگوں سے۔'' امی برآمدے میں جائے نماز بچھا رہی تھیں۔

''ایک ماہ پیسے کیا لیٹ ملے ہیں۔ اب دو ٹکے کے لوگ ہمیں ترڑیاں دیں گے۔''

''حقدار تو اپنا حق مانگے گا ہی۔'' امی نے رسان سے کہا اور نیت باندھ لی۔ کچھ کہنے کی
کوشش میں وہ بس لب بھینچ کر رہ گئی۔ باورچی خانے میں آئی تو چائے کا پانی ضرورت سے زیادہ
کھول چکا تھا۔ اس نے چینی' پتی' دودھ سب ایک ساتھ دیگچی میں ڈال دیا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔
پھر عادل کا فیڈر بنا کر کمرے میں آ گئی۔ ننھا فرشتہ' مٹھیاں بھینچے' گلابی کمبل میں لپٹا' نیند کی

لوریاں سن رہا تھا۔ زیب کے چہرے پر ممتا کا نور بکھر گیا۔ اس نے جھک کر اس کی روشن پیشانی
پر ممتا کی مہر ثبت کی۔ کیسی پرسکون، معصوم اور بے خبر نیند تھی۔

"جو تم نہ ہوتے تو کیا جواز تھا میرے پاس جینے کا۔" اس نے دھیرے سے اس کا گلابی
گال چھوا۔ وہ ذرا سا کسمسایا۔ اسے فیڈر دے کر وہ باہر آئی تو امی روٹی پکا رہی تھیں۔

"میں پکا لیتی ہوں امی۔"

"تم تیاری کرو۔ سات بجے ویگن پکڑنی ہے۔ ٹائم کافی ہو گیا ہے۔"

وہ سر ہلاتی باہر نکل آئی۔ آسمانی کاٹن کا سوٹ، جس پر سفید ریشم سے خوب صورت
ایمبرائیڈری اس نے خود کی تھی۔ زیب تن کر کے بالوں کو سادہ سی چوٹی کی شکل دینے تک اس نے
امی کو عادل کے متعلق کئی ہدایات جاری کر دیں۔ امی بری طرح چڑ گئیں۔

"بس کرو زیب! کیا میں نے کبھی بچے نہیں دیکھے۔ خاموشی سے ناشتہ کرو۔ سنبھال لوں گی
میں خود ہی۔"

"ٹائم بہت ہو گیا ہے امی۔" اس نے جوں توں چند لقمے نگلے تھے۔ سات بجنے میں بارہ
منٹ باقی تھے۔

"امی! دعا کیجیے گا خیریت سے پہنچ جاؤں۔" امی اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں۔
پتا نہیں کیوں اتنی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ حالانکہ چھ سال ہو گئے تھے اسے جاب کرتے۔ شاید اس
لئے بھی کہ ہمیشہ پوسٹنگ شہری یا آس پاس کے نیم دیہی علاقے میں ہوئی تھی۔ وہ آرام سے رکشہ
یا تانگا لگوا لیتی۔ مگر اب اتنی دور دو گھنٹے کا فاصلہ، اس پر پبلک وین میں سفر، کچھ ایسی خوشگوار
معلومات نہیں تھیں اس کی۔ گلی کے موڑ پر اسے رکشہ ملا تو پورے سات بج رہے تھے۔ گویا
وین روانہ ہونے والی تھی۔

"90 اڈے جانا ہے جہاں 45 موڑ کی ویگن کھڑی ہوتی ہے۔" اچک کر موٹر سائیکل رکشہ
پر سوار ہوتے ہوئے اس نے صفدر بھائی کی فراہم کردہ معلومات رکشہ والے کو فراہم کیں۔ رکشہ
والے نے پلٹ کر اس کی سیاہ چادر میں لپٹی ہونق صورت پر ایک نظر ڈالی اور دانت نکالنے لگا۔

"کیا ہے؟" غصے و ناگواری سے اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"جی آپ نے 45 اڈے جانا ہوگا جدھر 90 موڑ کی ویگن کھڑی ہوتی ہے۔"

زیب نے تیزی سے پرس کھنگال کر وہ مڑا تڑا کاغذ نکال کر کھولا۔ پھر جھنجھلا کر بولی۔

"اب چلو بھی۔ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" رکشہ والے کا موٹر سائیکل گڑگڑایا اور فراٹے
بھرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد رکشہ رک گیا۔ زیب متذبذب سی بیٹھی رہی۔

"بھائی صاحب! یہ نوے موڑ کی ویگن ہے۔" رکشہ والے نے ویگن کے ساتھ ٹیک لگا کر
کھڑے سگریٹ پیتے ڈرائیور سے پوچھا۔

"آہو جی۔" اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگا کر جواب دیا تھا۔

"جاؤ بہن جی! یہی آپ کی مطلوبہ ویگن ہے۔" زیب نے مشکور نگاہوں سے رکشہ والے کو
دیکھا اور پرس سے دس روپے نکال کر اسے تھمائے۔ بھری ہوئی وین رخصت ہو چکی تھی۔ وہ خالی
ویگن میں جا بیٹھی۔ ویگن کیا تھی۔ سامان لادنے والی پک اپ تھی۔
جس کے دو اطراف اور درمیان میں لمبی سیٹیں لگائی گئی تھیں۔ حالت ایسی تھی کہ اس کا تعلق
کسی نہ کسی طرح ہڑپہ کے کھنڈرات سے ضرور ثابت ہوتا تھا۔ وین کا جائزہ لیتے وہ چونکی اور گردن
نکال کر اس نے اسی سگریٹ پیتے بندے سے پوچھا تھا۔

"بھائی! یہ ویگن چھوٹی چھیاسی جائے گی۔"

"آہو جی۔" اس نے بغیر دیکھے جواب دیا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر باہر کے منظر کو دیکھنے لگی۔
دھند آلود صبح تھی۔ سورج کی نارنجی چمکیلی شعاعیں بھی دھند کا پردہ چاک کرنے میں ناکام ہو رہی
تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف تازہ سبزیوں کے ڈھیر بہار دکھا رہے تھے۔ بھانت بھانت کے
لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں، پھلوں کے ٹوکرے لادے جا رہے تھے۔ وین بھرنے لگی تھی۔ کچھ
اسکول ماسٹر، سبزی اور پھل بیچ کے واپس جاتے کسان، یہاں سے سستے داموں سبزی پھل خرید کر
اپنے گاؤں مہنگے داموں فروخت کرنے والے دکاندار، کچھ منیاری والے، جو گاؤں گاؤں جا کر
سستی کنگھیاں، کریمیں، پاؤڈر اور پراندے سستے اور ادھار پر بیچتے تھے۔ گاؤں کی ہر عورت اور
لڑکی سے ان کا ادھار چلتا۔ یہ ادھار کبھی نقد چکایا جاتا تو کبھی گندم، مکئی، پھل اور سبزی کی صورت
میں۔

وہ ویگن میں تنہا خاتون تھی۔ سنبھل کر کونے میں دبک گئی۔ وین لبالب بھر گئی تب کسی مست
ہرنی کی طرح جھوم کر آگے بڑھی۔ زیب کو تو ہر آن یونہی لگتا کہ وین کسی بھی جھٹکے میں دو ٹکڑے ہو
جائے گی۔ اگلا حصہ الگ، پچھلا الگ۔ اس کے ساتھ سفید لباس اور موٹے کوٹ میں ملبوس استاد
نوجوان مہذب تھا۔ وہ از خود زیب اور اپنے درمیان فاصلہ رکھے اس کی طرف سے رخ موڑے
اپنے ساتھی استاد کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ ورنہ پبلک وین میں مرد و عورت کی الگ سیٹوں کا کوئی تصور
نہ تھا۔ بس ٹھنس ٹھنسا کر جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ جاؤ۔ چار خواتین ہو جاتیں تو وہ ایک طرف مل کر
بیٹھ جاتیں۔ ورنہ جہاں مرضی ٹھنسو، وین چلی تو سب اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔

اس کے عین سامنے منیاری والا' سرمئی چادر کی بکل مارے' اپنے ڈبوں کے مینار پر سر ٹکا
اونگھنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ سبزی بیچ کر آنے والا کسان' پھٹی ہوئی ٹوپی سر پر رکھے ہونے والی
آمدنی کا حساب انگلیوں پر لگا رہا تھا اور بار بار بھول جاتا تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھنے والے دو لوگ
تھے جو سبزی لے کر گاؤں جا رہے تھے۔ ان کے ٹوکرے چھت پر لدے تھے اور وہ مشکوک نظروں
سے وین کے تقریباً باہر لٹکتے طالب علموں کو گھور رہے تھے جو اکثر اپنے بستوں میں کچے شلجم' مولی
اور گاجریں بھر کر لے جاتے اور اپنے استادوں کو خوش کرتے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھے دونوں
استاد زور و شور سے بحث میں الجھے تھے۔

زیب کا دھیان پلٹ کر عادل کی طرف چلا گیا۔ اس کے اٹھنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اٹھتے ہی
اس کی نظر زیب پر نہ پڑتی تو وہ شور مچا دیتا تھا۔

''امی کیلئے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ چھوٹا سا ہے پر کتنا ضدی ہے' لگتا ہے اپنے باپ
گیا ہے۔''

اس کا خیال آتے ہی زیب کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''کون سا باپ' کیسا باپ' اس کی صرف ماں ہے اور بس۔'' اس نے بڑی تلخی سے سو
تھا۔ وین نہر کے ساتھ گھنے درختوں میں سے گزرتی جا رہی تھی۔ نہر کے کنارے بوڑھا کھوا
بازو پھیلائے اور گردن اکڑائے کھڑا تھا۔ نہر کے پانیوں پر' اس کے پار پھیلے سرسبز کھیتوں اور
کے درمیان خودرو پودوں کی طرح آگے کچے پکے مکانوں اور ان کے عین پیچھے مالٹوں سے لدے
باغوں پر دھنک کھیلتی تھی۔ سورج کے چہرے پر اب تک غبار چھایا تھا۔

''کرایہ۔'' کنڈیکٹر کسی جن کی طرح نازل ہوا۔

''چھوٹی چھیاسی تک کتنا کرایہ ہے۔'' اس کی مدھم آواز ساتھ بیٹھے ماسٹر صاحب تک
پہنچی تھی۔

''نو روپے۔'' انہوں نے شائستگی سے جواب دیا۔ ایک ہی پہلو پر بیٹھے بیٹھے بیچارے
گئے تھے۔

''اس طرح تو روز کے چالیس روپے خرچ ہو جائیں گے۔'' زیب نے بڑے تفکر
آواز بلند سوچا تھا۔

''جی۔'' ماسٹر صاحب تعجب سے پوچھ رہے تھے۔

''کچھ نہیں۔'' زیب نے خجل سی ہو کر کرایہ بڑھایا۔ جو مختلف مسافروں کے ہاتھوں سے
ہوا کنڈیکٹر تک پہنچا تھا۔ اس کیلئے ایک قدم بھی آگے آنا ناممکن تھا۔ خاصا طویل تھکا دینے والا

وین میں مختلف مسافر چڑھتے اترتے رہے۔ زیب اپنی جگہ دبکی رہی۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ہو گیا
وہ چوکس ہو گئی۔ ویگن اب قدرے خالی خالی سی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھے ماسٹر صاحب
کھلے ہو کر بیٹھ گئے۔

''چھوٹی چھیاسی آ گئی'' ایک موڑ پر وین رکی تو اس نے ماسٹر صاحب سے پوچھا۔

''ابھی نہیں آئی۔''

جیسے جیسے سفر ختم ہو رہا تھا۔ زیب پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ ''جو مجھے پتا نہ چلا کہ یہی
مطلوبہ گاؤں ہے تو پھر۔ یہ وین کہیں اور جا رکی تو؟'' وہ ہر موڑ پر یہی سوال کرتی تھی اور ماسٹر
صاحب ہر بار بڑی متانت سے وہی جواب دہراتے تھے۔ اسے صفدر بھائی پر غصہ آنے لگا۔ کیا تھا
ایک دن ساتھ چلے آتے۔ وین ایک جھٹکے سے رکی تھی۔

''چھوٹی چھیاسی آ گئی۔'' اس نے پھر تیزی سے پوچھا۔ اس سے قبل کہ ماسٹر صاحب کچھ
لیتے۔ کنڈیکٹر نے بڑی بے زاری سے اس کی طرف دیکھا۔

''بی بی! تمہارے سٹاپ آئے گا تو بتا دیں گے۔''

وین میں موجود چند مسافروں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ زیب کھسیانی سی ہو کر بیٹھ
گئی۔ اگلے موڑ پر وین رکی تو اس نے پوچھتے پوچھتے لب بھینچ لئے۔

''یا خدا! دو گھنٹے ہو گئے بیٹھی کو' یہ آ کیوں نہیں رہی۔'' منتظر نگاہیں کنڈیکٹر پر جمی تھیں۔ ماسٹر
صاحب اترتے اترتے پلٹے۔

''بی بی! اگلے موڑ پر اتر جانا۔ وہی چھوٹی چھیاسی ہے۔''

زیب نے دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور خود کو
لعن طعن کرنے لگی۔ ''اس قدر بدحواس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ زیب بی بی! تمہاری تو شکل
سے ظاہر ہے کہ پہلی بار پبلک ٹرانسپورٹ سے سفر کا اتفاق ہوا ہے۔''

وین پھر سے رکی تھی' ماسٹر صاحب نے تو یہی کہا تھا کہ یہاں اتر جانا۔ وہ ہراساں سی اتر
گئی۔

دھند اگرچہ کم تھی۔ پھر بھی اس میں چھپے گاؤں کے خدوخال واضح نہیں ہو رہے تھے۔ وہ
ٹوٹی پھوٹی کچی پکی سڑک اس گاؤں تک لے گئی تھی۔ گاؤں کی گلیاں سنسان اور رستے ویران تھے۔ نہ
انسان نہ حیوان۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ درخت' پودے' کھیت گھر سب دھند کی چادر اوڑھے اونگھ
رہے تھے۔ کہیں کوئی ذی روح نہیں' اسے اب تک سکول کی عمارت بھی نظر نہ آئی تھی۔ تبھی ایک گھر
کی اوٹ سے سفید شلواروں' نیلی قمیضوں اور رنگ برنگی چادروں میں لپٹی ننھی منی بچیوں کا غول

نمودار ہوا۔ ہنستے مسکراتے چہرے اپنے سامنے ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر ساکت ہو گئے۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیئے۔ زیب نے انہیں پاس بلایا تو وہ جھجک سی گئیں۔ تب ہی ان میں سے نسبتاً زیادہ صاف ستھرے اور نئے یونیفارم والی بچی آگے آئی تھی۔

"بیٹے! اسکول کدھر ہے آپ کا۔" زیب نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ زیب کے مہربان و شفیق لہجے پر بچی کے لب مسکرا دیئے۔ اس کی معصوم نگاہوں میں اشتیاق در آیا۔

"آپ ہماری نئی مس ہیں۔"

"ہاں۔" زیب مسکرائی۔ بچیاں اسے اپنے جلو میں لئے خوشی خوشی اسکول کی طرف چل دیں۔ اسکول دیکھ کر زیب کو خاصی مایوسی ہوئی اسکول کا گیٹ تو تھا پر اردگرد کی چار دیواری گری ہوئی تھی کھلے کھلے چار کمرے تھے۔ کھیل کا ایک ہی میدان۔ کسی زمانے میں یہاں تعمیری کام شروع ہوا ہوگا۔ سو مٹی اور بجری کے ڈھیر گراؤنڈ میں پڑے تھے۔ اسکول کا اکلوتا نلکا خراب پڑا تھا۔ چھتوں پر پنکھے ندارد خیر نلکوں اور پنکھوں کی ضرورت تو یوں بھی نہ تھی کہ سردی کا موسم تھا نہ پانی کی حاجت تھی نہ ہوا کی۔ ٹوائلٹ کی ضرورت یوں نہ تھی کہ یہ وسیع و عریض کھیت کس مرض کی دوا ہیں۔ اسکول میں قدم رکھتے ہی اعلان ہو گیا تھا کہ نئی استانی آئی ہیں۔ اس سے قبل کہ یہ خبر دیگر استانیوں تک جاتی وہ ان کے سر پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چاروں گھبرا کر کھڑی ہوئیں۔ جب معلوم ہوا کہ وہ بھی ان کی طرح استانی ہے۔ فوراً کرسیاں سنبھال لی گئیں کیونکہ اسکول میں چار ہی کرسیاں ٹیچرز کیلئے تھیں۔ سو ایک نے اٹھ کر کرسی زیب کو پیش کی اور خود ایک بنچ گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"میں زیب ہوں۔" زیب نے تعارف کا آغاز کیا۔ پنجابی لہجے میں اردو بولتی اسکول کی ہیڈ مسٹریس امیراں بی بی نے باقی ٹیچروں کا تعارف کروایا۔ امیراں بی بی اور زلیخا کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ باجی جنت اور صغراں بی بی دوسرے گاؤں سے تھیں۔ صغراں بی بی کرسی پر دونوں ٹانگیں رکھے، چادر اردگرد لپیٹے ایک لڑکی کا سبق سن رہی تھیں۔ وہ نجانے کیا من من باقاعدہ سر لے میں کر رہی تھی۔ صغراں بی بی کا سارا دھیان زیب کی طرف تھا۔ جب سبق میں کمی آئی تو انہوں نے کرارے ہاتھ اس کی پشت پر رسید کیئے۔

"لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی۔ نہ تجھے ابھی تک سبق یاد نہ ہوا۔"

"باجی جی! میں نے سارا سبق سنایا ہے۔" وہ منمنائی۔

"ٹھیک ہے، جا کر باقی لڑکیوں کا سنو۔"

وہ سب ہی زیب میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ جب زیب نے بتایا کہ وہ اتنی دور سے آئی

ہے تو زلیخا کا منہ کھل گیا۔

"ہائے ہائے! آپ اتنی دور سے آئی ہو؟"

جنت بی بی نے فوراً لڑکیوں کو دوڑا دیا۔

"اے فاطمہ! جا اپنے گھر سے کوئلے دہکا کر لا۔" بچی بخوشی کتابیں، بستہ چھوڑ بھاگ گئی۔

دوسری کو آواز لگائی۔

"اے صغریٰ! اپنی ماں سے کہہ اچھی سی چائے بنا دے۔ شہر سے استانی آئی ہیں۔ اے بات سن۔ چائے ڈالنے والی بوتل میں ڈال کر لانا۔"

"نہیں باجی! رہنے دیں۔" زیب نے روکنا چاہا۔

"نہ نہ آپ اتنی دور سے آئی ہو۔ خدمت تو فرض ہے ہم پر۔" زلیخا نے ہنس کر کہا۔

"باقی کلاسیں کہاں ہیں۔"

"ساری یہی ہیں۔" جواب ملا۔

"کیا مطلب......؟" زیب نے تعجب سے پوچھا۔

"اب کون ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑ لگائے اتنی سردی میں۔ سب کو ادھر ہی بٹھا دیتے ہیں۔"

"مگر پانچ کلاسوں کی اتنی کم تعداد۔"

"سردی بہت ہے، اس لئے حاضری کم ہے۔" زلیخا نے وجہ پیش کی۔

"پھر کسانوں کی بچیاں ہیں۔ کتابوں میں کم، کھیتوں کھلیانوں میں زیادہ دل لگتا ہے ان کا۔" امیراں بی بی نے ہنس کر بتایا۔

"باجی! یہ کڑھائی کدھر سے کروائی تھی۔" زلیخا نے جھک کر اس کی قمیض کا دامن تھاما۔

"میں نے خود کی ہے۔" زیب قصداً مسکرائی۔

"ہیں!" اس کی آنکھیں کھلیں پھر سنبھل کر بولی۔ "ماشاء اللہ۔"

ذرا دیر میں دہکے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی بھی آ گئی اور گرم گرم چائے بھی چائے کے ساتھ بیسن اور تل کے لڈو بھی آ گئے۔

"یہ کب بنائے تھے تمہاری ماں نے؟" امیراں بی بی نے بچی کو گھورا۔ "اتنے دنوں سے تو بھجوائے نہیں۔"

"ابھی کل ہی بنائے ہیں۔" بچی بھی ماں کی سکھائی پڑھائی تھی۔ فٹ سے بولی۔

"اچھا، لگتے تو نہیں ہیں۔" اس نے مشکوک نظروں سے لڈو کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

زیب نے سب کے اصرار کے باوجود بس چائے پی تھی۔ گرما گرم چائے سے اس کا گھومتا
چکراتا دماغ ٹھکانے آیا۔ جو لڈو کھائے جا سکے وہ کھا لئے۔ باقی سنبھال کر الماری میں رکھ دیئے
گئے۔ اس دوران زیب ان کے طریق کار کا معائنہ کرتی رہی۔ کلاس کا کوئی ٹائم ٹیبل نہ تھا۔ بس
جب جس کلاس کو دل چاہتا پڑھا دیا جاتا۔ زیب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں سے شروع کرے۔
بچے آج کتابیں بھی لے کر نہیں آئے تھے۔

"آپ آج آئی ہیں۔ آج ہی پڑھانا شروع کر دیں گی۔ آج آرام کریں۔" اسے
پڑھانے کیلئے پر تولتے دیکھ کر زلیخا نے روکا۔ وہ ابھی اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔

"ذرا اندازہ تو ہو۔ بچوں کو کہاں سے شروع کروانا ہے۔"

"میں نے ان کو اے بی سی سکھا دی ہے۔ باقی بھی تھوڑا بہت ساتھ ساتھ کرواتے تو تھے۔"
امیراں بی بی نے بتایا۔ زیب نے بچیوں کو لکھوا کر دیکھی۔ بڑی کلاس کی بچیوں نے لکھ لی۔
چھوٹی دونوں کلاسوں کے بچے کتاب سے دیکھ کر لکھ لائے تھے۔ اور اس پر مصر تھے کہ نئی مس پہلے
ہماری سلیٹ دیکھے۔ عجب دھکم پیل تھی۔ زیب کے پیار و غصے کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تب ہی
امیراں بی بی نے اٹھ کر جو ہاتھ لگا' بے دریغ دو دو ہاتھ جما دیئے۔

"کھوتے نہ ہوں تو۔ سمجھ نہیں آتی 'ایک ایک کر کے آؤ'" باقی خود بخود کھسک گئے۔

دوپہر کو امیراں بی بی اپنے گھر سے مٹر پلاؤ پکوا لائیں۔ یہ اہتمام صرف زیب کیلئے تھا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ حالانکہ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

"ایسے تو نہ کہیں' آپ کی بدولت ہمیں بھی مٹر پلاؤ نصیب ہو گیا۔" زلیخا نے چاولوں پر
رائتہ ڈالا' ساس' نندوں اور ڈھیر سارے دیگر افراد کی موجودگی میں ایسی عیاشی' کبھی کبھار اور بس
اسکول میں ہی نصیب ہوتی تھی۔

"زیب جی! آپ کی شادی ہو گئی ہے۔" امیراں بی بی نے اچانک پوچھا۔

کاش نہ ہوئی ہوتی۔ زیب کے ہاتھ ذرا دیر کو تھمے پھر اس نے بدقت اثبات میں گردن
ہلائی تھی۔

"اچھا" سب ہی کو حیرت ہوئی۔ "شوہر کیا کرتے ہیں آپ کے۔؟"

"کچھ نہیں۔ بس آوارہ گردی کرتے ہیں۔" زیب کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ان سب نے تعجب
سے اس کی شکل دیکھی۔

"بچے ہیں۔"

"ایک ہی بیٹا ہے نو ماہ کا۔" وہ قدرے مضطرب نظر آنے لگی تھی۔ جنت بی بی نے آنکھوں

ہی آنکھوں میں زلیخا کو منع کیا۔ وہ اسکول کی سینئر ٹیچر تھیں ریٹائرمنٹ کے قریب۔ خود دوسروں کے
معاملے میں دخل نہ دیتی تھیں۔ ہاتھ میں ایک تسبیح ہوتی۔ ادھر پڑھانے سے فارغ ہوتیں۔ ادھر
تسبیح ہوتی۔ ادھر تسبیح کے دانے گرنے لگتے۔ وہ سب ہی ان کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ ان کے
اشارے پر زلیخا کو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا۔ ورنہ تو وہ زیب کے شوہر کی پوری ہسٹری معلوم
کر لیتی۔

واپسی پر بچیوں کا غول اسے نہر کے پل تک چھوڑنے آیا تھا۔ زرد نارنجی کرنیں نہر کے
پانیوں پر بہہ رہی تھیں۔ شاہ خاور ایک بار پھر کہر کی لپیٹ میں آنے کو تیار تھا۔ گرد آلود کچی پکی
سڑک پر بچیوں کے معصوم قدموں سے دھول اڑتی تھی ایک اور شام دھرتی پر بکھرنے کو تیار تھی۔
ویگن چلنے تک وہ سب ہاتھ ہلا ہلا کر اسے خدا حافظ کہتی رہیں۔ واپسی کا سفر انتہائی تھکا دینے والا
اور بور ترین تھا۔ راستے میں ویگن خراب ہو گئی اور تقریباً آدھا گھنٹہ کھڑی رہی۔ بنگلا میں ڈرائیور کو
یاد آیا کہ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔ کھانے کے بعد چائے اور ایک آدھ سگریٹ پینا تو اس کا
حق تھا اندر مسافر تلملا رہے تھے۔ باہر ڈرائیور "دل لے جانگی جئی ہاں کر کے" پر جھوم رہا تھا۔
جب وہ گھر پہنچی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور شاہ خاور اپنا سفر تمام کر چکا تھا۔

* * *

سورج کی نرم گرم شعاعیں دھرتی کے ٹھٹھرتے وجود کو زندگی بخش حدت پہنچا رہی تھیں۔ وہ
بھی کب سے دھوپ میں چادر لپیٹے چھت پر بچھی چارپائی پر کسلمندی سے پڑی تھی۔ پاس کھیلتے
عادل نے مالٹوں کی ٹوکری الٹ دی تھی۔ اب انہیں گیند کی صورت استعمال کر رہا تھا۔ زیب نے
کروٹ لے کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ بس چند دن ہی اسکول جا سکی تھی اور ان چند دنوں کے
سفر کی تھکن بخار کی صورت نکلی تھی۔ جسم الگ درد کر رہا تھا۔ مجبوراً اسے دو چھٹیاں لینی پڑی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے شہزادے!"

مسرت اوپر کپڑے پھیلانے آئی تھی۔ عادل نے اسے دیکھتے ہی قلقاری ماری پھر زیب کی
چادر کھینچنے لگا۔

"امی! آنی۔" زیب نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا اور مسکرا دی۔

"کیا بات ہے زیب! ایسے کیوں لیٹی ہو۔"

"بخار ہو گیا ہے۔" زیب اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مسرت قمیص نچوڑتے ہوئے ہنس دی۔

"بخار تو ہونا ہی تھا۔ اتنی لمبی مشقت جو گلے پڑ گئی ہے۔"

"کیا کریں۔ جینے کے اسباب تو پورے کرنے ہیں۔"

وہ بیزاری سے بولی۔ کبھی کبھی عجب سی اکتاہٹ جسم و جاں کو گھیر لیتی تھی۔ زندگی کے
سارے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ پھر اس زندگی کے سو تقاضے تھے۔ جو بہر حال اسے پورے کرنے
ہی تھے کہ امی اپنے حصے کی مشقت کر چکی تھیں اور زیب کے نزدیک عادل بس اسی کی ذمہ داری
تھا۔ مسرت دیوار پر کہنیاں ٹکائے عادل سے اس کی زبان میں باتیں کرنے لگی تھی۔ عادل
قدرے غصے میں اسے کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ نیچے سے صفدر بھائی کی آواز آ رہی تھی۔
وہ امی سے زیب کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔

"تم اب کیا کر رہی ہو مسرت۔۔۔؟" زیب نے اپنی چپلیں ڈھونڈتے ہوئے پوچھا۔

"دھوپ نکلی تھی' سوچا کپڑے دھو لوں۔ ابھی تو ان سے فارغ ہوئی ہوں۔ مزید کچھ
کرنے کا فی الحال ارادہ نہیں ہے۔"

"تو ذرا عادل کا خیال رکھنا۔ امی نے اس کے لئے کھیر بنائی تھی' وہ لے آؤں۔"

"میں لا دوں۔" وہ اس کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ صفدر بھائی آئے ہیں۔ ان سے بھی مل لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ دیوار پھلانگ کر اس طرف آ گئی۔

"چلو شہزادے! مالٹے کھاتے ہیں۔" اس نے موٹا سا مالٹا منتخب کیا۔ عادل اس سے ذرا خفا
نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے منانے کو مالٹوں کا مینار کھڑا کرنے لگی۔ جیسے ہی مالٹا گرتا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس
دیتا۔ پھر خود ہاتھ مار مار کر گرانے لگا۔ زیب مطمئن ہو کر نیچے آ گئی۔ اس کی سرخ آنکھیں' بخار کی
حدت سے تمتماتا چہرہ۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" چھوٹتے ہی صفدر بھائی نے پوچھا۔

"یونہی بخار ہو گیا تھا۔" زیب ان کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"دوا لی۔"

"جی۔" ان کے لہجے کی بے تابی کو یکسر نظرانداز کر کے وہ نارمل سے لہجے میں بولی تھی۔

"اسکول کیسا ہے تمہارا۔"

"جیسے گاؤں کے سرکاری اسکول ہوتے ہیں۔"

"اسکول کیا ہے بیٹا! بس بیگار کیمپ سمجھ لو۔ صبح کی نکلی مغرب کو گھر میں گھستی ہے۔ دنیا کے
سارے کام ڈالو بھاڑ میں۔ بس ایک اسکول نبٹ جائے بہت ہے۔" امی سخت بیزار تھیں۔ ادھر
سے عادل انہیں سارا دن چکرائے رکھتا۔ زیب کا بخار الگ پریشانی کا باعث بن گیا تھا۔

"اتنی دیر کیسے ہو جاتی ہے۔ چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے۔" صفدر بھائی نے قدرے تشویش سے

پوچھا۔

"چھٹی تو وقت پر ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ ویگنیں اپنی مرضی سے چلتی ہیں۔"

"اب اس کا کیا علاج۔" وہ کندھے اچکا کر رہ گئے۔

"اتنی دور تبادلے کی کوئی تک بھی ہے۔ پرلے پار جا کے پھینکا ہے۔ جیسے ہمارے پاس
ہوائی جہاز کھڑے ہیں۔ روز کے چالیس روپے ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہزار روپیہ تو ہر مہینے نکل گیا
سمجھو۔"

"اچھا؟" وہ کسی سوچ میں ڈوبے۔ "تو پھر کوشش کرتے ہیں تبادلے کی۔"

"جب تک سالانہ امتحان نہیں ہو جاتے۔ بہت مشکل ہے صفدر بھائی! اتنے تو ہاتھ پیر
مارے ہیں۔" زیب قدرے مایوسی سے بولی۔

"تمہارے ابا زندہ ہوتے تو کاہے کو اتنے دھکے کھانے پڑتے کاش۔"

"ہاں ابا زندہ ہوتے' میرا کوئی بھائی ہوتا' وحید ایسا نہ نکلتا۔ کتنے کاش ہیں اماں! ہماری
زندگی میں۔" زیب کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ نجانے وہ خود ہنس رہی تھی یا اماں' پر وہ چپ کی چپ رہ
گئیں۔ صفدر بھائی نے ایک نظر اس کے تپے ہوئے تلخ چہرے پر ڈالی اور کرنے کو بات ڈھونڈنے
لگے۔

"حقیقت تو یہ ہے اماں! کہ زندگی اپنی تمام تر سختیوں اور تلخیوں کے ساتھ ہمارے سامنے
بے نقاب ہوتی ہے۔ اس "کاش" سے نکل کر ہمیں جو ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر اسے قبول کرنا
ہی ہوگا کہ ہمارے پاس اس کا متبادل نہیں ہے۔"

"صفدر بیٹا! میں چائے لاتی ہوں تمہارے لئے۔"

امی نظریں چرا کر اٹھ گئیں۔ نجانے زیب کی باتیں انہیں حوصلہ دینے کے بجائے مزید بے
حوصلہ کیوں کر دیتی تھیں۔ صفدر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ چادر کا کونا پکڑے اس میں دھاگے
کھینچ رہی تھی۔ جیسے زندگی کی الجھی گتھیوں میں سے کوئی سرا ڈھونڈ رہی ہو۔ ایسے میں اس کا چہرہ
بجھا اور سپاٹ اور بے رنگ نظر آ رہا تھا۔

"خود کو تنہا سمجھنا شروع کر دیا ہے تم نے۔" ان کا لہجہ گمبھیر و سنجیدہ تھا۔ زیب کے لبوں پر
مغموم سی مسکراہٹ پھیلی۔ اس نے بدقت نفی میں گردن ہلائی۔

"امی ہیں نا میرے ساتھ اور پھر عادل۔"

"اور میں۔" انہوں نے تیکھے لہجے میں بات کاٹی۔ زیب نے سر اٹھا کر ان کے حد درجہ
سنجیدہ چہرے کو دیکھا اور ڈر گئی۔ اگر یہ بھی خفا ہو گئے تو یہ سہارا بھی چھن جائے گا اور کون ہے جو

پلٹ کراتا ہی پوچھ لے کہ وہ ماں بیٹی کس حال میں ہیں۔

"بولو نا زیب! کیا میں، میں کہیں بھی نہیں ہوں۔" انہوں نے آہستگی سے زیب کا ہاتھ تھام کر اصرار سے پوچھا اور زیب نے ایمانداری سے اعتراف کیا تھا۔

"آپ نہ ہوتے صفدر بھائی! تو شاید میں بکھر جاتی۔ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتی۔"

"تھینک یو زیب۔" وہ اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر آسودگی سے مسکرائے اور زیب نے جیسے الجھ کر ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ آزاد کروایا تھا۔ اسے صفدر بھائی کی جذبے لٹاتی آنکھوں سے ہمیشہ الجھن محسوس ہوتی تھی۔ شادی سے قبل بھی اور بعد میں بھی۔ اس کے یوں ہاتھ چھڑانے سے صفدر بھائی خجل سے ہو کر بات بدل گئے۔

"اماں بہت یاد کرتی ہیں تمہیں۔"

"اچھا۔ اب کیسی ہیں خالہ؟"

"ٹھیک ہیں۔ کبھی لگاؤ نا چکر تم بھی۔ کچھ زیادہ دور تو نہیں رہتے ہم۔" انہوں نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آؤں گی کسی دن۔" زیب انہیں ٹالتے ہوئے امی کی طرف دیکھنے لگی جو چائے لیے آ رہی تھیں۔

"بیٹا! یہ کیا ہے؟" امی نے چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے پاس پڑے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جگ ہے، اس دن ٹوٹ گیا تھا ناں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" امی خفا ہو گئیں۔

"بس یونہی مارکیٹ سے گزر رہا تھا تو لے آیا۔"

"آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا صفدر بھائی۔" زیب نے کہا تو وہ فوراً بول اٹھے۔

"ارے بابا! ویسے ہی لے آیا تھا۔ اپنا گھر سمجھ کر۔ تمہیں اچھا نہیں لگا تو واپس لے جاتا ہوں۔"

"ارے نہیں بیٹا! تمہارا اپنا گھر ہے۔ ہم نے بھی تو تم سے ہی کہنا تھا۔"

امی نے ان کے لہجے سے چھلکتی خفگی کو محسوس کر کے جلدی سے کہا۔ جانتی تھیں۔ خلاف مزاج بات پر ان کا لہجہ یونہی بگڑ جاتا تھا۔ چائے پینے کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھے پھر اگلے دن آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ زیب کپ اور جگ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی۔ جب واپس آئی تو امی کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں امی؟"

زیب کی آواز پر وہ چونکیں پھر گہری سانس بھر کر کہنے لگیں۔

"کیسا اچھا بچہ ہے صفدر اور کتنا خیال رکھتا ہے ہمارا، سچ کہتے ہیں اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔"

اور زیب بخوبی آگاہ تھی کہ امی اس سے تائید کیوں چاہ رہی ہیں۔ تبھی "پتا نہیں۔" کہہ کر اوپر چلی آئی۔ عادل غائب تھا۔ زیب نے دیوار پر سے جھانکا۔ مسرت ہنڈیا بھوننے کے ساتھ ساتھ عادل سے باتیں کر رہی تھی اور عادل چارپائی پر بیٹھا پلیٹ پر چمچ بجا بجا کر خوش ہو رہا تھا۔ زیب جانتی تھی اب وہ ایک آدھ گھنٹہ آسانی سے گزار لے گا۔ تب ہی چیزیں اٹھا کر نیچے چلی آئی تھی۔

* * *

چھوٹے سے گھر کا چھوٹا سا آنگن تھا۔ امرود کا اکلوتا درخت ٹنڈ منڈ کھڑا تھا۔ آنگن میں ایک طرف گھڑونچی پر دو گھڑے دھرے تھے۔ جن کے اوپر سفید کروشیے سے بنے رومال ڈال رکھے تھے۔ داہنی دیوار کے پاس دھوپ ابھی باقی تھی۔ وہیں بچھے تخت پر طارق سرتاپا چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ پاس ہی بے بے کروشیے سے رومال بنا رہی تھیں۔ اس عمر میں بھی ان کی بینائی قابل رشک اور ہاتھوں کی رفتار قابل دید تھی۔ اندر فل آواز میں ٹیپ ریکارڈر بج رہا تھا۔

کون ہے وہ لڑکی
رہتی ہے وہ کہاں
آنکھوں سے لکھی جس نے
اس دل پہ داستاں
چپکے سے پاس آئے دھیرے سے مسکرائے
نظروں کو جب ملائے پاگل ہو جاتا ہوں میں
کون......

یہیں یہ ٹیپ ریکارڈر ہچکی لے کر رک گیا تھا۔

"لعنت ہے، اب میں پڑھوں گا کیسے۔" اندر سے جھنجھلائی ہوئی آواز ابھری۔ بے بے نے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

"یہ تم پڑھ رہے تھے۔ کتاب لے کر فوراً باہر نکلو، کچن سے۔" آپا نے اپنے اکلوتے فرزند کی فوراً خبر لی۔ وہ باہر نکلا تو بغل میں ٹیپ دبا تھا اور ہاتھ میں رنگ برنگے پیچ کس اور چاقو

چھریاں تھامے ہوئے۔

"یہ کتاب ہے۔" آپا نے کچن کے دروازے میں سے گھورا

"بس امی حضور! اک ذرا انتظار ابھی اس سے نبرد آزما ہو کر کتاب اٹھاتا ہوں۔" وہ تخت کے پاس چیزیں بکھرا کر نیچے ہی بیٹھ گیا۔

"توبہ بھیا! کتنے گندے ہو تم۔" کچن سے پیالہ لے کر نکلتے ہوئے گیارہ بارہ سالہ لڑکی نے اسے نیچے بیٹھے دیکھ کر منہ بنایا۔ وسیم بس گھور کر ٹیپ ریکارڈر کا پیٹ چاک کرنے لگا۔

"ماموں! ماموں۔" فروا نے سوئے ہوئے طارق کا کندھا ہلایا۔

"کیا ہے؟" اس نے چہرے سے چادر ہٹا کر مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"ماموں! دلیہ کھالیں۔"

"ہونہہ۔" اس نے دوبارہ چادر تان لی۔

"ماموں! دلیہ کھالیں نا۔" فروا نے دوبارہ اس کا کندھا ہلایا۔

"تنگ مت کرو فروا۔" وہ کروٹ بدل گیا۔

"ہاں نہ چھیڑ ملنگاں نوں۔" وسیم نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر کہا۔

"ماموں انہیں بھی۔" فروا نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

"مجھے نہیں کھانا' جاؤ لے جاؤ۔" اب کے وہ جھنجھلایا تھا۔

"میں میں تو سارا دلیہ کھا جاتی ہوں۔" اندر سے گڑیا برآمد ہوئی۔

"گڑیا کو کھلا دو' میں نہیں کھا رہا۔"

"دو چمچ کھالے پتر۔ پھر دوا بھی کھانی ہے۔" بے بے نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ انہیں معلوم تھا۔ جب اسے بخار ہوتا تھا۔ وہ کھانے کے معاملے میں یونہی نخرے کرتا تھا۔

"بے بے! آپ کو پتا تو ہے مجھے دلیہ اچھا نہیں لگتا۔" وہ تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھا۔ چہرہ بخار کی حدت سے تپ رہا تھا۔

"پتر! ڈاکٹر نے کہا ہے نرم غذا دینے کو۔ چل دودھ کے ساتھ ڈبل روٹی لے لے۔"

"نہیں۔"

"یخنی بنوا دوں۔"

"چلیں وہ ٹھیک ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے الجھے ہوئے بال سنوارے۔

"وسیم! جا اپنے نانا کے پاس دکان پر ان کو کہنا تھوڑا گوشت لے کر بھجوا دیں۔ طارق کے لئے یخنی چڑھانی ہے۔"

"اچھا بے بے! جاتا ہوں۔" وہ مصروف سے انداز میں بولا تھا۔

"ابھی اٹھ۔" بے بے نے گھورا تو وہ سب چھوڑ چھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"چل پتر! تب تک تھوڑا دلیہ کھالے۔" بے بے نے پیار سے کہا تو وہ منہ بنانے لگا۔

"توبہ ہے کیسے بچوں کی طرح نخرے کرتے ہو طاری تم۔" آپا کچن سے برآمد ہوئیں۔

"بے بے! کتنی دفعہ کہا ہے شادی کر دو اس کی۔ گھر والی آئے گی تو سارے نخرے بھول جائے گا۔"

"کیوں آپ نے کسی تھانے دارنی سے نکاح کروانا ہے میرا۔" اس نے مسکرا کر فروا کے ہاتھ سے پیالہ تھام لیا اور خواہش نہ ہونے کے باوجود تھوڑا تھوڑا کھانے لگا۔

"تمہارے ساتھ تو کوئی تھانے دارنی ہی نباہ کر سکے گی۔" آپا برآمدے میں مشین کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

"پتر! اب مان بھی جا۔ دیکھ پورے بتیس کا ہو گیا ہے تو۔" بے بے کا من پسند موضوع چھڑ گیا تھا۔

"چالیس کا ہو جاؤں پھر کروں گا۔" اس نے بات ٹالی۔

"اے ہے۔ کیا بڈھے کھوسٹ ہو کر بیاہ کرو گے۔" بے بے نے بری طرح گھورا۔

"تو پھر چھوڑیں۔ تھوڑی عمر ہے یونہی کٹ کٹا جائے گی۔ شادی کر کے کیا ملے گا۔"

آپا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ طارق نے دیکھ لیا' تب ہی بات بدل کر بولا۔

"کچھ سالوں بعد وسیم کی شادی کریں گے۔"

"بھانجا کندھے برابر آنے لگا ہے۔ اب تو شرم کر لے۔ گھر والی آئے گی سوسکھ دے گی۔"

"اور جو آ گئی بے بے! دکھ دینے والی' انتشار پھیلانے والی تو کیا کریں گے' اتنا چھوٹا سا تو گھر ہے اپنا۔"

وہ جو بات بے بے کو سمجھانا چاہ رہا تھا۔ بے بے سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ پر آپا سب سمجھتی تھیں ...رسانیت سے کہنے لگیں۔

"فضول سوچتے ہو طاری! ہماری خاطر اپنی جوانی کیوں رولتے ہو۔ ہمارا کیا ہے' کسی ...میں پڑے رہیں گے۔ وسیم اب چھوٹا تو نہیں اس عمر میں تم نے پورا گھر سنبھال لیا تھا۔ ...کسی کام پر لگا دو۔"

...نے کبھی احساس بھی نہ ہونے دیا تھا کہ وہ محض ان کی وجہ سے شادی نہیں کر رہا۔ آج ...سے یہ بات سن کر اسے دکھ ہوا۔

"اس کا مستقبل داؤ پر لگا دوں اپنی طرح اور آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں آپا! میں شادی نہیں
کر رہا اس کی تو کوئی اور وجہ ہے۔" اس نے پیالہ فروا کو تھما دیا۔ جو پاس کھڑی خاموشی سے بغور
سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"تو وہ وجہ بتا دیں نا ماموں۔" وسیم واپس آ گیا تھا۔

"گوشت کہاں رکھ آئے؟" بے بے نے پوچھا۔

"نانا لے کر آ رہے ہیں۔" وہ اپنے سابقہ کام میں مصروف ہوا پھر سر اٹھا کر پوچھنے لگا۔

"ماموں! بتا دیں نا۔"

"کیا؟" وہ تکیے پر سر رکھ کر پھر سے دراز ہوا۔

کون ہے وہ لڑکی
رہتی ہے وہ کہاں

وہ شرارت سے گنگنایا۔

"سچ بے بے انہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ لائیں گی۔"

"کن کو؟" گڑیا اپنے خیالوں سے چونکی۔

"اپنی ممانی کو۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں یار! ابھی تک کوئی من کو بھائی ہی نہیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"گھر آ گئی تو بھا جائے گی۔" بے بے نے پتے کی بات کی۔ "اچھا یہ بتا تو بیبا کیسی
ہے۔"

"بہت اچھی ہے۔"

"تو پھر اس کی بات کروں۔"

"بڑی بہن آپا ہیں تو چھوٹی بیا' آپ کیا بات کریں گی۔" اس کی نگاہوں میں شرارت
مچلی۔ بے بے خفا ہو گئیں۔ طارق نے مسکراتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"سچ کہتا ہوں بے بے! کر لوں گا شادی' تھوڑا وقت تو دیں۔"

حقیقت تو یہی تھی کہ اس کے دل و دماغ میں یہی خوف جا گزین تھا اگر شادی کے بعد اس
سے وسیم' فروا اور گڑیا اگنور ہو گئے تو۔ اگر اس کی بیوی کوئی ایسی لڑکی ہوئی جو آپا کی اس گھر میں
موجودگی برداشت نہ کر سکی تو۔ ایف ایس سی کے ایگزام دے کر فارغ ہوا تھا جب آپا بیوہ ہو کر
سے اس گھر میں آ گئی تھیں اور اکیلی نہ تھیں ساتھ میں تین بچوں کا ساتھ بھی تھا۔ طارق کو اندازہ
تھا۔ ابا کی چھوٹی سی دکان سے اس کی تعلیم اور اتنے سارے افراد کا خرچ نہیں چل سکتا تب ہی اس

نے دل پر جبر کر کے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ ڈرائیونگ سیکھ کر اس نے ٹیکسی کرایے پر لے لی تھی۔
خیال تو یہی تھا کہ ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر بی اے کر لے گا۔ مگر غم روزگار نے اتنی مہلت ہی
نہ دی۔ اب اس کی ساری امیدیں وسیم سے وابستہ تھیں۔ جو اسی سال کالج گیا تھا اور اس نے آپا
کو ہمیشہ اسی بہانے سے ٹالا تھا کہ ابھی اسے من پسند لڑکی نہیں ملی کہ کہیں وہ خود کو اس گھر پر بوجھ
تصور نہ کرنے لگیں۔

اور وہ بیا کہتی تھی۔

"طارق! تمہیں خود پر اعتبار نہیں ہے نا۔" وہ اس کے چچا کی اکلوتی اولاد تھی اور اس سے
کہیں چھوٹی پھر بھی اسے طاری یا طارق کہہ کر بلاتی تھی اور وہ کہتا تھا۔

"تم سچ کہتی ہو بیا! کون جانے کل کیا ہو کہ میں صرف اپنے بارے میں سوچنے لگوں
تب تب ان بچوں کا کیا ہو گا۔ پھر ان بچوں کو بھی اپنے خواب وقت کے ہاتھوں رہن رکھنے پڑیں
گے۔ پر میں وسیم کو طارق بننے نہیں دوں گا۔"

تب وہ نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے پوچھتی تھی۔

"طارق۔ تم اتنے اچھے کیوں ہو۔ انوکھے سے۔ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا اور وہ بالکل تم
جیسا ہوتا۔"

* * *

"تمہاری ماں نہیں ہیں۔" اس لڑکی کی آواز صاف اور پر اعتماد تھی۔ ساتھ بیٹا شخص سٹپٹا
گیا۔ وین کے دوسرے مسافر چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"گھنٹے بھر سے اپنی بے سری آواز میں راگ الاپ رہے ہو۔ اپنی ماں بہنوں کو سناؤ جا کر
جی بھر کے خوش ہوں گی اور یہ گھٹنے تمہارے قابو میں نہیں آتے تو اتار کر گھر رکھ آیا کرو۔"

وین نہر کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی اور نہر کے پانیوں پر شام ڈھلتی تھی۔ مسکراہٹ جاگی
تو بے عزت ہوتے شخص کو تاؤ ہی آ گیا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"ایک تھپڑ رسید کروں کہ تمہیں یاد آ جائے' تم نے کیا کیا ہے اٹھو یہاں سے۔" وہ یوں
تحکمانہ انداز میں بولی تھی جیسے یہ وین اس کی ملکیت ہو۔

"اٹھ جاؤ یہاں سے۔" دو تین بندوں نے اسے وہاں سے اٹھا کر اس کی جگہ ایک بابا جی کو
بٹھا دیا تھا وہ لڑکی ذرا مسکرا کر زیب کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وین میں سفر کرنے والی لڑکیوں کو مال مفت سمجھ لیتے ہیں یہ لوگ۔ ان کا علاج اسی طرح

ہوتا ہے۔ خیر میرے تو بھائی کی ویگن خراب ہے اس لئے یوں دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ ورنہ خاصی سہولت رہتی ہے۔''

وہ خاصی پر اعتماد اور لا پرواسی لڑکی تھی۔ سادہ سا لباس' پاؤں میں عام سی چپل' زیب بدقت مسکرائی تھی۔ ورنہ اس کا چکراتا سر کچھ بھی نہ سمجھ رہا تھا۔ بخار تو اتر گیا۔ کمزوری ابھی باقی تھی۔ وہ امی کے منع کرنے کے باوجود آ گئی کہ چھٹیاں کافی ہوگئی تھیں۔ صبح افراتفری میں ناشتہ بھی نہ کر پائی اسکول میں امیراں بی بی نے کہا کہ وہ گھر سے کچھ لے آتی ہیں۔ اسے شرمندگی سے محسوس ہوئی۔ وہ ہر روز اس کیلئے اتنا تکلف کرتی تھیں اس نے سہولت سے منع کر دیا اور اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل ڈوبا جا رہا ہو۔ ویگن بنگلا میں کھڑی ہوئی تھی یہاں سے اکثر مسافر اتر جاتے تھے۔ باہر رنگ برنگے ہوٹلوں اور پھل فروٹ کی ریڑھیوں نے رونق سی لگا رکھی تھی۔ اس نے چکراتے سر کو قابو کرتے ہوئے پرس ٹٹول کر پیسے نکالے۔ اس سے قبل کہ کھانے کو کچھ خریدتی کہ اچانک جیسے پوری ویگن گھوم گئی تھی۔ چکراتے سر کو سنبھالتے سنبھالتے اس نے بے اختیار اپنا سر ساتھ بیٹھی لڑکی کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔ پھر اس پر جھک کر پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔''

زیب کی آنکھوں کے سامنے سیاہ پردہ سا لہرا گیا۔ دل جیسے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

''پلیز۔ کچھ کھانے کو منگوا دیں۔''

وہ جیسے لمحوں میں سمجھی تھی۔ کھڑکی سے آواز دے کر اس نے کیلے والے کو بلوایا۔ پھر تھوڑا تھوڑا کیلا اپنے ہاتھ سے اسے کھلایا تھا۔ پیٹ میں کچھ پڑا تو اس کا ڈوبتا دل ٹھہر سا گیا۔

''اب ٹھیک ہیں آپ۔'' وہ دوستانہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ زیب نے ماتھے پر آیا پسینہ چادر میں جذب کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیں جوس پیئں۔'' تازہ سنگترے کا جوس اس نے ابھی ابھی ریڑھی والے سے نکلوایا تھا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی۔'' زیب شرمندہ ہوئی۔

''ابھی بھی کہہ رہی ہیں اس کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ مسکرائی۔ زیب نے مزید شرمندہ ہو کر گلاس تھام لیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وین یہاں پندرہ بیس منٹ رکتی تھی۔

''تھینک یو سو مچ دراصل میں صبح ناشتہ۔'' جوس پی کر زیب نے گلاس منتظر کھڑے ریڑھی والے کو دیا۔

''اور دوپہر میں لنچ بھی نہیں کیا ہوگا۔''

''ہاں بس۔'' زیب کیا کہتی۔

''میں ثوبیہ ہوں۔'' لڑکی نے تعارف کروایا۔ اس کا لہجہ سادہ اور انداز پر خلوص تھا۔

''میں زیب ہوں۔''

''اچھا نام ہے۔ تو زیب جی! اپنی طرف سے اتنی لا پروائی۔ اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے' کوئی دوسرا نہیں رکھتا۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سرزنش کی۔ وہ اچھی ہنس مکھ سی لڑکی تھی۔ لمحوں میں بے تکلف ہوگئی۔ بلکہ اگلے کئی دنوں تک وہ زیب کیلئے اچھی کمپنی ثابت ہوئی تھی۔

* * *

وین ذرا دیر کو رکی تھی۔ کھیتوں کے درمیان نمودار ہوتے رستے پر ایک اماں بی لڑھکتی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں ٹوکری تھی۔ بغل میں گٹھڑی دبی تھی۔ کنڈیکٹر بیرونی دروازے سے لٹکا چلا رہا۔

''ماں جی! جلدی کرو۔ ویگن بس چلنے والی ہے۔''

وہ ہانپتی کانپتی پاس آئیں۔ گٹھڑی اور ٹوکری بے تکلفی سے زیب کی گود میں پھینکی۔ اپنی ہی سوچوں میں گم زیب اس ناگہانی آفت پر بری طرح چونکی کہ ٹوکری میں بند مرغیوں نے اس طرح پھینکے جانے پر احتجاجاً صدائیں بلند کر دی تھیں۔ اماں جی کنڈیکٹر کی مدد سے ویگن میں سوار ہوئیں ابھی بیٹھنے کو جگہ ڈھونڈ رہی تھیں کہ ویگن ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوگیا؟'' کے جواب میں اعلان ہوا۔

''ویگن خراب ہوگئی ہے۔''

''لو یہ ایک اور مصیبت گلے پڑ گئی'' زیب نے کوفت سے سوچا۔ پھر ٹوکری' گٹھڑی اماں جی کی گود میں پٹخ کر دوسرے مسافروں کی دیکھا دیکھی نیچے اتر آئی۔ ڈرائیور ویگن ٹھیک کرنے کی سعی کرنے لگا تھا۔ بیس منٹ کے بعد پیچھے سے ایک ویگن آئی اور رکنے کے بجائے آگے نکلتی چلی گئی۔ مگر تھوڑی دیر میں ریورس گیئر میں وہ عین زیب کے پاس آ کر رکی۔ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر ثوبیہ نے اسے پکارا۔

''آ جاؤ زیب۔'' زیب خدا کا شکر کرتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ باقی مسافر بھی جہاں تک ٹھنس سکے ٹھنس گئے۔

''دیکھ لو پھر کیسے ملاقات ہوگئی۔'' ثوبیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اتنے دنوں میں ان کے درمیان بے تکلف سی دوستی کا آغاز ہوگیا تھا۔

''تم کہاں تھیں تین دن سے؟'' زیب نے پوچھا۔

"میں نے بتایا تھا نا' میرے بھائی کی ویگن بھی اسی روٹ پر چلتی ہے۔ میں گھر سے ان کے ساتھ ہی نکلتی ہوں۔ تم سات بجے کی ویگن سے جاتی ہو۔ بھائی کی ویگن سوا سات بجے جاتی ہے۔ بس پندرہ منٹ کے فرق سے ہم دونوں آگے پیچھے چلے جاتے تھے اور دیکھو' یہ بھائی ہے طارق جس کی باتیں میں اکثر تمہیں بتایا کرتی تھی اور طارق! یہ زیب ہے۔"

ثوبیہ اتنی باتیں زیب کے متعلق سنایا کرتی تھی۔ طارق نے ایک متجسس سی نگاہ بائیں طرف ڈالی۔ پھر وہ بری طرح ٹھٹکا۔ وہ متجسس سی نگاہ اشتیاق اور اشتیاق آگہی کے کسی لمحے میں ڈھل گیا تھا۔ زیب طارق کی طرف توجہ دیئے بغیر ثوبیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ طارق نے ہمیشہ آپا کو ٹالا تھا۔ ہمیشہ یہ کہہ کر کہ ابھی تک وہ لڑکی ہی نہیں ملی جو اس کے من کو چھو جائے۔ حالانکہ یہ صرف بہانہ تھا۔ مگر نجانے کب یونہی بہانے تراشتے تراشتے ان کے دل و دماغ میں ایک شبیہ ابھر آئی تھی۔

ہاں وہ ایسی ہوگی۔

دھیرے دھیرے باتیں کرتی' چپکے چپکے مسکراتی "اور یہ لڑکی۔" اس نے ایک بار پھر نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"یا خدا! یہ لڑکی اس شبیہ سے اتنی مشابہ کیوں ہے؟"

وہ جیسے اپنے ہی جذبوں سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔

* * *

پھر اگلے کئی دن وہ اسے نظر نہیں آئی۔ ہر روز وہ نئی امید سے نکلتا اور واپسی پر عجیب سی بے چینی 'ایک بے نام سی اداسی اس کا گھیراؤ کر لیتی۔

"تمہاری سہیلی نظر نہیں آئی کئی دنوں سے۔" اس نے بے حد سرسری لہجے میں قدرے ڈرتے ڈرتے ثوبیہ سے پوچھا۔

"اسے جلدی اسکول جانا ہوتا ہے تبھی سات بجے ہی نکل جاتی ہے۔"

اور اگلے ہی دن طارق نے عبداللہ کو گھیر لیا۔

"عبداللہ! تم سوا سات بجے ویگن لے جایا کرو۔ میں سات بجے لے جاؤں گا۔"

"کیوں طارق بھائی؟" عبداللہ حیران ہوا۔

"یونہی بس وہ۔" اسے کوئی مناسب بہانہ نہ سوجھا۔ مگر عبداللہ نے زیادہ کرید نہ کی۔ فوراً ہی مان گیا اور اگلے دن ثوبیہ کو تیار ہونے کا کہہ کر وہ سوچ رہا تھا۔

"وہ سب کیوں کر رہا ہے؟ کیا محض اسے ایک نظر دیکھنے کو اور اس ایک نظر کے بعد کیا ہوگا۔؟"

مگر وہاں دبیز خاموشی چھائی تھی۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟" ثوبیہ جھنجھلاتے ہوئی پوچھ رہی تھی۔

"بس پندرہ منٹ کا فرق ہے۔" ثوبیہ کی امی نے پراٹھا بناتے ہوئے اسے گھورا۔

"ٹائمنگ بدل گئے ہیں بیا! تم جلدی کرو۔"

"ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ اس طرح زیب سے روز ملاقات ہو جایا کرے گی۔"

"اس کیلئے تو یہ کر رہا ہوں۔"

اور اسٹاپ پر سیاہ چادر میں چھپی ویگن کے انتظار میں کھڑی زیب پر ایک نظر ڈال کر ہی اس کی روح تک شانت ہوگئی تھی۔

"ہیلو زیب! جس دن تم سے نہ ملوں۔ تشنگی سی رہ جاتی ہے۔" ثوبیہ نے حسب معمول اسے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا۔

"اب تو روز ملاقات ہوگی۔" زیب کو بھی اس طرح سہولت ہو جاتی تھی۔ کہ پیچھے بھانت بھانت کے لوگوں میں بیٹھنے سے نجات مل جاتی تھی۔

"لیکن خدا کیلئے اب لیٹ مت ہو جایا کرنا ورنہ جس دن تم نہ ملیں۔ میں تمہارے گھر پہنچ جایا کروں گی۔"

"یو آر موسٹ ویلکم۔" زیب نے ہنس کر کہا۔

"یہ تو ہنستی بھی بالکل ویسے ہی ہے۔" طارق نے اس مدھر جھنکار کو سن کر بے اختیار سوچا

* * *

چھٹی کا دن تھا۔ امی نے اس کے سر میں ڈھیر سارے تیل کی مالش کر دی تھی۔ عادل کو سلا کر باہر نکلی تو امی مارکیٹ جانے کو تیار تھیں۔

"مٹر رکھے ہیں زیب۔ تھوڑے آلو ڈال لینا۔ سبزی والا آتا ہی ہوگا۔"

"کر لوں گی کچھ نہ کچھ امی! آپ مارکیٹ جا رہی ہیں۔"

"ہاں' کچھ منگوانا ہو تم نے تو بتا دو۔"

"کچھ خاص تو نہیں۔ عادل کا سیریلیک ختم ہونے والا ہے۔ وہ لیتی آیئے گا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

امی چلی گئیں تو وہ پیاز نکال کر بیٹھ گئی۔ خیال یہی تھا کہ جب تک سبزی والا آتا ہے وہ پیاز اور مٹر نکال لے۔ پر عادل کے رونے کی آواز پر وہ اندر آ گئی۔ شاید وہ نیند میں ڈر گیا تھا۔

اس کے ساتھ لیٹ کر وہ اسے تھپکنے لگی۔ عادل نے ایک بازو اس کے گلے میں ڈال
سی دیر میں پرسکون ہو گیا۔

"کب بڑے ہو گے عادل۔" وہ اس کا ننھا منا ہاتھ لبوں سے لگاتے ہوئے
عادل نیند میں مسکرایا تھا۔ اسے تھپکتے' باتیں کرتے نجانے کب اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔
کھلنے کی وجہ گلی میں سبزی والے کی آواز تھی یا وہ نامانوس سا احساس کسی نے بہت دیر سے
کے چہرے پر بکھرے بالوں کو سمیٹا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"تم۔" پیچھے ہٹتے وحید کو دیکھ کر اس کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ وحید نے تیزی سے
کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا پھر اپنائیت بھری خفگی سے بولا۔

"اس طرح کیوں چلا رہی ہو میں کوئی غیر تو نہیں۔"

زیب نے تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور پھرتی سے کھڑی ہو گئی۔

"کیوں آئے ہو اس طرح۔"

"اتنی جلدی کیا ہے' اطمینان سے بتا دوں گا۔ ابھی تو تم اپنے حواسوں میں بھی نہیں۔
شاباش پہلے منہ ہاتھ دھو آؤ۔ پھر بات کریں گے۔" وہ پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا
انداز اتنا پرسکون تھا جیسے زیب اس کے گھر میں کھڑی اس پر چلا رہی ہو۔ "جاؤ شاباش۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔ شدید غصے سے اس کا سانس دھونکنی کی
طرح چلنے لگا تھا۔ "تم اندر آئے کس طرح۔ تمہاری اتنی ہمت۔"

"دروازہ کھلا تھا' اس لئے اندر چلا آیا۔" اس نے اطمینان سے پوچھا۔

"یہ دروازہ پچھلے کئی برسوں سے یونہی کھلا ہوتا ہے مسٹر وحید! آج تک کسی کی ہمت نہیں
ہوئی۔ یوں بغیر اجازت اندر گھسنے کی اور تم۔" وہ غیظ و غضب سے پھنکاری تھی۔

"بالکل بھی نہیں بدلی ہو تم' بالکل ویسی کی ویسی ہو۔" وہ اسے نگاہوں کے حصار میں لیتے
ہوئے بولا۔ زیب کا دل چاہ رہا تھا' اس ذلیل شخص کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دے۔ اس نے
دونوں مٹھیاں بھینچ کر غصے کی شدت کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

"کیوں آئے ہو؟"

"تم سے ملنے' تمہیں دیکھنے۔"

"شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔ کوئی حق نہیں تمہیں مجھ سے اس طرح بات کرنے کا۔"
کر بولی۔

"کیوں نہیں ہے آخر تم میری۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا' کیا ہوں میں تمہاری۔؟" زیب کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "وہ رشتہ جو میرے اور تمہارے
بیچ تھا۔ کب کا توڑ ڈالا تم نے۔ اب کس ناتے سے آئے ہو۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس۔" وہ اتنے اطمینان سے اور اچانک بولا تھا کہ زیب
ششدر رہ گئی۔

"تنہائی میں کہے گئے وہ تین الفاظ کس نے سنے تھے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ زیب نے سر
اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تو تم اب مجھے یوں بلیک میل کرنے آئے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے زیب۔ نہ جانے کیوں وہ تھوڑا شرمندہ ہو گیا تھا۔ میں تو صرف اپنے
بچے سے ملنے آیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم وہ بیٹا ہے یا بیٹی۔" وحید کے لہجے میں محرومی در آئی
تھی۔ جبکہ زیب کے سارے اعصاب کھنچ گئے۔ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی
تھیں۔

"بچہ کون سا بچہ؟"

"زیب! تم ایسے نہیں کر سکتیں۔ تمہارا میرا رشتہ ٹوٹ گیا' میں نے مانا۔ مگر بچے کے ساتھ
میرا تعلق ساری زندگی نہیں ٹوٹ سکتا۔" وہ قدرے مفاہمانہ انداز میں گویا ہوا۔

"وہ صرف میرا بیٹا ہے مسٹر وحید! اور یہ بات تم نے خود کہی تھی۔" اس کے لہجے میں آگ
سلگ رہی تھی۔

"اوہ تو بیٹا ہے' کیا نام رکھا تم نے۔" اس کی نگاہ گلابی کمبل میں لپٹے عادل تک گئی۔ وہ بے
اختیار دو قدم آگے ہوا تھا۔ مگر زیب اس کے اور عادل کے درمیان حائل ہو گئی۔

"کوئی حق نہیں تمہارا اس پر۔"

"میرے حق کو چیلنج مت کرو۔ باپ ہوں میں اس کا" وحید کے لہجے میں ہٹ دھرمی در
آئی۔

"اس کی صرف ماں ہے۔ آئی سمجھ میں بات۔" زیب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
پھنکاری "اس کا باپ نہ پہلے تھا نہ آج ہے۔"

"ایسے تو مت کہو۔ میرے وجود سے انکار کر رہی ہو۔ جانتی نہیں ہو ایسے بچوں کو معاشرہ کس
نام سے یاد کرتا ہے۔"

"ہاں' اور یہ نام تم نے خود اسے دیا تھا۔"

"غصے میں کہی گئی بات کو بنیاد مت بناؤ۔"

''غصے میں بھی کوئی باپ اپنی اولاد کو اتنی بڑی گالی نہیں دیتا۔ یہ کام صرف تم جیسے گھٹیا لوگ ہی کرتے ہیں۔''

''بس بہت ہوگئی۔'' وحید نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا تھا۔ ''میں اپنے بیٹے سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

''اچھا'' وحید کا لہجہ عجیب سا ہوگیا۔ ''لگتا ہے' گھر میں اس وقت تمہاری ماں موجود نہیں۔ خیر وہ ہوتی بھی تو کیا کر لیتی۔''

زیب کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

''زیب۔'' وہ اس کے قریب آیا۔ ''جو اس لمحے میں اپنے بیٹے کو یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں تو تم روک سکو گی مجھے۔''

زیب کے وجود میں کپکپی دوڑ گئی۔ شدید غصہ تھا یا خوف' کوئی آتشیں سیال تھا جو لہو کی جگہ بہنے لگا تھا۔ وہ اس کی طرف پلٹی۔

''شاید وہ ایسا ہی کوئی لمحہ ہوتا ہے۔ جب ایک کمزور عورت قتل کرتی ہے۔''

اس کے لہجے میں نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وحید استہزائیہ لہجے میں ہنس دیا۔

''یار! تمہاری یہی جی داری مجھے پسند تھی نہ جانے اماں کو کیوں۔''

اور زیب کا سارا ضبط جواب دے گیا۔ بے تحاشا روتے اور چیختے ہوئے زیب نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

وہ لڑکھڑا کر دروازے میں رکا۔ اس سے قبل کہ وہ پلٹ کر جوابی حملہ کرتا۔ باہر کا دروازہ بجا تھا۔

''آ جاؤ'' زیب چلائی۔ اس وقت جو بھی ہوتا غنیمت تھا۔ صفدر بھائی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ پھر وحید کو دیکھ کر بری طرح چونکے۔ جبکہ وحید نے اپنے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے معنی خیز سی نظر صفدر اور زیب پر ڈالی۔

''چلتا ہوں۔ لیکن پھر آؤں گا۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

''یہ کیوں آیا تھا؟'' صفدر بھائی تیزی سے اس کے قریب آئے' جبکہ وہ بازوؤں میں چہرا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

* * *

کب سے وہ واش بیسن پر لگے آئینے کے سامنے کھڑا دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا۔ شیو بنانے' برش کرتے اور بال بناتے ہوئے اس نے کبھی اتنی دیر نہ لگائی تھی۔

عجب عالم خود فراموشی تھا۔

آپا نے کئی بار اس کی گنگناہٹ کو سنا اور مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ بے بے الگ سرتاپا اس کا جائزہ لے چکی تھیں۔

وسیم کئی بار اس کے پاس سے کھنکارتے ہوئے گزرا تھا اور ثوبیہ تو کب سے کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے سامنے آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ طارق ذرا سا ٹھٹکا۔

''کیا ہوا بیا؟''

''ایک بات پوچھوں طاری'

''پوچھو۔'' اس نے پھر سے کنگھا اٹھا کر بال بنانے شروع کر دیے۔

''تم آج کل بہت خوش رہنے لگے ہو۔''

''ہاں۔'' وہ بس ذرا سا ٹھٹکا تھا۔

''میں نے پہلے تمہیں کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔''

''میں تو ہمیشہ اتنا ہی خوش ہوں۔'' وہ کنگھا رکھ کر اس کی طرف پلٹا

''نہیں۔'' بیا نے تیزی سے سر ہلایا۔ ''تم سرتاپا بدل گئے ہو طاری۔'' اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ جاگی تھی۔ ''کہتے ہیں صرف محبت ہی میں اتنی طاقت ہے جو انسان کو پورے کا پورا بدل دیتی ہے۔''

''کیوں فضول بول رہی ہو بیا۔'' اس نے بری طرح گڑبڑا کر تولیہ اسے کھینچ مارا تھا۔

''یہ سچ ہے طاری! تم مان لو۔''

''خوامخواہ ہی۔''

''تم صرف یہ مان لو کہ تم محبت کرنے لگے ہو بس۔'' بیا جان چھوڑنے والی نہیں تھی۔

''تو اس سے کیا ہوگا؟'' طارق کے چہرے پر خجالت آمیز سرخی بکھری تھی اور ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ۔

''پھر میں تم سے اس کا نام نہیں پوچھوں گی۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ طارق نے ذرا سا سوچا پھر سنجیدہ ہونے کی کوشش کی۔

''ہاں شاید۔'' پھر ذرا رک کر بولا۔ ''محبت کا تو پتا نہیں' البتہ وہ مجھے اچھی ضرور لگی ہے۔''

"بہت اپنی اپنی سی نا؟" بیا نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ہاں۔مگر تم مجھ سے اس کا نام نہیں پوچھو گی۔" طارق نے چور نظروں سے آپا کی طرف دیکھا۔وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھیں۔فوراً اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔
"نہیں پوچھتی۔مگر چلو زیب کے گھر چلتے ہیں۔" بیا نے اچانک ہی کہا۔
"زیب کے گھر۔کیوں؟" وہ اس بری طرح گڑبڑایا تھا کہ بیا بے اختیار ہنستی چلی گئی۔پھر ہاتھ ہونٹوں پر رکھتے ہوئے ہنسی روک کر بولی۔
"کیوں کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں۔" طارق جھنجھلا گیا۔
"تو پھر چلیں؟" بیا کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔
"کوئی ضرورت نہیں۔روز تو ملتی ہو۔" وہ اک دم بگڑا پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔
"بھاگ گیا۔" بیا تولیہ دیوار پر پھیلا کر آپا کے پاس آگئی۔
"کیا بتایا اس نے۔" آپا نے اشتیاق سے پوچھا۔
"بہت گھنا ہے آپا! یوں نہیں کھلے گا۔مگر آپ فکر مت کریں۔مجھے سب خبر ہے۔"
"کیا خبر ہے۔کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"
"بتاؤں گی آپا! ابھی تصدیق تو کرنے دیں۔کب تک بھاگیں گے موصوف۔"
بیا کے لہجے میں کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں در آئی تھیں۔

* * *

زیب کا ذہن ویگن کی دگنی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔لامتناہی سوچوں کا سلسلہ تھا۔
صبح آنے سے پہلے وہ امی کو کتنی ہدایات دے کر آئی تھی۔پھر بھی اندیشے بار بار سر اٹھا رہے تھے۔
وحید نے کہا تھا۔
"اگر وہ ہوتیں بھی تو کیا کرلیتیں۔"
اور اگر وہ پھر سے ملنے چلا آیا گھر۔
اگر وہ میری غیر موجودگی میں عادل کو لے گیا تو......تو امی کیا کرلیں گی۔
اس خیال سے جیسے اس کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ویگن کو جھٹکا لگا تھا۔اس نے جیسے پہلی بار اپنی موجودگی کو ویگن میں محسوس کیا تھا۔آج وہ خاصی لیٹ ہوگئی تھی۔اس لئے آخری ویگن پکڑ سکی تھی۔ویگن ایک اسٹاپ پر رکی تھی۔یہ اسٹاپ بھی بڑے عجیب تھے۔دور کھیتوں کے درمیان نکلتے

رستے کسی نہ کسی گاؤں کی طرف جاتے تھے۔وہیں موڑ پر بیٹھے دو چار لوگ ویگن کا انتظار کر رہے ہوتے۔
کچھ اور لوگ ویگن میں سوار ہوئے۔عین سامنے بیٹھے بابا جی کو اپنا جاننے والا مل گیا۔وہ اس کو اپنا قصہ سنانے لگے۔ان کے ساتھ بیٹھا شخص خاصے معقول لباس میں ملبوس تھا۔ویگن چل پڑی تھی اور بابا جی زور و شور سے کہہ رہے تھے۔
"بس میں ادھر اتر کر رکشہ کی طرف چلا۔ادھر اس بے غیرت نے کندھا مارا۔پھر معاف کر دو بابا کہہ کر آگے چل پڑا اور میں نے رکشہ والے کو کرایہ دینے کے لئے پیسے نکالنے چاہے تو میری جیب خالی۔"
"بس بابا جی! زمانہ بڑا خراب ہے۔بندہ اپنا دھیان آپ رکھے تو رکھے۔" ساتھ بیٹھے شخص نے تائید کی اور ساتھ ہی اس کی انگلیوں نے بابا جی کے کرتے کی جیب ٹٹولی۔وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بیٹھا تھا اور اس کی انگلیاں ماہرانہ انداز میں جیب میں رینگ گئی تھیں۔زیب تو ہکا بکا رہ گئی۔بس نادانستگی میں اس کی نظر پڑ گئی تھی۔پیسے اپنی جیب میں منتقل کرتے ہوئے اس کی نگاہیں زیب کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ایک لمحے کو اس شخص کا رنگ متغیر ہوا۔ویگن رکی تھی۔اس سے قبل کہ وہ نکل جاتا۔زیب نے بے اختیار ہی بابا جی کو پکار کر بتایا تھا۔اس نے چھلانگ لگا کر نکلنا چاہا۔مگر بابا جی نے شور مچا دیا۔باہر لٹکتے طالب علم نے اس کی گردن دبوچ کر زوردار گھونسا اس کی ناک پر دے مارا۔آناً فاناً وہاں شور مچ گیا۔دو چار لوگوں نے اسے قابو کرلیا۔وہ بھاگ نہ سکا تھا۔
"ہائے او ربا۔میرے پورے ساڑھے چار سو روپے۔" بابا جی ہانپتے کانپتے نیچے اترے تھے۔ایک غریب کے لئے یہ رقم چار ہزار سے کم نہ تھی۔
"پولیس کو بلاؤ۔"
"ارے! اس بی بی نے بتا دیا ورنہ صفایا کر گیا تھا مردود۔"
"چھوڑو یار! پولیس کے چکروں میں کون پڑے۔پیسے لے کر چھوڑ دو۔اتنی نصیحت کافی ہے۔" کسی نے مشورہ دیا۔
"چلو ٹھیک ہے۔" سب کو اپنے اپنے کاموں پر جانے کی جلدی تھی۔
"جا اوئے۔عیش کر۔بلکہ رب کا شکر کر' ورنہ تھانے میں چھترول ہو رہی ہوتی۔"
کسی نے اسے دھکا دیا۔ویگن ذرا سی رینگی۔اس نے ناک سے بہتا خون آستین سے صاف کرتے ہوئے پلٹ کر ویگن کی طرف دیکھا۔اس کی خونخوار نظریں پرواز کرتی ہوئی زیب کے چہرے سے ٹکرائیں جو ذرا سی آگے جھکی بابا جی کی بات سن رہی تھی۔

* * *

اس نے اگلے دن یہ بات ثوبیہ کو بتائی تھی۔ وہ اچھل ہی تو پڑی۔

"اور تم نے پوری ویگن میں اعلان کر دیا"

"تو کیا کرتی' میں نے دیکھ جو لیا تھا۔"

"چپ ہو جاتیں۔"

"دیکھ لینے کے باوجود۔" زیب کو حیرت ہوئی۔

"ہاں نا۔ اب اگر وہ تمہارا دشمن بن جائے تو۔"

"لو خواہ مخواہ ہی۔ اسے تو میری شکل بھی یاد نہ ہوگی۔" زیب دل ہی دل میں ڈری تو تھی۔

"لو دشمن کی شکل بھی کوئی بھولتا ہے اور تم نے خود ہی تو بتایا تھا تمہارا رستہ خاصا سنسان بلکہ ویران ہوتا ہے جب تم اسکول جاتی ہو۔"

"ہاں ہوتا ہے مگر ثوبیہ تم نے بھی تو اس دن بھری ویگن اس شخص کی بے عزتی کی تھی۔" زیب نے قدرے پریشان لہجے میں کہا۔

"وہ تو اور بات تھی۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"تو اب کیا ہوگا؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ کندھے اچکا کر سامنے دیکھنے لگی۔ چھوٹی سی سڑک کے دونوں اطراف گھنے درختوں کی بہتات تھی۔ ان کے عقب میں جھاڑیاں پھر کھیتوں کے سلسلے دور کہیں دور جھانکتے گاؤں۔ سڑک کے اطراف اور اوپر رنگ برنگے پرندوں کا قبضہ تھا۔ ذرا کی ذرا اڑ کر وہ آنے والی ویگن کو رستہ دیتے اور پھر وہیں گھومنے لگتے اکثر یوں ہوتا کہ پرندہ اڑتے ہوئے ویگن کو چھو کر جاتا تھا۔ بہت پرسکون سڑک تھی۔

"ثوبیہ! یہ بھی تو کوئی ٹھیک بات نہیں ہمارے سامنے کوئی برائی ہو رہی ہو اور ہم اسے روکنے کی کوشش بھی نہ کریں۔" کچھ دیر بعد زیب نے کہا۔

"بھئی' زندگی احتیاطوں کے ساتھ گزرتی ہے۔" ثوبیہ نے بمشکل مسکراہٹ کا گلا گھونٹا تھا۔

"اور ہم جیسی لڑکیاں جو تنہا گھروں سے نکلتی ہیں انہیں تو خاص طور۔"

"بیا!" طارق نے اسے بری طرح گھورا تھا۔ کب سے وہ اس کی بے سروپا باتیں خاموشی سے سن رہا تھا مگر اب زیب کے چہرے پر لہراتے خوف کے سائے دیکھ کر اسے مجبوراً بولنا پڑا تھا۔

ثوبیہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی گئی۔

"اللہ زیب! تم کتنی ڈرپوک ہو۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ سچ تمہاری جگہ میں بھی ہوتی تو

بھی کرتی۔"

"تم بہت بدتمیز ہو ثوبیہ۔" زیب کو سچ مچ غصہ آگیا تھا اور اپنے اسٹاپ پر اترنے تک ثوبیہ اسے مناتی رہی تھی۔ زیب کا اسکول بعد میں آتا تھا۔ پھر ویگن نہر کے پل پر رکی۔ زیب اترتے اترتے رک گئی۔

"کیا ہوا؟" طارق نے اسے یوں ٹھٹکتے دیکھ کر بے اختیار پوچھا تھا۔ زیب نے بے بسی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ "رستہ تو واقعی بہت سنسان ہے۔"

طارق کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"آپ بھی کسی کی باتوں میں آگئیں۔ بیا کی تو عادت ہے' یونہی بولتی رہتی ہے۔"

"ہاں!" زیب نے دور تک جاتے دھند آلود رستہ پر نظر ڈالی۔

"میں...... میں چھوڑ آؤں آپ کو اسکول تک۔" طارق نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ آج پہلی بار اس نے زیب سے براہ راست بات کی تھی۔

"نہیں۔" زیب نیچے اتر گئی۔ ویگن چلی گئی تھی۔ زیب نے ایک نظر چائے والے کھوکھے کے مالک بابا جی کو دیکھا جو چارپائی پر اکڑوں چادر لپیٹے بیٹھے تھے اور دوسری نظر سنسان رستے پر اور پھر اپنی راہ ہولی تھی۔ ذہن ایک بار پھر پلٹ کر وحید کی طرف چلا گیا تھا۔

"اچانک اسے یاد کیسے آگیا کہ اس کی کوئی اولاد بھی ہے۔"

"کدھر جا رہی ہو استانی صاحبہ!" گھنی جھاڑیوں میں سے کوئی ایک دم اس کے سامنے آیا تھا۔ زیب نے اسے پہچان لیا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں ثوبیہ کی باتیں اس کے ذہن میں گونج گئی تھیں۔

"ک...... کیا بات ہے۔" اس نے بمشکل اپنے لرزتے لہجے پر قابو پایا۔

"شکر ہے پہچان لیا ورنہ اپنا تعارف خود کروانا پڑتا۔" وہی جیب کترا تھا۔ اس کی ناک سوجی ہوئی تھی۔ عین اس کے رستے میں حائل ہو گیا۔

"کیا بات ہے۔ راستہ چھوڑو۔" اس نے سختی سے کہا۔ دونوں ہاتھوں میں پرس تھام کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بابا جی کا کھوکھا دور رہ گیا تھا۔ چاروں طرف کسی ذی روح کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

"اچھا اور وہ جو میری بے عزتی ہوئی تھی بھرے بازار میں۔ اس کا حساب کون دے گا استانی صاحبہ۔" چاقو کڑچ کر کے کھلا تھا۔ زیب کا دل اچھل کر حلق میں آگیا (یا خدا اب اس دنیا میں نیکی کرنا بھی گناہ ٹھہرا۔)

"دیکھو یہ لے جاؤ۔ اس میں کچھ پیسے ہیں۔" زیب نے پرس اس کی طرف بڑھایا۔

"پیسے کی ایسی کی تیسی۔" وہ اس کی طرف لپکا۔

تب زیب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پلٹ کر دوڑ لگا دی تھی۔ مگر چادر پاؤں میں الجھ گئی۔ وہ منہ کے بل نیچے گری۔ اس کی تیز چیخ نہر میں بھینسوں کو ہنکاتی بجو نے سنی تھی اور دوسرے لمحے وہ اپنی ڈانگ سنبھال کر لپکی تھی۔

"ٹھہر جا۔" اس نے بے دریغ گالیاں دی تھیں۔ حملہ آور کا ننھا سا چاقو کوئی کام تب دکھاتا جب لمبی ڈانگ اسے مہلت دیتی۔ بجو کی پکار پر اس کا میاں نجانے کس کھیت سے نمودار ہوا تھا۔ مگر اس کے لئے بجو ہی کافی تھی۔ جب تک اس کا میاں پہنچا وہ چاقو چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔

"اٹھ جا کڑیے۔" بجو نے زیب کو اٹھایا۔ وہ مضبوط تن و توش کی خاصی جی دار عورت تھی۔

"کون تھا دھیے۔" اس کے میاں نے پاس آ کر شفقت سے پوچھا۔ کھوکھے والے بابا جی بھی پاس آ گئے تھے۔ زیب نے متوحش و ہراساں نظروں سے انہیں دیکھا اور چادر ٹھیک کرتے ہوئے دھیرے دھیرے انہیں بتایا۔

"دفع دور، تو فکر نہ کر اب تو ادھر دیکھے گا بھی نہیں، چل تجھے اسکول چھوڑ آؤں۔" بجو نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"تو فکر نہ کر، تو تو اپنی دھی رانی ہے اور دھیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ ادھر ویگن سے اترتے ہی ہماری ذمہ داری ہے۔ تو بے فکر ہو کر آ۔ اب کسی کی ہمت نہیں۔ تیری طرف اکھ اٹھا کر دیکھے۔"

بجو کے میاں نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ سب اسے اسکول تک چھوڑنے آئے تھے۔ پڑھانا خاک تھا۔ بار بار اس سچویشن کو سوچ سوچ کر آنکھیں چھلکتی رہیں اور اس کی یہ کیفیت باقی تینوں ٹیچرز سے چھپی نہ رہ سکی تھی اور پھر گاؤں میں کوئی بات چھپتی بھی کب ہے۔

واپسی پر بھی اسے پورا جلوس ویگن تک چھوڑنے آیا تھا۔ ان سب لوگوں کی ہمت اور یقین دہانی کے باوجود وہ کئی دن تک اسکول نہ جا سکی تھی۔

* * *

اس نے پہلی بار سوچا تھا

کاش اس کا کوئی بھائی ہوتا

کاش ابو زندہ ہوتے

کاش وحید ایسا نہ نکلتا

اور یہ کاش اس کی پوری زندگی کے گرد چکرانے لگا تھا۔ امی اس سے پوچھتی تھیں وہ اسکول کیوں نہیں جا رہی۔ وہ خاموشی سے ہٹ جاتی۔ کوئی جواب ہی نہ دیتی۔ امی نے صفدر بھائی سے کہا کہ اس سے پوچھو کیا ہوا ہے؟

اور زیب نے انہیں اپنا واحد سہارا سمجھتے ہوئے بتا دیا تھا اور بتاتے ہوئے رو دی تھی۔ وہ پریشان ہو گئے۔ اسے تسلیاں دلاسے دیتے رہے۔ اپنی حفاظت کے طریقے سمجھاتے رہے مگر ایک بار بھی یہ نہیں کہا۔ "میں کچھ دن تمہارے ساتھ چلا چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ناں، کوئی کہاں تک دوسروں کا ساتھ دے۔"

اس نے یاسیت سے سوچا تھا اور پھر اسکول کی تیاری کرنے لگی۔ اسے صفدر بھائی کے رویے سے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ شاید وہ ان پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی تھی۔ بہت سی توقعات وابستہ ہو گئی تھیں ان سے ویگن میں، ثوبیہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"ہاں یہ زندگی کچھ اتنی ہی بے مہر، سنگدل اور کٹھور ہے اور اپنے حصے کی مسافت مجھے ہی طے کرنا ہے۔ کم از کم تب تک جب تک عادل جوان نہیں ہو جاتا۔"

"کیا سوچ رہی ہو زیب؟" ثوبیہ اس کی طرف جھکی۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے قصداً مسکرائی۔

"میرے مسئلے میرے اپنے ہیں۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بتانے سے کیا فائدہ۔"

"تم بہت چپ چپ ہو۔ گھر میں سب خیریت ہے نا۔"

"سب ٹھیک ہے۔"

"زیب! تمہیں پتا ہے، میری منگنی ہو رہی ہے۔" طارق پاس بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمائے بظاہر مکمل انہماک سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے۔ بباطن اپنی پوری حسیات کے ساتھ ان کی طرف متوجہ تھا۔ ثوبیہ طارق کا خیال کر کے پوری کی پوری اس کے کان میں گھس آئی تھی۔

"اچھا کب ہو رہی ہے؟" اس نے سادہ سے لہجے میں پوچھا یوں جیسے بے دھیانی میں پوچھ رہی ہو۔ ثوبیہ خاموش ہو گئی۔

"بہت جلد۔" اس نے مختصراً کہا اور باہر جھانکنے لگی۔ زیب نے جلد ہی اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ تب ہی وہ اس کی طرف رخ موڑ کر مکمل توجہ سے مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم نے بتایا نہیں، کب ہو رہی ہے اور کس کے ساتھ؟"

"میری خالہ کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی میری طرح ٹیچر ہیں۔" ثوبیہ نے بتایا پھر اس کے کچھ قریب ہو کر بولی۔ "پتا ہے زیب! مجھے وہ بہت پہلے سے اچھے لگتے ہیں۔" اس کے چہرے پر

ہلکی ہلکی سرخی بکھر گئی تھی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ثوبیہ! اگر کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بتانا۔"

زیب نے خلوص دل سے کہا تھا۔ ثوبیہ اسے باقی تفصیل بتانے لگی اور تب ہی چپ ہوئی جب اس کا گاؤں آ گیا اور طارق کو پھر یہ تھوڑا سا فاصلہ بہت اچھا لگتا تھا۔ تب بس وہ دونوں ہوتے تھے۔ طارق اور زیب یا پھر ان کے درمیان تیرتی خاموشی ہوتی اور اس خوب صورت سی خاموشی کو توڑنے کی کوشش اس نے پہلی بار کی تھی۔

"آپ کئی دنوں سے آئیں نہیں؟" اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ زیب نے بتایا نہیں یا نظر انداز کر گئی۔ طارق شرمندہ سا ہو گیا۔ اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ وہ پھر خیالوں میں کھو گئی تھی۔ وہی کھوئی کھوئی اداس آنکھیں اور طارق کا بس نہیں چلتا کہ وہ سارے جہاں کی روشنیاں ان آنکھوں میں بھر دے۔ ویگن رک گئی تھی۔ ایک لمحے کو زیب کا دل بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اس دن کا منظر پھر سے آنکھوں سے سلگ اٹھا تھا۔

"عزت بے عزتی خدا کے ہاتھ میں ہے زیب! ہمت کرو' ہونی کو کون ٹال سکتا ہے ماسوائے اس رب العزت کے۔"

چائے والا کھوکھا بند تھا اور بابا جی بھی نہیں تھے۔ وہ تنہا خوفزدہ سی چل دی۔ مگر جلد ہی احساس ہوا وہ تنہا نہیں ہے۔ زیب ٹھٹک کر رکی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر پلٹ کر سڑک کی طرف۔

"ویگن اسلم لے گیا ہے۔" طارق نے گویا وضاحت کی۔ "میں آپ کو اسکول تک چھوڑ آتا ہوں۔" زیب نے خاموشی سے قدم بڑھا دیئے۔

"میں یہاں بابا جی کے پاس چائے پینے اکثر آتا ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مجھے بہت غصہ آیا تھا خود پر۔ اس دن میں نے بیا کی باتوں کو مذاق میں ٹال دیا۔ مجھے آپ کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔ اس شخص کی ہمت بھی کیسے ہوئی' آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے کی۔ مگر غلطی میری تھی مجھے احساس ہونا چاہئے تھا۔"

زیب کے قدم رک گئے تو اس نے فوراً وضاحت کی۔

"آخر آپ بیا کی سہیلی ہیں۔"

اس دھندلی سی صبح میں زیب نے طارق کو دیکھا تھا اور بہت غور سے دیکھا۔ اونچا لمبا سانولی رنگت والا عام سا نوجوان تھا مگر زیب کو خاص لگا۔

"تم بہت اچھے ہو طارق۔" زیب نے پھر سے قدم بڑھائے اور طارق جیسے ہواؤں میں پرواز کر گیا تھا۔

"تو اتنے دنوں سے آئی نہیں کڑیئے۔" بتو اس کے پاس آ کر پوچھنے لگی۔ اسکول بھی سامنے تھا۔

"میں اب چلتا ہوں۔" طارق نے کہا تو زیب نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نہر کا پل عبور کر رہا تھا اور زیب نے سوچا تھا۔

"عورت مرد سے سب سے پہلے کس چیز کی تمنا کرتی ہے؟"

"محبت؟"

"نہیں۔" دل نے فوراً نفی کی تھی۔

"تحفظ کا احساس۔"

"ہاں۔ وہ ساتھ چلے تو تحفظ کا احساس یوں اس کے پورے وجود میں چھا جائے کہ سارے ڈر' سارے خوف کہیں دور جا چھپیں۔ آج کیسا انوکھا سا احساس ملا تھا۔ میں اس کی کچھ بھی نہیں وہ پھر بھی میری پروا کر رہا تھا کیوں؟"

* * *

"تم بہت اچھے ہو طارق۔"

یہ جملہ اس کی نیندوں میں' خوابوں میں' سوتے جاگتے اس سے سرگوشیاں کرتا تھا اور اس کا تخیل اس کو نئے نئے معنی پہناتا رہتا۔ تصور میں کئی بار اس نے زیب کو یہی کہتے سنا تھا اور پھر کوئی بازگشت تھی۔ بار بار یہی کہتی۔

"تم بہت اچھے ہو۔"

اس نے زیر لب دہرا کر اس سے کچھ نئے اور انوکھے معنی اخذ کرنے کی کوشش کی۔

"وہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تم اچھے ہو۔ مگر خود کو یقین دہانی کروانے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔" بیا کی آواز پر اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔ کیسا خوب صورت تصور ٹوٹا تھا اس کی آمد سے۔

"میں مخل ہوئی ہوں۔" وہ شریر سے لہجے میں بولی۔

"تم کب مخل نہیں ہوتیں۔" وہ دونوں بازو سر تلے رکھ کر بولا۔

"ہاں جی طاری صاحب اب ہمیں کہاں دستیاب ہوں گے۔" ثوبیہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔

"پیا دیس تو آپ سدھار رہی ہیں بیا خالہ۔" وسیم نے جاتے جاتے جملہ کسا، وہ بری طرح سرخ ہوگئی۔

"اب کیا ہوا؟" طارق کے چہرے پر مسکراہٹ جاگی۔

"میں تو کچھ اور کہنے لگی تھی۔" اس نے کان کے پیچھے بال اڑستے ہوئے نظریں چرائیں۔

"تو کہونا۔"

"وہ زیب کے گھر لے چلونا مجھے۔"

"کیوں؟" وہ لیٹے سے اٹھ گیا۔

"مجھے اس سے کچھ ڈیزائن لینے ہیں کڑھائی کے۔ اس نے کہا تھا۔ گھر آ کر لے جانا۔"

"کب چلنا ہے؟" اس نے دانستہ سرسری سا لہجہ اختیار کیا۔

"جب بھی تم فارغ ہو۔" ثوبیہ نے بڑے دھیان سے اس کی صورت دیکھی۔

"بلکہ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ ڈیزائن تو میں اسے بتا ہی چکی ہوں۔ تم بازار کی طرف جاتے ہی رہتے ہو۔ وہاں سے گزرتے ہوئے لے آنا۔"

"ٹھیک ہے، کل ہی لے آؤں گا۔"

ثوبیہ نے ہونٹوں پر در آنے والی بے اختیار مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔

"گھر تو معلوم ہے نا اس کا۔"

"ہاں۔" طارق نے آرام سے کہا پھر ثوبیہ کے بے ساختہ ہنسنے پر پہلے ٹپٹایا پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم نے خود ہی تو بتایا تھا ایک دن۔"

* * *

اندر داخل ہوتے ہوئے وہ وحید سے ٹکرا گئی۔ یا شاید وہ اس سے جان بوجھ کر ٹکرایا تھا۔

"تم۔" وہ دروازے کو تھام کر سنبھلی۔

"بیویوں کی طرح چلانے والی عادت نہ گئی تمہاری۔ ویسے کیا حال ہے تمہارا۔" وہ ہنسا۔

زیب اسے ہٹا کر تیزی سے اندر گھسی۔ صحن میں کوئی نہ تھا۔ کمرے میں امی عادل کو لئے ساکت وصامت بیٹھی تھیں۔ اس نے کھینچ کر عادل کو اپنی آغوش میں چھپا لیا اور بے تحاشا چومنے لگی۔ عادل اس سے بے تحاشا پیار سے گھبرا کر چیخ اٹھا تھا۔ امی کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ انہوں نے نرمی سے زیب کے ہاتھ ہٹا کر عادل کو اپنی گود میں لے لیا اور اسے چپ کراتے ہوئے بولی۔

"کیا ہو گیا ہے زیب؟"

"امی! وہ کیوں آیا تھا؟" زیب کہہ نہ سکی کہ وہ ڈر گئی تھی۔ امی نے نظریں چرا لیں۔

"امی! آپ نے دروازہ کیوں کھولا تھا۔"

امی نے سپاٹ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو کیا محلے والوں کے سامنے تماشا بنواتی۔"

"اس طرح تو وہ کبھی بھی دندناتا ہوا چلا آئے گا۔" وہ نچلا ہونٹ کاٹتی ہوئی پریشانی سے گویا ہوئی۔ امی نے بیٹی کی پریشان صورت پر ایک نظر ڈالی۔

"ہم اسے روک نہیں سکتے زیب۔"

"کیوں نہیں روک سکتے۔" وہ دبے دبے لہجے میں چلا اٹھی۔

"وہ عادل کا باپ ہے۔" انہوں نے گویا اسے حقیقت سے روشناس کروایا۔ زیب چپ کی چپ رہ گئی۔

"اس رشتے سے انکار اس نے خود کیا تھا امی۔" زیب کے لہجے میں بے بسی در آئی تھی۔

"جو کچھ بھی ہے۔ حقیقت سے انکار کرنے یا نظریں پھیر لینے سے رشتہ بدل تو نہیں جائے گا۔" انہوں نے رسانیت سے سمجھایا۔ زیب لب بھینچ کر رہ گئی۔

"تو کیا حل ہے اس مسئلے کا۔"

"تم شادی کرلو۔"

امی کے کہنے پر زیب بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"یہ حل ہے؟" اس کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

"ہاں۔" امی کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔ "تم شادی کرلوگی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جیسے پہلے سب ٹھیک ہو گیا تھا۔" زیب کا سوال بہت چبھتا ہوا تھا۔

"زیب! ضروری تو نہیں اس بار بھی۔"

"ٹھیک۔ مگر کس سے کروں میں شادی۔ دوسرے لفظوں میں مجھ سے کون کرے گا شادی؟"

"صفدر۔" امی نے اچانک کہا۔

"اوہ۔" زیب ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"آپ سے بات کی انہوں نے؟"

"ہاں' کئی بار ذکر کیا ہے اس نے۔" امی نے کہا پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگی۔
"زیب! صفدر بہت اچھا لڑکا ہے اور میرا خیال ہے وہ تمہیں چاہتا بھی ہے۔ اسی لئے تو
اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔"
زیب کھڑی ہوگئی۔ چادر اتار کر الماری میں رکھی۔ پھر اپنے کپڑے نکال کر پلٹی۔
"امی! جس دن وہ میرے بجائے میرے بیٹے سے محبت کرنے لگے۔ میں شادی کرلوں
گی۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ وہ عادل کا حال سرسری طور پر بھی دریافت نہیں کرتے ہیں۔ کبھی اسے
گود میں اٹھا کر پیار تک نہیں کیا اور شادی مجھے اپنے لئے نہیں عادل کیلئے کرنی ہے۔"
اس کا لہجہ حتمی تھا۔

* * *

موسم سرما کی چھٹیاں ہوگئی تھیں۔ آنے جانے کی مشقت سے جان چھوٹی۔ وہ جیسے ہلکی پھلکی
ہو کر اپنا وقت عادل کو دینے لگی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وحید اتنے دنوں سے نہیں آیا تھا۔ اگرچہ
دھڑکا تو ہر پل اس دل کو لگا ہی رہتا تھا۔
اس دن وہ چنے کی دال کا حلوہ بنا رہی تھی ہلکی رم جھم نے سردی کی شدت میں اضافہ کردیا
تھا۔ عادل اسے بار بار تنگ کر رہا تھا۔ تب ہی مسرت آگئی۔
"سچی حلوے کی خوشبو کھینچ لائی ہے۔" اس نے منہ بسورتے عادل کو اٹھا لیا۔
"ابھی تیاری ابتدائی مراحل میں ہے۔" زیب نے بیسن بھونتے ہوئے بتایا۔
"جبکہ میں کھانا چھوڑ کر آئی تھی۔" مسرت کو مایوسی ہوئی۔
"اگر تم عادل کو سنبھال لو۔ تو بس آدھا گھنٹہ لگے گا تیاری میں۔"
"چلو ٹھیک ہے۔ میں لے جاتی ہوں اسے مگر حلوہ تیار ہوتے ہی آواز دے لینا۔ مجھے بہت
بھوک لگ رہی ہے۔"
وہ عادل کو لے کر چلی گئی۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ لحاف اوڑھے آرام کر رہی
تھیں۔ زیب سکون سے اپنا کام نبٹانے لگی۔ حلوہ تیار ہوا تو وہ اسے ٹرے میں نکال کر مسرت کو
آواز دینے کے ارادے سے باہر نکلی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔ ہر دستک پر اس کا دل ایک
بار تو ضرور کانپتا تھا۔ بارش کی کن من کن من جاری تھی۔
"کون ہے؟" دروازے کے پاس آکر اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔ جب سے
وحید آیا تھا۔ وہ یونہی دروازہ بند رکھتی تھی۔
"میں ہوں طارق۔"

"طارق۔" زیر لب دہراتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔
"السلام علیکم!" وہ بھیگ رہا تھا۔
"وعلیکم السلام۔ کیا ثوبیہ بھی آئی ہے؟" زیب نے اس کے عقب میں جھانکا۔
"نہیں۔ وہ میں ادھر سے گزر رہا تھا تو ثوبیہ نے کہا تھا کہ۔" وہ یوں بولا جیسے اپنے اکیلے
آنے پر شرمندہ ہو گیا ہو۔
"اندر آؤ نا۔" زیب کو احساس ہوا' وہ سرما کی بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اندر آتے ہوئے لمبی
سیاہ چوٹی طارق کی نگاہوں میں لہرا گئی۔ سکھ چین کے پتے ہوا کی تال پر محو رقص تھے۔ آنگن
میں بارش اور بیسن کی خوشبو باہم گھل مل رہی تھی۔
"میں امی کو بلاتی ہوں۔" دوسرے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا۔ امی غنودگی
میں تھیں۔ زیب نے جگا دیا۔
"امی! ثوبیہ کا بھائی آیا ہے۔ آپ اس کے پاس چل کر بیٹھیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔"
وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
"ثوبیہ ساتھ نہیں آئی۔"
"نہیں' اکیلا ہی ہے۔" وہ جواب دے کر کچن میں آگئی۔ چائے کا پانی رکھ کر وہ پلیٹوں میں
بسکٹ اور چنے کا حلوہ نکالنے لگی۔
"اچھے وقت پر بنایا ہے۔ تھوڑا ثوبیہ کو بھی بھیج دوں گی۔ خود وہ کئی بار میرے لئے چیزیں بنا
کر لا چکی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ چائے بنا کر لائی تو وہ امی کے ساتھ باتوں میں
مصروف تھا۔ زیب کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔
"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" زیب نے چائے اس کی طرف بڑھائی تو وہ کہنے لگا۔
"تکلف کیسا بیٹا! تم پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو۔ پھر حلوہ تو زیب پہلے ہی بنا چکی تھی۔"
"میری بے بے بھی چنے کا حلوہ بہت مزے کا بناتی ہیں۔ بلکہ سردیاں شروع ہوتے ہی حلوہ
وغیرہ بنا لیا کرتی ہیں۔ السی تو ابا جی کیلئے بنتی ہے لیکن ختم ہمیشہ میں اور وسیم کرتے ہیں۔" وہ
مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔ اس کی باتوں میں بڑی سادگی اور بے ساختگی تھی۔
"وسیم کون ہے؟" امی نے معلومات کیلئے پوچھا۔
"بھانجا ہے میرا۔ ایف ایس سی میں ہے پر بڑا شرارتی ہے۔"
"بس بیٹا! گھر کی رونق تو بچوں کے دم سے ہے۔ اب عادل نہیں ہے تو کیسی خاموشی چھائی
ہوئی

اس سے قبل کہ وہ کوئی اور سوال کرتا۔ زیب ثوبیہ کے متعلق پوچھنے لگی۔

''اس نے کچھ ڈیزائن منگوائے ہیں۔''

''ہاں۔ بتایا تھا۔ اس نے مجھے میں نکالتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ہی مسرت
کو اٹھائے اندر آ گئی۔

''پکڑو اپنے صاحبزادے کو۔ اتنا شیطان ہوتا جا رہا ہے۔ پوری دو پیالیاں توڑی
موصوف نے۔'' طارق نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

''یہ زیب کا بیٹا ہے۔'' امی نے بتایا تھا۔

''زیب کا بیٹا۔'' چائے اس کے ہاتھ سے چھلک گئی۔

''کیا ہوا بیٹا! ہاتھ تو نہیں جلا؟''

''نہیں، بس دل جل کر راکھ ہوا ہے۔''

پیالی میز پر رکھ کر وہ بمشکل کھڑا ہوا، زیب مسرت سے کہہ رہی تھی۔

''خبردار جو میرے بیٹے کو شیطان کہا ہو تو۔''

''میں پھر آ جاؤں گا، ایک کام یاد آ گیا ہے۔'' طارق لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا تھا۔
وہ سب ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

''ارے اس کو کیا ہوا؟'' زیب نے حیرانی سے دریافت کیا۔

''پتا نہیں ...... ایک دم سے اٹھ کر چلا گیا۔'' امی کی پر سوچ نگاہیں زیب کے چہرے
ٹکرائیں۔

''ارے وہ تو ڈیزائن بھی لے کر نہیں گیا۔ کمال ہے۔ میں نے سوچا تھا ثوبیہ کو حلوہ
گی۔ ایسا کون سا کام یاد آ گیا تھا۔'' زیب نے کہا۔

''کون تھا؟'' مسرت نے پوچھا۔

''ثوبیہ کا بھائی۔''

* * *

''کچھ ہماری عزت کا ہی خیال کرو۔ تمہارے اس طرح بار بار آنے سے۔'' زیب اوپر
کپڑے لے کر آ رہی تھی۔ امی نے اسے دیکھ کر ہی جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔ وحید کو دیکھ کر زیب
پورے وجود سے گرم لپٹیں اٹھنے لگی تھیں۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کوئی پستول ہاتھ آ جائے اور
کا پورا وجود جہنم رسید کر دے۔

''زیب! میری بات سنو۔'' وحید نے اچانک اسے پکارا تھا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننا۔'' وہ سختی سے کہہ کر اندر کی طرف پلٹی۔

''زیب۔'' امی کے تنبیہی اور سخت لہجے نے اس کے بڑھتے قدموں کو جکڑا تھا۔ وہ لب بھینچتے
ہوئے پلٹی۔ ایک نظر صفدر بھائی اور امی پر ڈال کر اس نے طیش بھری نگاہوں سے وحید کو گھورا۔

''کہو۔''

''میں اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں۔ کم از کم ہفتے میں ایک بار۔'' وحید نے بغیر لگی لپٹی
رکھے دو ٹوک بات کی۔ سب دم بخود رہ گئے۔

''یہ ناممکن ہے۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' زیب قطعی لہجے میں بولی۔
وحید کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ہتھیلی کا دباؤ چار پائی پر ڈال کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''میں تم سے اجازت نہیں مانگ رہا ہوں زیب صاحبہ۔ یہ تو میرا حق ہے۔''

''میں نے مان لیا۔ غلطی ہوئی تھی مجھ سے۔ لیکن میں اپنی اولاد سے یوں الگ نہیں رہ سکتا۔
''

''تم چلے جاؤ یہاں اور آئندہ یہاں کبھی مت آنا۔'' وہ واپس پلٹی۔

''دیکھو زیب! بہتر ہے، تم خود ہی مان جاؤ۔ ورنہ میرے اس حق کو عدالت بھی چیلنج نہیں
کر سکتی۔'' وحید کا لہجہ ٹھوس تھا۔ زیب ایک جھٹکے سے پلٹی۔

''دھمکی دے رہے ہو۔''

''میں۔ حقیقت بتا رہا ہوں۔ میں اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں کم از کم ہفتے میں ایک بار
یہاں یا کہیں اور۔ فیصلہ تم کر لینا۔'' اس نے ذرا رک کر زیب کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل
تلاش کیا پھر کندھے جھٹکتے ہوئے رسانیت سے بولا۔

''میں اسے تم سے چھیننا نہیں چاہتا۔ بہتر ہے تحمل مزاجی سے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو
اور پلیز آپ لوگ بھی اسے سمجھایئے گا۔ غصے اور جلد بازی میں معاملات صرف بگڑتے ہیں اور
اس بات کا خمیازہ ہم دونوں ایک دفعہ بھگت چکے ہیں۔''

اس نے ایک نظر اس کے ساکت وصامت وجود پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

''زیب! بہتر ہے، ٹھنڈے دماغ سے اس پر سوچو۔'' صفدر بھائی نے دھیرے سے کہا۔

''امی! یہ ناممکن ہے۔ میں عادل پر اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔'' وہ دونوں ہاتھ
ان کے گھٹنوں پر رکھ کر نم لہجے میں بولی۔ ''خدا کیلئے امی اس سے کہہ دیں وہ مت آیا کرے
یہاں۔''

"جب تک عادل یہاں ہے وہ تو بار بار آئے گا۔" صفدر بھائی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا' تو میں عادل اس کو دے دوں۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"وہ لے بھی سکتا ہے۔" صفدر بھائی نے اتنے آرام سے کہا کہ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی۔

"میں ماں ہوں اس کی اور اتنا چھوٹا بچہ۔"

"اور وہ باپ ہے۔" انہوں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی پھر رسانیت سے سمجھانے لگے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا زیب! تم اس معاملہ کو کیوں بالکل جذباتی اور غیر ذمہ دارانہ انداز میں ہینڈل کر رہی ہو۔ حقیقت کو فراموش کر دینے سے کیا حقیقت بدل جائے گی۔ تمہیں وہ طلاق دے چکا ہے ٹھیک۔ تمہارے اس کے ساتھ سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ مگر عادل کے ساتھ ہمیشہ اس کا نام لگے گا۔ خواہ تم کچھ بھی کر لو۔ وہ اسی کا بیٹا کہلائے گا۔ آج عادل چھوٹا ہے۔ لیکن کل' کل کیا ہوگا تم بار بار انکار کر کے وحید کو غصہ دلا رہی ہو۔ اس پر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے تمہیں اس معاملے کو بہت نرمی اور احتیاط کے ساتھ نمٹانا ہے۔"

"تو کیا کروں میں؟" اس کے لہجے میں شکست خوردگی اور بے بسی کی کیفیت تھی۔ حقیقت اپنی تمام تر سفاکیوں کے ساتھ اس پر عیاں ہوئی تھی۔

"تم اسے عادل سے ملنے دو۔" صفدر بھائی کا لہجہ حتمی تھا۔ اس کی آنکھوں کے قرینے یک بیک پانیوں میں ڈوب گئے۔

"آپ کو پتا ہے صفدر بھائی! وہ عادل سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔" زیب کی آواز لرز گئی۔

صفدر بھائی نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ اسے خود سے مانوس کرنا چاہتا ہے تاکہ اسے لے جاسکے۔ لیکن اگر وہ اسے لے گیا تو میں مر جاؤں گی۔" وہ امی کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

* * *

"ہیں' تمہیں کب سے سوجھنے لگے یہ کام" ثوبیہ نے حد درجے حیرت سے طارق کو دیکھا۔ جو دائیں دیوار کے ساتھ بنی کیاری میں گوڈی کر رہا تھا۔ عموماً یہ کام فروا آپا کیا کرتی تھیں۔

"یونہی فراغت تھی اس لئے۔" پورے گھر میں خاموشی چھائی تھی۔ محلے میں شادی تھی۔ آپا اور بے بچوں کے ساتھ وہاں گئی تھیں۔ ابا دکان پر اور وسیم ٹیوشن کیلئے گیا تھا۔

"تم شادی پر نہیں گئیں؟"

"نہیں۔ موڈ نہیں بنا اور تم گئے تھے زیب کے گھر؟" ثوبیہ کے اشتیاق سے پوچھنے پر اس کے ہاتھ ایک لمحے کو رکے پھر مصروف ہو گئے۔ وہ کیاری سے سوکھے پتے چن رہا تھا۔

"بھول گیا۔"

"بھول گئے؟" ثوبیہ نے حد درجہ بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ کل ہی چلے جاؤ گے میں نے سوٹ سلنے کو دینے ہیں۔ درزن کو بھی کہہ دیا تھا کہ آکر ڈیزائن لے جائے اور تم گئے ہی نہیں۔"

"نہیں گیا تو تھا مگر بھول گیا۔" طارق کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"تم اس کے گھر گئے اور ڈیزائن لانا بھول گئے یہ کیا بات ہوئی۔" ثوبیہ نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"پیا! تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں کسی سے محبت کرنے لگا ہوں۔" طارق نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بری طرح چونکی۔

"بس یونہی محسوس ہوا تھا مجھے۔"

"اچھا!" وہ نجانے کیا کیاری میں ڈھونڈنے لگا پھر سرسری لہجے میں بولا۔ "تمہیں معلوم تھا وہ کون ہے؟"

ثوبیہ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئی۔

"میرا خیال تھا کہ تم زیب میں انٹرسٹڈ ہو۔" اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

"ٹھیک سمجھا تم نے۔ پتا نہیں محبت تھی یا کیا۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ بہت اپنی اپنی سی مگر۔"

طارق کے لہجے میں شکستگی در آئی۔

"مگر کیا؟" ثوبیہ کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"شاید ایک بات کی خبر تمہیں بھی نہ تھی زیب کے بارے میں۔ ورنہ تم مجھے بتاتیں ضرور۔" وہ بڑے ضبط سے مسکرا رہا تھا۔

"کیا' کیا طارق۔" اس کے لہجے میں استعجاب آمیز استفہام تھا۔

"یہی کہ وہ شادی شدہ ہے۔"

"کیا؟" ثوبیہ چیخ اٹھی۔

"اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔" یہ دوسرا دھاکہ تھا۔ ثوبیہ اس کے پاس بیٹھتی چلی گئی۔ بہت دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔

"اس نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

"تم نے پوچھا نہیں ہوگا۔"

"میں نے سوچا تھا' کوئی مناسب وقت دیکھ کر اس سے بات کروں گی۔ وہ کہیں سے بھی شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں نہیں لگتی تھی اور اس نے کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔"

"وہ کب بولتی تھی۔ سارا رستہ تو تمہاری زبان چلتی تھی۔" اسے حد درجے پریشان دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ثوبیہ اس کا بازو تھام کر رو دی۔

"ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا طارق! تم نے زندگی میں پہلی بار محبت کی تھی۔"

"تم کہو گی تو دوسری بار بھی کرلوں گا۔ مگر رو کیوں رہی ہو پگلی۔" طارق نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"تم ہنس رہے ہو۔" وہ خفگی و حیرانی سے گویا ہوئی۔

"تمہاری بے وقوفی پر ہنس رہا ہوں۔ اس طرح رونے کی کیا بات ہے۔ ضروری تو نہیں جو انسان ہمیں پسند ہو' وہ ہمارے ہی لئے ہو۔" طارق نے اسے دھیرے سے سمجھایا۔

"لیکن ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس نے مجھے کبھی بتایا کیوں نہیں۔" وہ زور دے کر بولی۔

"ہر کسی کو اپنے جیسا سمجھتی ہو۔ کچھ لوگ اپنی زندگی کو کئی پردوں تلے چھپا کر رکھتے ہیں۔ اپنے دکھ' اپنے غم بہت سینت سینت کر رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے بہت قریب رہنے کے باوجود بھی ہم ان کی ذات کے کسی پہلو کو بے نقاب نہیں کر پاتے۔ سمجھو' یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔ چھوڑو تم۔" طارق نے اس دکھ کو اپنے دل میں چھپا لیا کسی مقدس چیز کی طرح "تم تیار رہنا۔ کسی دن لے چلوں گا اس کے گھر' خود ہی لے لینا۔ جو کچھ لینا ہوا۔"

"اب کیا فائدہ۔" ثوبیہ کے ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ بکھری۔ نجانے کب اس نے زیب کو طارق کے حوالے سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

"پگلی! اس نے تو ہمیں مجبور نہیں کیا تھا کہ ہم اس سے محبت یا دوستی کے رشتے استوار کریں۔ جاؤ شاباش اپنا موڈ درست کرو۔" وہ کھرپی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"لیکن طارق! پھر وہ اپنی والدہ کے ساتھ کیوں رہتی ہے۔" اس کے ذہن میں ایک دم خیال آیا تھا۔

"ہوسکتا ہے اس کی والدہ اس کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں نے پوچھا نہیں تھا لیکن اب گیا تو پوچھ کر آؤں گا۔" طارق نے بات کو ہلکا پھلکا رنگ دینے کی کوشش کی۔

* * *

"اب خود ہی بتاؤ یہ کوئی ایسی خوشگوار بات تو نہ تھی۔ جو میں تمہیں یا کسی اور کو بتاتی۔" ثوبیہ نے تاسف و رنجیدگی سے زیب کو دیکھا۔ جو گھٹنوں پر تھوڑی ٹکائے ماچس کی تیلی سے گویا اپنی زندگی کا گوشوارہ ترتیب دے رہی تھی۔

"کچھ لوگ واقعی بدقسمت ہوتے ہیں زیب۔" ثوبیہ کی آواز میں زیب کا دکھ بول رہا تھا۔

"سچ کہا تم نے اپنی قسمت کے اچھا ہونے کا یقین تو مجھے کبھی بھی نہ تھا اب تو۔"

"میں تمہیں نہیں اس شخص کو بدقسمت گردان رہی ہوں جو تمہاری قدر نہ کرسکا۔" ثوبیہ نے تیزی سے بات کاٹی۔ "اس سے زیادہ بدقسمتی کیا ہوگی اس شخص کی جس کی بیوی پڑھی لکھی' باشعور اور باکردار ہو اور وہ اس کی قدر نہ کرسکے۔"

"وحید اور اس کی ماں کا خیال اس سے مختلف تھا۔" زیب تیلی پھینک کر کھڑی ہوگئی۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔ عادل تنگ کر رہا ہوگا۔"

وہ اندر گئے تو عادل بسکٹ کی پوری پلیٹ اپنے قبضے میں کئے بیٹھا تھا۔ ایک طرف امی بیٹھی تھیں۔ عادل طارق کے ساتھ بیٹھا تھا مگر اسے بسکٹ دینے کو تیار نہ تھا۔ امی نجانے کس سوچ میں گم تھیں۔

"عادل بیٹا! بری بات! انکل کو بسکٹ دیں۔" زیب نے ہلکے سے سرزنش کی۔ عادل معصومیت سے مسکرایا اور ایک بسکٹ اٹھا کر طارق کی طرف بڑھا۔ طارق بے ساختہ ہنسا۔ زیب شرمندہ ہو کر عادل کو ڈانٹنے لگی۔

"ڈانٹ کیوں رہی ہیں۔ اتنا چھوٹا سا تو ہے۔" طارق نے عادل کو گود میں اٹھا لیا۔

"بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔"

"اسے بدتمیزی نہیں معصومیت کہتے ہیں۔" طارق نے جتایا۔ ثوبیہ نے دھیان سے دیکھا۔ وہ مگن سا تھا۔ ثوبیہ اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش نہ کرسکی اور زیب سے کڑھائی کے ڈیزائن لینے لگی۔ تب تک طارق عادل کے ساتھ مصروف رہا تھا اور امی کے ذہن میں نجانے کون سی سوچ پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی تھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ اپنے اردگرد کا ماحول فراموش کر بیٹھی تھیں۔ ثوبیہ جلد ہی اٹھ گئی۔

"بارش ہو رہی ہے ثوبیہ! ذرا رک کر چلی جانا۔" ثوبیہ کے سنگ کچھ لمحے اچھے گزر گئے تھے زیب نے اسے روکنا چاہا۔

"دن ہی میں آئے تھے ہم لوگ۔ کوئی مشکل نہیں ہوگی اور ویسے بھی محترمہ! اب تو میں اتنا آؤں گی کہ تم اکتا جاؤ گی۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اچھے لوگوں کی سنگت ہمیشہ خوشی دیتی ہے۔" زیب نے خلوص دل سے کہا۔

ویَن میں بیٹھ کر ثوبیہ نے طارق سے کچھ پوچھنا چاہا۔ پھر خاموشی سے باہر جھانکنے لگی۔ وہ طارق کے روّیے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس سے رہا نہیں گیا۔

"آپ کو پتا چلا طارق بھائی"

"ہاں' زیب کی امی نے بتایا تھا۔"

ثوبیہ خاموش ہوگئی۔ تب طارق نے ذرا سا اس کی طرف دیکھا۔ وہ الجھی ہوئی تھی۔

"بیا! تمہارا کیا خیال ہے۔ زیب میری ذمہ داریوں سے سمجھوتا کرلے گی۔"

طارق نے اتنی اچانک پوچھا تھا۔ ثوبیہ بری طرح اچھلی۔

"طارق۔" ثوبیہ نے تحیر سے پکارا۔

"کیوں؟" طارق مبہم سا مسکرایا۔ "کیا وہ ایک ڈرائیور کی محبت قبول نہیں کرے گی۔"

"تو گویا تم نے فیصلہ کرلیا ہے۔" بہت دیر بعد وہ ایک طویل سانس لے کر سیدھی ہوئی۔

"فیصلہ تو بہت پہلے ہوچکا تھا۔" طارق کے لہجے میں اپنی محبت کا استحقاق بولتا تھا۔ جیسے اب اس کے اور زیب کے درمیان کوئی نہیں آسکتا۔

"ان کا خاندان بھی ہمارے جیسا ہی ہے مگر طارق! عادل بھی تو ہے۔" ثوبیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"عادل۔" خوب صورت سی مسکراہٹ لبوں کی تراش میں جگمگائی۔ "وہ بہت پیارا بچہ ہے۔" اس نے گویا اپنے فیصلے پر مہر لگا دی تھی۔

* * *

وحید کی صورت جو عذاب اس پر مسلط ہوا تھا۔ شاید اس سے بڑا عذاب کوئی نہ تھا۔ جب تک وحید گھر میں عادل کے پاس موجود ہوتا۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر چکراتی رہتی اور جب وہ چلا جاتا تو عادل کو یوں اپنی آغوش میں چھپاتی' جیسے وحید اسے تھوڑا تھوڑا کرکے اس سے چھین رہا ہو۔ غصہ چڑچڑا پن اس کے اعصاب پر سوار رہتا۔ اسی چڑچڑے پن میں صفدر بھائی سے تبھی کئی بار یونہی الجھ گئی تھی۔ جواباً انہوں نے آنا ہی کم کردیا۔ امی بڑے صبر سے نجانے کس وقت کا انتظار کر رہی تھیں ورنہ وحید کی یوں مستقل آمد سے وہ بھی پریشان رہنے لگی تھیں۔ ثوبیہ نے ملازمت سے طویل رخصت لے لی تھی۔ کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور انہوں نے منگنی کے ساتھ اس کے شادی کی تاریخ مقرر کردی تھی۔ ثوبیہ نے اسے اپنی منگنی پر

بلوایا تھا مگر وہ جا ہی نہ سکی۔ اس دن طارق نے اسے ویَن میں بتایا کہ ثوبیہ کی امی بیمار ہیں۔

"آپ آئیں گی ان کی عیادت کو۔ ثوبیہ بھی بہت یاد کرتی ہے آپ کو۔" طارق نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

"میں آؤں گی کسی دن۔" زیب نے کہا تو مگر پھر جا ہی نہ سکی۔ امی کو معلوم ہوا تو انہوں نے خوب ڈانٹا۔

"وہ اتنی بار آئی ہے اور تم اس کی ماں کی عیادت کو بھی نہیں گئیں۔"

ثوبیہ واقعی اس عرصے میں کئی بار آئی تھی۔ ایک دفعہ عین وحید کے ہوتے آئی۔ طارق نے سنا تو دروازے سے پلٹ گیا۔

"میں تمہیں دو گھنٹے بعد لے لوں گا۔"

"ذرا اس ذلیل شخص کی ایک جھلک تو دکھاؤ۔" ثوبیہ نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

"چھوڑو۔" وہ اسے اوپر لے آئی تھی۔

"تم یہ سب کیسے برداشت کر رہی ہو زیب۔" ثوبیہ نے قدرے جھنجھلا کر تحیر آمیز لہجے میں پوچھا تھا۔

"تو کیا کروں؟" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

"برادری کے کچھ بزرگوں کو درمیان میں ڈال کر فیصلہ کرواؤ۔ بھلا کوئی طریقہ ہے۔"

"برادری کیا ہوتی ہے ثوبیہ! ہم نے تو زندگی کو ہمیشہ تنہا ہی برتا ہے۔ رشتے داروں کے ایسے ایسے روپ دیکھے ہیں کہ سوچنے بیٹھیں تو حیرت ہوتی ہے اور پھر سگا ہے بھی کون سوائے ایک خالہ کے۔"

"کمال ہے' ہمارے ہاں تو ایسے معاملات برادری بیٹھ کر طے کرلیتی ہے۔"

"ہاں ہوتے ہیں کچھ تم جیسے خوش قسمت لوگ۔" اس کے لہجے میں احساس محرومی جاگ اٹھا۔

تب ثوبیہ نے بات بدل دی۔

اب اس نے امی سے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلیں مگر انہوں نے انکار کردیا۔ تب وہ حسب منشاء عادل کو ان کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ رکشہ والے نے اسے گلی کے نکڑ پر اتار دیا تھا۔ وہیں کتابوں کی دکان پر بیٹھے بیزار صورت لڑکے سے اس نے ثوبیہ کے گھر کا پتا پوچھا اور جب گھر کے سامنے پہنچی تو سر پیٹ لیا۔ دروازے پر تالا لگا تھا۔

"کاش دونوں گھر میں فون ہوتا تو میں پہلے اطلاع ہی دے دیتی۔"

وہ وہیں شش و پنج میں کھڑی سوچتی رہی۔ واپس چلی جائے یا کسی ہمسائے سے پوچھے
ہوسکتا ہے کہیں آس پاس ہی گئی ہو ثوبیہ۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی۔ جب ساتھ والے گھر کا
دروازہ کھول کر ہاتھ میں کتابیں پکڑے سولہ' سترہ سالہ لڑکا مگن سے انداز میں باہر نکلا۔ پھر اسے
ثوبیہ کے گھر کے عین سامنے کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ زیب بھی ادھر متوجہ ہوگئی۔

"یہ لوگ کہاں گئے ہیں۔"

"بیا خالہ اور چاچی کو لے کر طارق ماموں ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں اور چاچا جی دفتر میں
ہوتے ہیں۔ آپ کو بیا خالہ سے ملنا ہے۔"

"ہاں' میں اس کی۔"

"ارے! آپ ان کی سہیلی زیب ہیں نا۔" وہ ایک دم سے بول اٹھا۔

"ہاں مگر۔"

"دیکھا پہچان لیا نا آپ کو۔ میں نے طارق ماموں سے شرط لگائی تھی کہ آپ کو بنا نام
پوچھے پہچان لوں گا۔ کاش بیا خالہ سے بھی لگا لیتا۔" وہ اپنی پہچان پر مسرور اور بیا سے شرط نہ
لگانے پر غمگین ہوا۔

"طارق......؟"

"یہ ان ہی کا گھر ہے۔ آپ اندر آجائیں۔ بیا خالہ ابھی آجائیں گی۔ انہیں معلوم ہوا کہ
میں نے آپ کو اتنی دیر باہر کھڑا رکھا ہے تو وہ میری گردن اڑا دیں گی۔" تیز تیز معصومیت آمیز
شرارتی لہجے میں بولتا وہ زیب کو طارق جیسا لگا۔

"تم شاید وسیم ہو۔" ذہن میں ایک نام جگمگایا تھا۔

"ارے!" وہ بری طرح حیران ہوا پھر رازدارانہ انداز میں اس کی طرف جھکا۔

"آپ نے بھی کسی کے ساتھ شرط لگائی ہے۔"

"کون سی شرط؟" زیب نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی بنا نام پوچھے مجھے پہچان لینے کی۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" زیب مسکرائی۔

"تو پھر آپ اندر آجائیں نا۔" اس نے ایک طرف پلٹ کر راستہ دیا۔

"گھر میں کون کون ہے؟"

"طارق ماموں اور نانا جی کے سوا سب ہی۔ میرا مطلب ہے امی' بے بے' فروا اور گڑیا۔"
طارق نے تفصیل بتائی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اندر آگئی۔ مشین چلاتی آپا کروشیے سے

رومال بناتی بے بے اور کتابوں پر جھکی فروا اور گڑیا نے پہلے زیب پھر سوالیہ نظروں سے وسیم کو
دیکھا۔

"بیا خالہ کی سہیلی ہیں زیب۔" وسیم نے وہیں سے اعلان کیا۔ آن واحد میں وہاں کھلبلی مچ
گئی۔ آپا نے تخت پر سے کپڑے سمیٹ کر مشین میں ٹھونسے اور پذیرائی کو آگے بڑھیں۔ بے بے
کروشیہ دھاگا چھوڑ چھاڑ لپکیں۔ اس کے سلام کے جواب میں سر پر پیار اور ماتھے پر بوسہ دیتے
ہوئے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ بچیاں الگ اشتیاق سے اس کے قریب آگئیں۔

"اندر سے کرسی لے آؤ نا۔" آپا نے وسیم کو ٹہوکا دیا۔

"نہیں' میں یہیں بیٹھ جاتی ہوں۔" وہ گھبرا کر سلائی مشین کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔ حقیقتاً
ان کی اتنی محبت پا کر وہ پریشان سی ہوگئی تھی۔

"ثوبیہ اکثر تمہارا ذکر کرتی رہتی ہے۔" انہوں نے وسیم کو اشارہ کیا۔

"ماموں بھی تو کہہ رہے تھے۔" گڑیا نجانے کیا گوہر افشانی کرنے جا رہی تھی۔ وسیم اسے
کھینچ کر لے گیا۔ زیب آپا سے باتیں کرنے لگی۔ فروا نے ماں کے اشارے پر چائے بنالی۔ وسیم
بیکری سے کئی چیزیں اٹھا لایا۔ فروا نے سلیقے سے میز پر چائے رکھ کر انہیں اطلاع دی۔ چھوٹی سی
تھی مگر سب کچھ سیکھ چکی تھی۔

"اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" زیب شرمندہ سی ہوگئی تھی۔

"تکلف کیسا۔ ہماری خوشی ہے بیٹی۔" بے بے نے کہا۔

"عادل کو کیوں نہیں لائیں؟" آپا نے پوچھا۔ زیب پریشان سی ہوگئی۔ بے بے امی کے
بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

"یا خدا! میرا غائبانہ تعارف اور اتنی تفصیل کے ساتھ۔"

جب ثوبیہ آئی۔ وہ سب کے درمیان ہراساں سی بیٹھی تھی۔ طارق کی آنکھیں اسے دیکھ کر
جگمگا اٹھی تھیں۔ ثوبیہ کی ہنسی نکل گئی۔ طارق سٹپٹا کر باہر نکل گیا۔ وہ تھوڑی دیر مزید بیٹھی۔ ثوبیہ کی
امی بھی ادھر ہی آگئیں۔ ان کی خیریت دریافت کر کے وہ جلد ہی اٹھ گئی۔ بے بے اسے پچاس
روپے دینے لگیں۔

"لے لو۔ یہ ہمارے ہاں کی روایت ہے۔ مہمان کو وقت رخصت کوئی تحفہ ضرور دیتے ہیں۔
تم بالکل اچانک آئی ہو رکھ لو۔"

اس کے انکار پر ثوبیہ نے کان میں سرگوشی کی۔ مجبوراً اسے رکھنے پڑے۔ سب لوگ اسے
دروازے تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ ان کی ڈھیر ساری محبتوں کے جواب میں گھبرائی ہوئی تھی۔

آج کے دور میں اتنی چاہت اور وہ بھی اجنبی لوگوں سے۔

مگر اجنبی کہاں؟ وہ سب تو یوں ملے جیسے وہ ہمیشہ سے یہاں آتی رہی ہو۔ چھوٹی بچیوں کے چہرے پر بھی وہی اپنائیت تھی۔ وسیم اسے گلی کے سرے تک چھوڑنے آیا۔ رکشہ روکنے اور اس سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر ہی ٹلا تھا۔

* * *

''ماموں کی شادی کب ہوگی؟'' گڑیا پوچھ رہی تھی۔

''میں تو شادی پر لہنگا پہنوں گی۔'' فروا نے کہا۔

''ایک نہیں دو بنوا لینا۔'' وسیم نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''آپ بھی لہنگا پہنو گے بھیا۔'' گڑیا نے اس کی بات کا خاصا غلط مطلب لیا تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

''افوہ! میں تو تم لوگوں کیلئے کہہ رہا تھا۔'' وہ جھنجھلایا۔

آج کل موضوع گفتگو بس طارق کی شادی ہی تھا۔ ثوبیہ نے سب کو بتا دیا تھا۔ اگرچہ طارق اس پر خاصا خفا ہوا تھا۔ ابا جی اور بے بے تو مست ملنگ ٹائپ کے اور اپنے بچوں کی خوشی میں خوش رہنے والے والدین میں سے تھے۔ ابا جی نے تو مطلقہ عورت سے نکاح کو ثواب کا کام کہہ کر رضامندی دے دی تھی۔ ان کو تو بس بیٹے کی خوشی مقدم تھی۔ بے بے شروع شروع میں متامل تھیں۔ روایتی قسم کے اعتراضات بھی کیے۔ مگر وکیل صفائی آپا تھیں۔ یہ کیا کم تھا کہ طارق شادی پر مان گیا تھا۔ سو زیب سے مل کر تو سب ہی راضی ہو گئے تھے۔ اب دیر تھی تو اس کی کہ زیب کے گھر بات کرنے کب جانا ہے۔

* * *

بظاہر وہ سبزی بنا رہی تھی مگر اس کی تمام تر توجہ کمرے کی طرف تھی۔ کبھی کبھی یونہی سوچتے سوچتے اس کی گرفت یوں چھری پر مضبوط ہوتی کہ وہ خود سے خوفزدہ ہو جاتی۔ تب احساس بے بسی سے مغلوب ہو کر اس نے چھری چھوڑی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وحید عادل کو اٹھائے نکلا تھا اور اس کا رخ باہر کی سمت تھا۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں لپک کر سامنے آئی۔

''کہاں لے کر جا رہے ہو؟''

وہ چاہتی بھی تو اس خوف کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ جو اس کے اندر جڑ پکڑ چکا تھا۔

''شاپنگ کیلئے لے جا رہا ہوں اپنے بیٹے کو۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔

''مجھے ہے۔'' وحید تیکھے لہجے میں بولا۔ ''میں اسے کچھ چیزیں لے کر دینا چاہتا ہوں۔''

''اسے تمہاری چیزوں کی ضرورت نہیں۔'' زیب نے عادل کو اس سے لینا چاہا۔ وحید نے جھٹکے سے ہاتھ ہٹائے۔

''کیا خوف ہے تمہیں۔ میں جتنا تم سے نرمی برت رہا ہوں' تم اتنا ہی میرے لئے مصیبت بنی جا رہی ہو۔'' وہ غرایا تھا۔

''سنو! تم کیوں آتے ہو یہاں؟'' دونوں ہاتھ مسلتے' آنکھوں میں در آئی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے زیب نے اچانک پوچھا۔

''اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہوں' تم سے نہیں۔'' اس نے برجستہ کہا۔

''کیوں؟'' زیب کا لہجہ دھیما ہو گیا۔

''بیٹے کی محبت کھینچ لاتی ہے۔ اماں بھی اس سے ملنے کو بے تاب ہے۔''

''کیا؟'' زیب نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''تم اسے اپنی ماں سے ملانے جا رہے ہو۔''

وحید اس کی رسائی پر ایک لمحے کو گڑبڑایا۔ پھر سنبھل کر غرایا۔

''فضول بکواس مت کرو اور راستہ دو۔ ابھی واپس چھوڑ جاؤں گا۔'' اس نے جھٹکے سے زیب کو ہٹانا چاہا۔ مگر زیب نے بپھر کر اس کے ہاتھوں سے عادل کو جھپٹ لیا۔

''میں عادل کو نہیں لے جانے دوں گی۔'' وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں جا گھسی۔ وحید پیچھے لپکا مگر زیب نے اندر سے کنڈی لگا لی تھی۔ وہ دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔

''ذلیل عورت۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ دروازہ کھولو۔'' وہ دروازے کو ٹھوکروں سے اڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ یوں شور بپا تھا کہ امی مسرت کے گھر سے بھاگی آئی تھیں۔

''کیا ہو گیا وحید! کیا ہوا۔'' اسے دھاڑ دھاڑ دروازہ توڑتے دیکھ کر وہ اسے ہٹانے کو لپکیں۔

''ایک بات یاد رکھنا زیب! اب میں اپنے بیٹے کو لے کر جاؤں گا۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے غیظ و غضب کے عالم میں بولا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔

''تمہاری ماں نے کہا ہوگا۔ زیب اب سکھی رہنے لگی ہے' جاؤ اسے برباد کرو۔ عادل کو لینا چاہتے ہو۔'' اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ ''یہ لو' لے جاؤ اسے۔'' اس نے عادل کو اس کی گود میں پٹخا۔ ''کہہ دینا اپنی ماں سے۔ اس کی تمنا پوری ہوگئی۔ مارنا چاہتی تھی مجھے۔ تباہ و برباد کرنا

چاہتی تھی۔ یہی چاہتی تھی نا کہ میں سکھ سے نہ رہوں۔ لے جاؤ اسے کہنا۔ مرگئی زیب۔ جیتے جی مرگئی۔ جاؤ خوشیاں مناؤ۔ گھی کے چراغ جلاؤ۔ تمہارے سارے ارمان پورے ہوگئے۔ ایک عورت تمہاری دسترس میں آئی اور تم نے اسے توڑ پھوڑ ڈالا۔"

اس کا گویا دماغ الٹ گیا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ اس کا گریبان پکڑے جھنجھوڑ رہی تھی۔ وحید دم بخود سن رہا تھا۔

تب اس نے جھک کر آہستگی سے عادل کو نیچے بٹھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا اور زیب جیسے ایک دم ہوش میں آئی۔ عادل کے چھن جانے کا خوف اسے دیوانگی میں مبتلا کر گیا تھا۔ اس نے جیسے سانس روک کر عادل کو دیکھا۔ پھر تڑپ کر اپنی آغوش میں بھر کر بے تحاشا رونے لگی۔

"اگر وہ تمہیں سچ مچ لے جاتا تو۔"

* * *

بہت بڑا جواء کھیلا تھا زیب نے اس لمحے' کیوں؟ شاید اس لئے کہ اسے یقین سا تھا کہ وحید محض اسے تنگ کرنے کو یہاں آتا تھا۔ بچے کو سنبھالنا نہ اس کے لئے ممکن تھا نہ اس کی ماں کیلئے۔ زیب نے دو برس اس گھر میں گزارے تھے۔ وہ ذمہ داریوں سے گھبرانے والے لوگ تھے۔ یہی وحید تھا جو ملازمت پیشہ بیوی مل جانے پر جاب نہ ہونے کا بہانا کر کے گھر بیٹھ گیا تھا۔

وحید اس دن کے بعد آیا ہی نہیں۔

اسے یقین تھا اگر وہ عادل کو لے جائے گا تو اسے سنبھالے گا کون۔ وحید کی ماں سے تو اس کی توقع ہی فضول تھی۔ زیب کے لہجے میں ہلکا پھلکا سکون تیرنے لگا تھا۔ پھر ایک دن اسے وحید کی طرف سے تحریری طلاق نامہ مل گیا۔ امی نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ بیٹی نے ادھر کی تھی نہ ادھر کی۔ وحید کے ساتھ مصالحت کی گنجائش نہ تھی۔ اب وہ سکون کے ساتھ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتی تھیں۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں تو پھر سے وہی آنے جانے کی مشقت شروع ہوگئی۔ ثوبیہ کی شادی کی شاپنگ شروع ہوگئی تھی۔ وہ جب بھی مارکیٹ جاتی۔ زیب کا گھر نزدیک ہونے کی بنا پر اس سے ملنے چلی آتی۔ آج بھی ثوبیہ آئی ہوئی تھی۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے زیب؟" وہ حسب معمول اس کے پاس کچن میں آبیٹھی۔

"کس بارے میں؟" زیب نے کپ نکالتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں۔"

"پہلے زندگی میری چوائس پر گزری ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"پھر بھی زیب! یوں کیسے گزرے گی۔"

"ثوبیہ! کیا کہنا چاہتی ہو تم۔"

"تم شادی کر لو نا زیب۔"

"کس سے؟" زیب نے اچانک پوچھا۔ ثوبیہ ذرا دیر کو خاموش ہوگئی۔

"کسی سے بھی۔ تمہاری امی ذکر کر رہی تھیں تمہارے کوئی کزن ہیں۔" ثوبیہ نے کریدنا چاہا۔

"ہوں۔" زیب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"زیب!" بہت دیر بعد ثوبیہ نے پکارا۔

"کہو۔" چائے بن گئی تھی وہ تھرمس میں ڈالنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے طارق' طارق تمہیں پسند کرتا ہے۔" ثوبیہ نے جھجکتے ہوئے انکشاف کیا۔

"کیا؟" زیب کے ہاتھ ایک لمحے کو تھمے اسے حیرت نہیں ہوئی۔ بعض لوگ چاہیں بھی تو اپنے جذبے چھپا نہیں پاتے۔

"وہ تمہیں چاہتا ہے زیب! اپنے جذبوں کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کو اس طرح ......"

"آؤ چلیں۔ چائے بن گئی ہے۔" زیب ٹرے اٹھا کر کھڑی ہوئی۔ ثوبیہ چپ کی چپ رہ گئی۔

طارق نے چابیوں کا گچھا عادل کو تھمایا تھا اور وہ اس سے کھیل کر خوش ہو رہا تھا۔ خود طارق امی سے باتوں میں لگا تھا۔ زیب کو آتے دیکھ کر عادل طارق کا کندھا تھام کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ طارق نے بائیں ہاتھ سے سہارا دے کر اسے کھڑا کیا۔

"عادل نے تنگ تو نہیں کیا؟" زیب نے درمیان میں میز پر ٹرے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت تنگ کرتا ہے۔ ایک دم شیطان بچہ ہے۔" طارق نے پیار سے عادل کی ننھی سی ناک کھینچی اس نے خفا ہو کر دونوں بازو زیب کی طرف پھیلا دیئے۔ زیب اسے اٹھا کر امی کے پاس بیٹھ گئی۔

"ضد کر رہا ہے' گاڑی میں سیر کرنی ہے۔" امی نے بتایا۔ ایک دن ثوبیہ اور طارق آئے تو عادل کو بخار تھا اور بار بار رو پڑتا تھا۔ طارق نے اسے وین میں بٹھا کر ہارن وغیرہ بجایا تو وہ خوش ہو گیا تھا تب سے جب بھی طارق آتا۔ عادل یہی ضد کرتا تھا۔ پر اس دن کے بعد سے طارق اسے وین میں لے کر نہیں گیا۔

"عادل کو سیر کرا لاتے طارق۔" اس کے پاس بیٹھی ثوبیہ نے آہستگی سے کہا۔

طارق نے اچٹتی سی نظر زیب پر ڈالی۔ جو عادل کو انڈا کھلانے لگی تھی۔ پھر بغیر کچھ کہے کپ پر جھک گیا۔ ثوبیہ کو غصہ آ گیا پھر وہ جلد ہی اٹھ گئی اور وین میں بیٹھتے ہی طارق پر برس پڑی۔

"کیا تھا جو تم عادل کو گھما لاتے اور زیب کے سامنے کہہ رہے تھے کہ بہت تنگ کرتا ہے' پورا شیطان ہے۔"

"ہاں تو تنگ نہیں کر رہا تھا اتنے تو بال کھینچے تھے اس نے میرے۔" وہ آرام سے بولا۔

"زیب کے پیچھے اتنا پیار کرتے ہو عادل کو اور جب وہ آتی ہے تو ایسی باتیں کرنے لگتے ہو۔"

"تو کیا دکھا دکھا کر پیار کروں۔" وہ معصومیت سے گویا ہوا۔

"تو کیا حرج ہے۔ وہ اتنی ضد کر رہا تھا' تھوڑا گھما لاتے۔" ثوبیہ خفگی سے بولی۔

"محبت دکھاوے کا نہیں محسوس کرنے والا جذبہ ہے اور تم نے دیکھا نہیں عادل کیسے اس خوشبو کو پا گیا ہے۔ میرے جاتے ہی گود میں سوار ہو جاتا ہے اور جہاں تک گھمانے کی بات ہے تو کیا رشتہ ہے میرا ان کے ساتھ۔ لوگ باتیں نہیں بنائیں گے' میں کیوں اسے ساتھ لیے لیے پھرتا ہوں۔"

"تم دنیا کے چکروں میں لگے رہنا اور اس کا وہ کزن۔ بڑے آرام سے شادی رچا بیٹھے گا اس سے۔ زیب بے اعتبار ہے اور عادل اس کی کمزوری۔ جب تک کوئی شخص اسے یہ اعتبار نہیں دلائے گا کہ عادل اسے زیب سے زیادہ عزیز ہے وہ شادی نہیں کرے گی۔"

ثوبیہ نے جھنجھلا کر کہا۔ طارق ایک پل کو خاموش ہو گیا۔

"میرا بس ایک یقین ہے بیا۔ اگر وہ میری قسمت میں ہے تو دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے یہ رشتہ قائم ہو کر رہے گا۔"

* * *

طارق کو تنہا دیکھ کر امی ذرا حیران ہوئیں۔

"آؤ بیٹا۔ ثوبیہ نہیں آئی؟" انہوں نے اسے اندر بلاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں وہ ذرا مصروف تھی۔" طارق کو یوں آنا عجیب سا لگ رہا تھا۔

"کون ہے امی؟" زیب عادل کے کپڑے دھوپ میں پھیلا کر پلٹی۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔" زیب نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے مٹھائی کے ڈبے کو دیکھا اس سے قبل کہ وہ بھی ثوبیہ کے متعلق پوچھتی وہ بول اٹھا۔

"یہ اس نے کارڈ بھجوایا تھا آپ کیلئے۔"

"اچھا کب ہے اس کی شادی؟" زیب نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر کھولا۔

"سولہ کو ہے اور ماں جی! میں نے وین خریدی ہے اپنی ذاتی۔ وہ ثوبیہ کہہ رہی تھی۔ میں مٹھائی دینے آپ کے گھر ضرور جاؤں۔ میں نے تو کہا تھا ساتھ چلی آئے مگر۔" کان کھجاتے ہوئے وہ شرمندہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کا سیدھا سادا انداز امی کے دل کو بھا گیا۔

"بہت مبارک ہو بیٹا! اللہ مزید ترقی دے تم نہ لاتے تو شکایت ہوتی ہمیں۔" انہوں نے پر خلوص لہجے میں کہا۔ پھر زیب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"زیب۔ جاؤ چائے بنا لاؤ۔"

"نہیں ماں جی! میں چلتا ہوں اب۔" وہ بول اٹھا۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے بیٹا! تم اندر چل کر بیٹھو۔"

"نہیں میں یہیں بیٹھ جاتا ہوں عادل کے پاس۔" عادل تخت پر سویا ہوا تھا وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر زیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک کپ چائے بہت ہے۔"

زیب چائے بنانے لگی۔ تخت برآمدے میں کچن کے عین سامنے پڑا تھا۔ زیب غیر ارادی طور پر اسے دیکھنے لگی۔ زیب کی طرف اس کی سائیڈ تھی۔ براؤن شلوار قمیص میں دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے ذرا سے آگے جھکے وہ امی کی بات انہماک سے سن رہا تھا۔ سردی کی شدت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ تب ہی وہ سیاہ بڑا سا سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ سلیقے سے بنے بال۔ اس کے مزاج اور بات کرنے کے انداز میں سادگی اور نفاست پسندی جھلکتی تھی۔

عادل نے کسمسا کر اپنے اوپر دیا کپڑا اتار لیا تھا۔ طارق نے احتیاط سے پھر دے دیا۔ عادل کسمسایا تو وہ اسے دھیرے دھیرے تھپکنے لگا۔ کہیں سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ یہ سب شعوری کوشش سے کر رہا ہے۔ امی کے ساتھ بات کرتے کرتے وہ عادل کی طرف بھی یونہی متوجہ ہو جاتا تھا۔

"جب آپا بیوہ ہوئیں تو بچے بہت چھوٹے تھے۔ میں گھر آتا تو تینوں ہی گود میں سوار ہونے کی کوشش کرتے۔ گڑیا تو اب تک میرے ساتھ سونے کی ضد کرتی ہے اور جب بخار ہو جائے تو ناممکن ہے کہ میری گود سے اتر جائے۔ ثوبیہ گھر میں عادل کا اکثر ذکر کرتی رہتی ہے۔ گڑیا نے گھر میں خود سے چھوٹا بچہ نہیں دیکھا۔ بہت شوق ہے اسے عادل سے ملنے کا۔"

"تو بیٹا! کسی دن لے کر آؤ نا شب کو۔" امی نے خلوص دل سے کہا۔

"میں تو چاہتا ہوں انہیں لانا مگر۔" زیب کو آتے دیکھ کر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
زیب نے میز اس کے سامنے گھسیٹ کر چائے رکھ دی۔

"آپ نے مجھے مبارکباد ہی نہیں دی۔" کپ تھامتے ہوئے وہ بلا ارادہ ہی شکوہ کر گیا۔

"سوری۔ دھیان نہیں رہا۔ مبارک ہو۔" زیب نے خجل سا ہو کر کہا۔ چائے پی کر اس نے سوئے ہوئے عادل کو پیار کیا۔ پھر امی سے اجازت لینے لگا۔ تب ہی صفدر بھائی آ گئے۔ طارق کو دیکھ وہ ٹھٹکے۔

اتنی اجنبی صورت اور اتنی بے تکلفی کے ساتھ وہ گھر میں موجود تھا۔

"یہ میرا بھانجا ہے صفدر۔" امی نے تعارف کروایا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" طارق نے سادہ سے لہجے میں کہہ کر ہاتھ ملایا پھر ان سے اجازت لے کر چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟" صفدر بھائی نے چائے کے ساتھ رکھے لوازمات پر نظر ڈالی۔

"زیب کی سہیلی ثوبیہ کا بھائی تھا۔ اس کو شادی کا کارڈ دینے آیا تھا۔" امی نے وضاحت کی۔ صفدر بھائی کی پیشانی پہ نہ جانے کیوں شکنوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔

* * *

"خالہ جان! آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔" صفدر نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔
امی کے پالک کاٹتے ہاتھ ایک لمحے کو رکے صفدر کا لہجہ خلاف معمول تھا۔

"کہو بیٹا۔"

زیب اسکول گئی ہوئی تھی۔ عادل نیچے اپنے کھلونے بکھرائے کھیل محو تھا۔

"خالہ جان! میں میں زیب سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا۔" چھری پالک کاٹنا بھول گئی۔ انہوں نے چھری چھوڑ کر پالک کے پتے چننے شروع کئے۔ صفدر کی بات ان کے لئے خلاف توقع نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ صفدر زیب کو پسند کرتا ہے۔ اگر پہلے اس کا کاروبار سیٹ ہو جاتا تو وہ زیب کی شادی کسی غیر خاندان میں کرنے کے بجائے صفدر ہی سے کرنے کو ترجیح دیتیں۔ مگر کیا کیا جاتا کہ تب صفدر بالکل بے کار تھا۔

امی کی نظریں بھٹک کر عادل پر جا رکیں۔ معصوم بچہ اپنی سسکتے ماضی اور بے یقین مستقبل سے بے نیاز حال میں مست تھا۔ اس کی دنیا اس کے کھیل کھلونوں میں بکھری تھی۔ صفدر نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

"عادل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ آپ کے پاس بھی رہ سکتا ہے۔"

"میرے پاس؟" وہ بری طرح چونکیں۔

"آپ کی تنہائی کے خیال سے کہہ رہا ہوں ورنہ کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں رہے یا وہاں۔" انہوں نے وضاحت کی۔ امی کی آنکھوں میں سوچ کر پرچھائیاں لہرائیں۔

"تم نے آپا سے بات کی؟" ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان کی بہن کس مزاج کی حامل ہے۔

"ابھی تو نہیں کی۔ میں نے سوچا پہلے آپ سے بات کر لوں۔"

"پہلے ماں سے بات کر لو بیٹا! میں زیب سے پوچھوں گی۔" انہوں نے رسانیت سے کہا۔

"زیب سے پوچھنا خالہ جان۔" صفدر چونکے۔ امی کے ہونٹوں پر مغموم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اب وہ صرف میری بیٹی نہیں صفدر میاں! ماں بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے خالہ جان! آپ بات کر لیں زیب سے۔ میں عادل کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہوں۔"

زیب کی طرف سے انہیں پورا یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکتی۔ صفدر کے سوا کون تھا۔ جو زیب کے ساتھ ساتھ عادل کی ذمہ داری بھی اٹھاتا۔ خطرہ تو بس انہیں اپنی ماں کی طرف سے تھا۔
وہ خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ امی کا ذہن سوچ کی کسی گہری کھائی میں جا گرا۔ آنگن میں چھائی خاموشی کچھ اور خاموش ہو گئی۔ عادل نے اس گہری چپ سے گھبرا کر سر اٹھایا پھر ان کا گھٹنا ہلانے لگا۔

"امی...... امی"

انہوں نے اٹھا کر عادل کو گود میں بٹھا لیا۔

"ہاں عادل کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ تو میرے پاس بھی رہ سکتا ہے۔" انہوں نے جیسے خود سے سرگوشی کی عادل اپنا نام سن کر مسکرانے لگا تھا۔

* * *

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے صفدر۔" صفدر کی امی تو یہ سنتے ہی بھڑک اٹھیں۔

"آپ کو میرے دماغ پر کیوں شک ہوا امی جان۔" وہ اطمینان سے بولے۔

"ایک مطلقہ اور بچے کی ماں۔ یہ ہے تمہارا انتخاب۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولیں۔

"آپ کی بھانجی بھی تو ہے۔" صفدر نے یاد دہانی کرائی۔

"بھانجی ہے تو کیا ہوا خاندان کی باقی کنواری لڑکیاں مرگئی ہیں۔" وہ تنک کر بولیں۔

"امی! وہ مجھے پسند بھی تو ہے۔" اب کے وہ نظریں چرا گئے تھے۔

"جانتی تھی میں۔ ایک نہ ایک دن تمہارے دماغ میں یہ کیڑا ضرور کلبلائے گا۔ تب ہی تو بھاگ بھاگ کر ان کی خبر گیری کی جاتی تھی۔"

"آپ جانتی ہیں۔ زیب مجھے شروع سے پسند تھی۔"

"جانتی ہوں اور تب مجھے کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔" وہ ذرا ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔ "اب مشکل ہے۔"

"ناممکن تو نہیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولے۔

"اب تم میرا جملہ نہ پکڑو۔ سچ پوچھو تو میری بھی مرضی تھی زیب کیلئے۔ پر میری بہن کو جلدی تھی۔ تمہاری نوکری کا بھی انتظار نہ کیا۔ اب بھگت رہی ہیں۔"

"اس بات کو چھوڑیں۔ زیب تو اچھی لڑکی ہے نا۔"

"اتنی ہی اچھی تھی تو نبھاتی وہاں۔ کاہے کو طلاق لے کر بھاگی وہاں سے۔"

صفدر جھنجھلا گئے۔

"اب گڑے مردے کیوں اکھاڑ رہی ہیں۔ سب جانتی ہیں۔ اس کی ساس کیسی عورت تھی۔ زیب کو بسانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اوپر سے وحید بھی تھالی کا بینگن تھا۔ زیب کب تک اس جہنم میں رہتی۔"

"اب تم بلاوجہ اس کی سائیڈ مت لو۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے جو ایسی لڑکی بیاہ لاؤں بھلے وہ میرے بھانجی کیوں نہ ہو۔ ایک تو مطلقہ اوپر سے ایک بچے کی ماں اور دینے کو ایک دھیلا بھی نہیں۔"

"خیر اب ایسی خالی ہاتھ بھی نہیں آئے گی۔" صفدر مبہم سا مسکرائے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ چونکیں۔ "کیا ماں نے خزانے جمع کر لئے ہیں۔ مطلقہ بیٹی کو بیاہنے کے لئے۔"

وہ بات کرتے ہوئے بھول گئیں کہ کسی غیر کی نہیں اپنی سگی بھانجی اور بہن کی بات کر رہی ہیں۔

"وہ مکان بھول گئیں آپ' خالہ کے کس کام کا آخر زیب کے نام ہی لگے گا۔"

"میں نے مکان کو چاٹنا ہے۔؟"

"ایک تو آپ سمجھتی نہیں ہیں۔ اس تین کمروں کے گھر میں آپ چار بہوئیں لا کر کہاں رکھیں گی۔ آخر تنویر' زبیر اور احد کی بھی شادیاں کرنی ہیں کہ نہیں اور آج کے دور میں دو کمروں کا

مکان بنانا بھی کوئی اتنا آسان کام نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ سارے ارمان تو باقی تین بیٹوں کی شادی میں بھی نکل سکتے تھے۔

"مگر کیا؟" انہوں نے بھنویں اچکائیں۔

"ایک شرط ہے میری۔"

"کیسی شرط؟" وہ بری طرح چونکے۔

"عادل وہیں رہے گا اپنی نانی کے پاس۔" انہوں نے آرام سے شرط بتائی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے زیب کیسے مانے گی یہ بات۔"

"مانے یا نہ مانے۔ یہ میرا مسئلہ نہیں تمہیں شادی کرنا ہے تو منا لو اسے۔ میں کسی کی اولاد نہیں پال سکتی۔"

"تو آپ کو کون پالنے کو کہہ رہا ہے۔"

"وہ اس گھر میں رہے میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

انہوں نے حتمی لہجے میں کہہ کر بات ختم کر دی۔

* * *

ایک پلنگ پر امی تھیں۔ دوسرے پر زیب عادل کو سلا رہی تھی۔ جب امی نے بات کی۔ وہ متحیر سی انہیں دیکھے گئی۔ عادل کے بالوں میں رینگتی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔

"کیا کہہ رہی ہیں امی؟"

امی نے نظریں چرا لیں۔

ماں بیٹی سے بات کرتے ہوئے نظریں چرا لے تو اس کا مطلب ہوتا ہے بات وہ نہیں جو ماں نے کہی اس کے پیچھے مفہوم کچھ اور ہے۔ حقائق دوسرے ہیں۔ عادل سو گیا تھا' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بتائیں نا امی۔؟"

"کیا بتاؤں۔" ان کا لہجہ بھیگ گیا۔ "کبھی نہیں سوچا تھا کہ یوں بیٹی کے دکھ دیکھنے پڑیں گے۔ اب تو بس یہی خواہش ہے بیٹا اپنی زندگی میں تمہیں محفوظ ہاتھوں میں دے جاؤں۔"

"امی!" زیب نے تاسف سے انہیں دیکھا۔ "ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ۔"

"تمہارے باپ کے بغیر جس طرح میں نے زندگی گزاری ہے بس میں ہی جانتی ہوں۔ یوں سمجھو کانٹوں بھرا راستہ تھا اور ننگے پاؤں چلنا تھا۔" ان کے لہجے میں بیتے دنوں کی تھکن تھی۔

"میں تو بیٹی تھی امی اور عادل۔" زیب نے ممتا بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ "چند برسوں کی بات ہے۔ عادل بڑا ہو جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اور یہ چند برس...... یہ چند برس صدیوں پر محیط ہو جائیں گے بیٹی۔ انسان تنہا ہو تو تھوڑا راستہ بھی لمبا ہو جاتا ہے۔"

"تنہا کیوں۔ آپ بھی تو ہیں۔"

"حقیقت سے نظریں مت چراؤ زیب! میں چاہتی ہوں ب تمہاری شادی کر دوں۔" ان کا لہجہ ذرا سخت ہوا۔

"تو آپ کے خیال میں یوں میری شادی ہو سکتی ہے۔" وہ استہزائیہ لہجے میں ہنسی۔ "سچ سچ بتائیں امی! یہ آپ سے خالہ جان نے کہا تھا نا۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو۔ یہ تو میں اپنی تنہائی کے خیال سے کہہ رہی ہوں۔ عادل میرے پاس ہوتا ہے تو نہ تنہائی کا احساس ستاتا ہے اور نہ دن گزرنے کا پتا چلتا ہے۔ سارا دن تو اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں گزر جاتا ہے اور پھر تم کون سا دور جاؤ گی۔"

"آپ نے میرا تو سوچا ہی نہیں امی میں کیسے رہوں گی اس کے بغیر۔"

"خدا تمہیں اور دے گا۔" امی نے رسان سے کہا

"دس بھی آجائیں تو کیا وہ عادل کی جگہ لے لیں گے۔" زیب نے جھک کر عادل کے سر پر بوسہ دیا۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ امی کا دل بھر آیا۔

"یوں بھی تو سارا دن میرے پاس ہی رہتا ہے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں۔ مگر جب واپس آتی ہوں تو بس ایک نظر اس کی صورت پر ڈالتے ہی ساری تھکن اڑنچھو ہو جاتی ہے۔ نہیں امی یہ ناممکن ہے۔" آخر میں اس کا لہجہ قطعی و حتمی تھا۔

"زیب! ضد مت کرو۔" ان کے لہجے میں بے بسی در آئی۔ "کون پوچھتا ہے طلاق یافتہ عورت کو اس معاشرے میں۔ خدا کا شکر کرو۔ کوئی ہاتھ تھامنے والا موجود ہے۔"

"امی! مجھے شادی کی ضرورت نہیں۔"

"بے وقوف ہو تم۔ خوامخواہ ضد کر رہی ہو۔" وہ بری طرح چڑ گئیں۔ پھر گویا اسے لالچ دیتے ہوئے بولیں۔

"وہ صفدر تم سے محبت بھی تو کرتا ہے۔ تب ہی تو اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔"

زیب پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"شادی تو انہوں نے اس لئے نہیں کی کہ چند ماہ پہلے تک وہ برسر روزگار نہ تھے اب کاروبار

سیٹ ہوا ہے تو انہیں گھر بسانے کی سوجھی۔"

"تو اب اسے کس بات کی کمی ہے جو تمہارے پیچھے خوار ہو۔"

"مجھے پتا نہیں۔"

"اس لئے تو کہتی ہوں۔ خوش قسمت ہو۔ جو بروقت سہارا دینے والا مل رہا ہے۔"

"عادل کو چھوڑ جاؤں' کل کو جوان ہوگا تو کیا سوچے گا۔ ماں نے اپنی خوشیوں کی خاطر اسے دھکا دے دیا۔ چھوڑ کر چلی گئی۔ نہیں امی! یہ ناممکن ہے میں عادل کے بغیر مر جاؤں گی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تو کیا ساری زندگی ایسے ہی گزار دو گی۔ کیوں دکھ دیتی ہو ماں کو زیب۔"

"اگر آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں تو کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ لائیں جو مجھ سے پہلے میرے بیٹے کو قبول کر لے۔ میں اس کے بدلے اس کی ساری ذمہ داریاں نبھانے کو تیار ہوں۔"

زیب کی شرط کڑی تھی۔

"پھر تو ہو چکی تمہاری شادی کہاں سے ڈھونڈوں ایسا شخص۔" امی بری طرح چڑ گئیں۔

"بھلے نہ ہو۔ لیکن عادل کو چھوڑ کر چلی جاؤں یہ ناممکن ہے۔"

زیب اسکول سے گھر آئی تو گھر کو تالا لگا دیکھ کر ماتھا ٹھنکا۔

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ خدا خیر کرے۔ امی کہاں چلی گئیں؟"

وہ سوچتی ہوئی مسرت کے گھر آ گئی۔

"آؤ بیٹی! آ گئیں اسکول سے۔" مسرت کی امی نے استقبال کیا۔

"جی۔ لیکن امی کہاں گئی ہیں؟۔ دروازے کو تالا لگا ہے۔"

"عادل کو بخار ہو گیا تھا۔ الٹیاں کر رہا تھا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہیں۔ یہ لو چابی۔"

انہوں نے تکیے کے نیچے سے چابی نکال کر اسے تھمائی۔ زیب پریشان ہو گئی۔ صبح تک تو عادل بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔

"کون سے ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں؟"

"یہیں محلے میں گئی ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ آج کل تو یوں بھی بخار کی وبا چلی ہے۔" زیب کو پریشان دیکھ کر انہوں نے تسلی دی۔

اور جب تک امی گھر نہیں آئیں۔ اسے نہ تو کپڑے بدلنے کا خیال آیا اور نہ کھانا کھانے کا۔

"کیا ہوا تھا عادل کو؟ ڈاکٹر نے کیا کہا۔" امی واپس آئیں تو اس نے بے تابانہ عادل کو ان کی گود سے لیا۔

"کچھ نہیں۔ وہی موسمی بخار ہے۔ یہ سیرپ دیئے ہیں ڈاکٹر نے۔" امی تھکے تھکے انداز میں کہہ کر چار پائی پر بیٹھ گئیں۔ زیب نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ عادل کا جسم تپ رہا تھا۔

"صبح تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔"

"پریشان کیوں ہو رہی ہو' ٹھیک ہو جائے گا۔" امی نے تسلی دی۔

"تم نے کھانا کھا لیا؟" امی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ عادل کا سن کر تو مجھ سے کھایا ہی نہیں گیا۔"

"اس طرح کرتی ہو' پھر چکر کھا کر نہ گرو تو اور کیا کرو۔" امی نے لتاڑا پھر اس کیلئے کھانا نکالنے گئیں۔

مگر عادل کا بخار کئی دن تک نہ اترا۔ وہ چڑچڑا بھی بہت ہو گیا تھا۔ ہر وقت روتا رہتا زیب کو تو ایک پل کے لئے خود سے جدا نہ ہونے دیتا۔ مجبوراً اسے اسکول سے چھٹیاں لینی پڑیں۔ اگرچہ ان دنوں چھٹیاں ملنی مشکل تھیں کہ بچوں کے سالانہ امتحان نزدیک تھے۔

"امی! اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا لیتی ہوں۔"

تیسرے دن بھی جب اس کا بخار نہ اترا۔ تب زیب نے کہا۔

"ہاں دکھا دو۔ تمہارے اسکول کا بھی خرج ہو رہا ہے۔"

امی نے کہا تب ہی صفدر بھائی آ گئے۔ زیب کو لحاف میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"تم ٹھیک تو ہو......؟"

"میں تو ٹھیک ہوں عادل کا بخار نہیں اتر رہا۔" اس نے پریشانی سے بتایا۔

"آج کل موسم ہی ایسا ہے امی کو بھی بخار ہے کئی دنوں سے۔" انہوں نے بتایا۔

"اب کیسی ہیں خالہ؟"

"اب تو ٹھیک ہیں۔"

"میں سوچ رہی تھی' کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں اسکول سے مزید چھٹیاں کرنا ممکن نہیں اور عادل کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا میرے لئے مشکل ہے۔"

صفدر نے ایک گہری سی نظر اس پر ڈالی۔

"تو تم اسکول چلی جایا کرو نا۔ خالہ ٹھیک ٹھاک دیکھ بھال کر لیتی ہیں عادل کی۔"

"کیسے چلی جاؤں۔ عادل تو ایک پل کو بھی مجھے نہیں چھوڑتا اور اس حالت میں تو امی کے

پاس بھی نہیں جاتا۔"

شب بیداری سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ ستا ستا سا تھا۔

"ٹھیک ہے' ابھی تو میں کسی کام سے جا رہا ہوں۔ شام کو آؤں گا تو پھر لے چلیں گے۔" وہ کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھو بیٹا! چائے پی کر جانا' میں بنا رہی ہوں' امی نے کچن سے پکار کر کہا۔

"نہیں خالہ! میں شام کو آؤں گا۔" پھر زیب کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تم بھی اپنا دھیان رکھا کرو۔ عادل سے زیادہ تو تم بیمار لگ رہی ہو۔"

"عادل ٹھیک ہو گیا تو میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔" اس نے جھک کر عادل کی گرم پیشانی چومی۔ صفدر نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور باہر نکل گئے۔

* * *

"فروا۔ ایک گلاس پانی کا دینا۔" طارق باہر سے آ کر چار پائی پر دراز ہو گیا۔ فروا جو اٹھنے لگی تھی۔ وسیم کا اشارہ پا کر پھر سے بیٹھ گئی۔

"فروا! ایک گلاس پانی دینا۔" طارق سمجھا شاید فروا نے سنا نہیں۔ تب ہی وہ دوبارہ پکار کر کہا۔ وہ قدرے مشکل میں پڑ کر وسیم کو دیکھنے لگی۔ جو زور شور سے نفی میں گردن ہلا رہا تھا۔ اب کے طارق نے گردن اٹھا کر فروا کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا ہے؟" طارق نے اس کے رکے رکے انداز دیکھ کر پوچھا

"ماموں! ہم تو آپ کی بات سن ہی نہیں رہے۔" گڑیا نے اپنے مخصوص معصومانہ انداز میں بتایا۔

"کیوں بھئی۔ کیا کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے۔" طارق نے کروٹ بدل کر رخ ان کی طرف کیا۔

"ہمیں تو وسیم بھائی نے کہا۔ جب تک آپ ہماری بات نہیں مانتے ہم آپ کی بات نہیں مانیں گی۔" گڑیا نے انکشاف کیا۔

"کب؟ میں نے کب کہا تھا۔" وسیم بری طرح گڑبڑا گیا کہ ماموں کے تیور تھوڑے خطرناک لگ رہے تھے۔

"گڑیا ادھر میرے پاس آؤ۔" طارق نے پکارا۔ وہ اچک کر اس کے پاس چار پائی پر بیٹھ گئی۔

"کیا کہا تھا بھائی نے۔"

"بھائی نے کہا تھا کہ ماموں نے نئی ویگن لی ہے نہ وہ ہمیں ہاتھ لگانے دیتے ہیں اور نہ سیر کروانے لے کر گئے ہیں۔" ماموں کے سینے پر سر رکھ کر بٹنوں سے کھیلتے ہوئے گڑیا نے آرام سے کہا۔ طارق نے وسیم کو گھورا تو گڑبڑا کر بولا۔

"ہاتھ لگانے والی بات تو میں نے نہیں کہی۔"

"تو دوسری بات خود نہیں کہہ سکتے تھے۔"

طارق کے خفگی بھرے لہجے پر اس نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا

"ماموں! پھر آپ ہمیں سیر کروانے لے جائیں گے نا۔" گڑیا نے پوچھا۔

"ہاں لے جائیں گے' جاؤ تیار ہو جاؤ۔" طارق نے اس کے بال بکھیرے۔ وہ خوشی خوشی ماں کی طرف بھاگی۔

"امی! میرے کپڑے بدل دیں۔" فروا بھاگ کر پانی لے آئی۔

"سیر کہاں کرنی ہے؟" طارق نے پوچھا۔

"پورے شہر کا ایک چکر لگا کر آئیں گے۔" وسیم نے خوش ہو کر کہا۔

"تم سے کس نے کہا کہ تم بھی جا رہے ہو۔" طارق نے گھورا۔

"جی۔" شدت غم سے وہ بے ہوش ہونے لگا تھا جبکہ گڑیا بول اٹھی۔

"نہیں۔ ماموں! بھیا کو بھی ساتھ لے جائیں۔"

"چلو۔ گڑیا کی سفارش مان لیتے ہیں۔ آپا آپ بھی تیار ہو جائیں۔"

"ارے میں۔" آپا حیران ہوئیں۔

"ہاں امی! آپ بھی چلیں۔" فروا بول اٹھی۔ آپا تیار ہو گئیں۔

موسم سرما کی ٹھنڈی شام تھی۔ بازاروں کی رونق شام کی وجہ سے کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ انہیں کہیں رکنا تو تھا نہیں کہ بچے وین کی سیر کے شوقین تھے۔ بس ایک جگہ گاڑی روک کر برگر خریدے۔ وہ لوگ یونہی برگر کھاتے' تالیاں پیٹتے اور ایک دوسرے کو چھیڑتے انجوائے کرنے لگے۔

"طارق! زیب کے گھر نہ چلیں۔" آپا کو اچانک نجانے کیا سوجھی کہ بول اٹھیں۔ طارق سوچ میں پڑ گیا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اتنے سارے لوگ بنا بتائے چلے جائیں اچھا نہیں لگے گا۔ پھر کسی دن چلی جایئے گا۔ پھر بیا ہی ساتھ ہوتی تو اور بات تھی۔"

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔"

تب ہی طارق کی اڑتی پڑتی نظر فٹ پاتھ تک گئی تھی۔ طارق کا پاؤں بریک پر پڑتے پڑتے رک گیا۔ زیب تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ صفدر بھی تھا۔ عادل کو اٹھائے وہ دونوں سواری کا انتظار کر رہے تھے۔ طارق نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ بچے گا رہے تھے اس کے اندر کہیں سناٹا دوڑ گیا۔ اس سناٹے میں ثوبیہ کی آواز گونج اٹھی۔

"مجھے تو بس اس کے کزن کی طرف سے خطرہ ہے۔"

* * *

"تم بھی کہتی ہو گی۔ میں کیا روز منہ اٹھا کر چلی آتی ہوں۔"

ثوبیہ نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"میں تو ایسا کچھ نہیں کہتی۔ بلکہ تمہارے آنے سے تو میرا وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے۔"

"اوپر چھت پر چلیں۔" ثوبیہ نے فرمائش کی۔

"ہاں اوپر تو خاصی اچھی دھوپ پھیلی ہو گی۔"

"تو پھر اوپر ہی چائے پیتے ہیں۔" ثوبیہ اپنا کپ سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

چھت پر نرم گرم سی دھوپ بکھری تھی۔ زیب نے دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی بچھا دی۔ مگر وہ بیٹھی نہیں یونہی کپ ہاتھ میں لئے اردگرد جھانکتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" زیب نے اسے یوں جھانکتے دیکھ کر پوچھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر پلٹی۔

"سوچ رہی تھی یہ گھر کیا ہوتا ہے۔ چار دیواریں کھڑی کر دو تو مکان بن جاتا ہے اور پھر اس مکان کو گھر بنانے کیلئے انسان کتنے کشٹ اٹھاتا ہے۔ اپنا آپ مٹا دیتا ہے۔"

"اور کبھی اپنا آپ مٹا دینے کے بعد بھی وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ایک گھر بنا سکے۔" زیب بولی تو اس کے لہجے میں اداسی و تلخی گھلی ملی تھی۔

"تمہارے نزدیک گھر کیا ہے؟" ثوبیہ نے پوچھا۔ زیب کی نگاہیں در و دیوار پر پھیلی دھوپ سے الجھنے لگیں۔

"میں کیا جانوں' میں نے تو کبھی مکمل گھر دیکھا ہی نہیں۔ نہ میری ماں بنا سکی اور نہ میں۔"

"تم نے کوشش تو کی ہو گی۔"

"ہاں ریت کی دیواریں دے کر کہا تھا' اسے گھر بناؤ۔"

زیب کے چہرے پر ملال' تلخی اور شکست خوردگی کے تاثرات نمایاں تھے۔

"زیب! تم نے طارق کا گھر دیکھا ہے نا؟"

"ہاں اور مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔ وہ لوگ مجھ سے اس طرح ملے کہ میں یقین نہیں کر پا رہی۔ کسی اجنبی سے اتنی محبت' اتنا پیار کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یوں لگا' جیسے میں بہت پہلے سے وہاں جاتی رہی ہوں۔"

"تم ان کے لئے اجنبی تھیں بھی نہیں۔" ثوبیہ نے آہستگی سے کہا۔

"اچھا۔" زیب سر جھکا کر نجانے کیا سوچنے لگی تھی۔

"زیب!" ثوبیہ نے پکارا تو وہ چونکی اور سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"بے بے آنا چاہتی ہیں تمہارے گھر۔"

"ہاں تو کسی دن لے آؤ نا۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔

"وہ تمہارے سلسلے میں آنا چاہتی ہیں۔ میں نے بتایا تھا نا کہ طارق تم سے۔"

زیب ششدر سی اسے دیکھے گئی۔ طارق اسے پسند کرتا تھا یہ اس کیلئے اتنی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ مگر اس کے گھر والے سب کچھ جانتے ہوئے اسے قبول کریں۔ یہ اس کے نزدیک غیر معمولی بات تھی۔

"میری اور تمہاری دوستی کا ہونا۔ پھر اتنی تیزی سے پروان چڑھنا۔ میرا بار بار تمہارے گھر آنا۔ نارمل ایسے تو نہیں ہوتا نا......"

زیب ایک طویل سانس لے کر سیدھی ہوئی۔ "میں سمجھی تمہارا مزاج ہی ایسا ہے۔"

"نہیں یہ میرا مزاج نہیں۔ میں نے بہت پہلے طارق کی آنکھوں میں تمہارے لئے پسندیدگی کے جذبات دیکھے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا اور نہ طارق۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر ذرا سا ہنسی پھر فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "طارق مجھے بھائیوں کی طرح عزیز ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ' زیب! وہ تم سے محبت کرتا ہے۔" ثوبیہ نے آس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

زیب سر جھکا کر سوچنے لگی۔ چاہتا اور چاہے جانا ایک خوب صورت اور خوش کن احساس سہی۔ مگر اب وہ عمر کے اس دور میں تو نہیں کہ اس سراب کے پیچھے آنکھیں بند کر کے بھاگ پڑے۔

"میں عادل کے بغیر نہیں رہ سکتی ثوبیہ۔"

"خدا نہ کرے کبھی عادل تم سے جدا ہو۔" ثوبیہ بے ساختہ بولی۔

"کیا وہ لوگ۔"

"طارق کہتا ہے جن سے محبت ہو جاتی ہے۔ ان سے وابستہ ہر چیز پیاری لگتی ہے اور عادل تو بہت پیارا بچہ ہے۔"

"ثوبیہ! یہ ممکن ہے کسی غیر کو یوں اپنا بنا لینا کہ وہ غیر نہ رہے رگ جان بن جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ جو میرے اپنے ہیں جن کے ساتھ میرا خون کا رشتہ ہے وہ بھی اس معصوم کو اپنانے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔" وہ الجھن آمیز انداز میں اسے دیکھنے لگی ثوبیہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"جن کے دل محبتوں سے گندھے ہوں ان کے لئے کیا مشکل ہے کسی کو اپنا بنانا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے ثوبیہ! کہیں نادانستگی میں عادل کے ساتھ ظلم نہ ہو جائے۔" وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بے بسی سے بولی۔

"عادل تو یوں ان لوگوں میں رچ بس جائے گا کہ۔" ثوبیہ نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی۔

"نہیں میرے لفظ اتنے معتبر نہیں کہ تمہارے بے یقین دل کو اعتبار دلا سکیں۔ وقت یہ کام خود کرے گا اور میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ بس اتنا کہوں گی کہ جب بھی تم نے اعتبار کیا بس اتنا کہہ دینا کہ بے بے کو لے آؤ۔ وہ لے آئے گا۔ مگر تمہارے علاوہ کوئی اور ہو۔ یہ اس کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔" ثوبیہ کھڑی ہوگئی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" زیب چونکی۔

"بھئی تمہارا دل تو نجانے کب اعتبار کرے۔ اب میں یہاں بیٹھ کر تو انتظار کرنے سے رہی۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولی۔

"ایک بات اور اگلے ہفتے کو میں اپنا عروسی جوڑا پسند کرنے مارکیٹ جاؤں گی۔ آپا بھی ساتھ ہوں گی۔ پلیز تم بھی ساتھ چلنا۔"

"میں کیا کروں گی؟"

"مشورہ تو دو گی نا۔ اب یہاں نہ تو میری کوئی کزن ہے اور نہ ہی سہیلی اور رہ گئیں آپا جی۔" وہ نفی میں گردن ہلانے لگی۔ "اپنے ساتھ ساتھ مجھے ان کی پسند پر بھی کوئی بھروسا نہیں۔"

"اچھا میری پسند پر ہے۔ جناب میری چوائس بھی کوئی اتنی اچھی نہیں ہے۔" زیب ہنس دی۔

"ہاں۔ وحید کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے۔" ثوبیہ کے منہ سے اچانک نکل گیا۔ زیب کے ہنستے لب بھنچ گئے۔

"اس کا نام مت لیا کرو۔ یوں بھی وہ میری چوائس نہیں تھا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"اچھا بابا! نہیں لوں گی۔ مجھے بھی کوئی خاص شوق نہیں' اس مردود کا نام لینے کا۔ پلیز تم تیار رہنا۔"

اور وہ جاتے جاتے امی کو کہہ گئی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ایسے موقعوں پر تو سہیلیوں کے مشورے ہی کام آتے ہیں۔" اُ(نہوں)
نے خوشدلی سے کہا تھا لیکن جب ہفتہ آیا تو زیب کے ذہن سے نکل گیا۔ دھوپ بھی خوب نکلی
تھی۔ اس نے واشنگ مشین لگائی۔ پانی گرم کر کے دھوپ میں رکھا اور عادل کو نہلانے لگی۔
گرمیوں میں تو وہ سارا دن پانی میں گھسا رہتا تھا۔ سردیوں میں اسے نہلانا کار دشوار تھا۔ اس
وقت بھی اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

ثوبیہ آئی تو سر پیٹ کر رہ گئی۔

"تم ابھی تک اس حلیے میں گھوم رہی ہو۔"

ساتھ میں طارق اور آپا بھی تھیں۔ زیب اپنے ملگجے سے حلیے پر شرمندہ ہو گئی۔ آپا اور طارق
کو امی ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

"بس دس منٹ لگیں گے۔ جب تک تم لوگ چائے پیو، میں تیار ہو جاؤں گی۔" وہ عادل کو
اٹھا کر اندر لے گئی۔ اسے کپڑے پہنا کر لحاف میں چھپانا چاہا تو وہ تنہا لیٹنے پر کسی صورت آمادہ نہ
ہوا زیب اسے امی کے پاس چھوڑنے گئی تو طارق نے پکار لیا۔

"آؤ بھئی ماسٹر ہمارے پاس۔"

عادل نے فوراً اس کی طرف بازو پھیلا دیئے۔

"بیٹھو نا زیب۔" آپا نے اپنے قریب جگہ بنائی۔

"اس کو تیار ہونے دیں آپا! دیر ہو جائے گی۔" ثوبیہ نے کہا۔ زیب نے عادل کو گود میں دیا
اور طارق کے پاس عادل کو بہلانے کا آسان سا طریقہ تھا۔ تب ہی اس نے چابیاں نکال کر
عادل کو تھما دیں۔

زیب نے ایک چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا اور دوسرے پر انڈے ابلنے کو رکھے۔

"اس تکلف میں تم نہ ہی پڑتیں تو اچھا تھا۔" ثوبیہ نے روکنا چاہا۔

"آپا پہلی بار آئی ہیں ہمارے گھر۔ تم ذرا ان کا دھیان رکھنا۔ میں کپڑے بدل کر آتی
ہوں۔"

"بال بھی بنا لینا۔ میں دیکھتی ہوں ان کو۔"

زیب تیار ہو کر آئی تو چائے بن گئی تھی۔ ثوبیہ پلیٹ میں انڈے نکال رہی تھی۔ زیب نے
الماری کھول کر بسکٹ نکالے۔

وہ چائے لے کر اندر آئی تو طارق عادل کے ساتھ مگن تھا۔ آپا اور امی محو گفتگو تھیں۔ زیب (کو)

آتے دیکھ کر وہ دونوں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے موضوع گفتگو
زیب ہو۔ زیب باہر نکل آئی۔

بال بنا کر واپس آئی تو وہ لوگ چائے کے آخری گھونٹ بھر رہے تھے۔

"امی! عادل کو ابھی نہلایا ہے میں نے۔ اس کو باہر مت نکالئے گا۔"

"عادل کو گھر چھوڑ کر جا رہی ہو؟" آپا نے پوچھا۔

"جی یہ امی کے پاس آرام سے رہ لے گا۔"

"لے چلو۔ منے کو بھی سیر ہو جائے گی۔" ثوبیہ نے کہا تو زیب نے انکار کر دیا۔

"بہت تنگ کرے گا۔"

"تنگ کیسے کرے گا۔ میں جو ہوں گا ساتھ۔" طارق اچانک بول اٹھا۔

"تو اور کیا۔ طارق کو بہت تجربہ ہے بچے بہلانے کا۔" ثوبیہ نے چھیڑا تو وہ جھینپنے کے
بجائے آرام سے بولا۔

"ہاں نا آپا جب کام کرتی تھیں تو فرزوا اور گڑیا کو کون بہلاتا تھا۔ بس ٹھیک ہے۔ چلو ماسٹر!
اسی بہانے وین کی سیر ہو جائے گی۔" طارق نے عادل کو اچھال کر کیچ کیا۔ مجبوراً زیب عادل کی
ٹوپی اور جرسی لے آئی۔

ثوبیہ کو اور بھی بہت کچھ لینا تھا۔ میک اپ کا سامان، آرٹیفشل جیولری۔ جوتے وغیرہ زیب
حتی الامکان اسے اپنے مشوروں سے نوازتی رہی۔ عادل زیب کو تنگ کرنے لگا تھا۔

"میں عادل کو باہر لے جاتا ہوں۔ مگر تم ذرا جلدی کرنا شام ہو رہی ہے۔" طارق دو قدم
آگے آیا اور زیب سے عادل کو لے لیا اور دکان سے باہر نکل گیا۔ زیب قدرے سہولت سے لباس
دیکھنے لگی۔ ثوبیہ کو کچھ پسند ہی نہ آ رہا تھا۔ جو اس کو پسند آتا وہ آپا کو بالکل فضول لگتا۔ خدا خدا
کر کے ایک شرارہ سوٹ پسند آیا تو اس کی قیمت بہت زیادہ تھی آپا اور ثوبیہ بھاؤ تاؤ کرنے لگیں۔
زیب قدرے بیزار سی ہو کر باہر نکل آئی۔

"میں عادل کو دیکھتی ہوں۔"

طارق عادل کو لئے فٹ پاتھ پر ٹہل رہا تھا۔ عادل چھوٹا سا باجا ہاتھ میں لئے پوں پوں
بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب آ جاؤ عادل، بہت تنگ کر لیا انکل کو۔" زیب نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ وہ
زیب کے پاس آنے کے بجائے مزید طارق سے لپٹ گیا۔ تب ہی سڑک کے دوسری سمت عین
سامنے والی دکان سے باہر نکلتے وحید اور اس کی ماں کی نظر ادھر پڑی تھی۔ حسد کے ناگ پھن پھیلا

کر کھڑے ہو گئے اور ان کے وجود کو ڈسنے لگے۔

منظر بہت مکمل اور بھرپور تھا۔

زیب عادل کو لینے پر مصر تھی اور عادل دونوں بازو اس کے گلے میں ڈالے اس شخص سے لپٹا جا رہا تھا اور وہ گندمی رنگت والا اونچا لمبا نوجوان محظوظ سے انداز میں مسکرا رہا تھا' عادل کو چوم رہا تھا۔

وحید اور اس کی ماں کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔

* * *

زیب نے سوچا تھا۔ وہ مایوں پر نہیں جائے گی۔ مگر ثوبیہ نے بہت تاکید کی تھی۔

"ثوبیہ! فنکشن تو رات کا ہو گا نا۔" زیب نے ٹالنا چاہا۔

"بالکل نہیں شام کو ہو گا اور تمہیں آنا ہو گا۔" ثوبیہ نے حتمی لہجے میں کہہ کر بات ختم کر دی۔

"چلی جانا زیب! کوئی اتنے خلوص سے بلائے تو نخرے نہیں کرتے۔" امی نے بھی کہا تو وہ مجبور ہو گئی۔

"تو ٹھیک ہے آپ بھی ساتھ چلیں۔" اس نے ضد کی۔

"مہندی پر جاؤں گی تمہارے ساتھ۔ مایوں پر تم ہو آؤ۔"

حسب معمول انہوں نے عادل کو اپنے پاس روک لیا تھا۔

"زیادہ دیر ہوئی تو میں پہلے ہی چلی آؤں گی۔" زیب نے تیار ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے تو کہا کہ واپسی کیلئے صفدر بھائی سے کہہ دیتی ہوں مگر انہوں نے نجانے کیا سوچ کر روک دیا۔

"بس شام گہری ہونے سے قبل آ جانا۔ پھر ان کا گھر زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

زیب جب وہاں پہنچی تو سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ مہمان کچھ زیادہ نہیں تھے۔ بس محلے کی خواتین۔ بے بے تو اسے ساتھ لگا کر پیار کرنے کے بعد باقاعدہ خفا ہو گئی تھیں کہ وہ امی اور عادل کو کیوں نہیں لے کر آئی۔ بمشکل انہیں مطمئن کر کے وہ ثوبیہ کے پاس آئی۔ جو پیلے جوڑے میں ملبوس بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"مجھے ڈر تھا کہ تم نہیں آؤ گی۔ مگر یہ خالہ جان اور ننھا شہزادہ کہاں ہیں۔؟" وہ چھوٹتے ہی پوچھنے لگی۔

"میں آ گئی ہوں یہ کافی ہے۔" زیب اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولی پھر اس کا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "ماشاء اللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

"خاک پیاری لگ رہی ہیں ایک دم ہلدی ہلدی ہو رہی ہیں' چہرہ یوں پیلا پڑا ہے جیسے

پری ماموں کا غصہ دیکھ لیا ہو۔" وسیم تیز تیز کہتا ہوا اندر آیا پھر زیب پر نظر پڑی تو اچھل کر قریب آیا۔

"آہا! آپ آ گئیں؟ نکالیں بیا خالہ! میری شرط کے پیسے۔" اس نے جھٹ ثوبیہ کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ ثوبیہ نے اسے بری طرح گھورا۔

"تم ہمیشہ شرط لگاتے ہو۔" زیب نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"جی اور ہمیشہ جیتتا ہوں بس کبھی پیسے ملے نہیں۔" وہ حد درجہ مایوسی سے بولا۔

"کیوں بھئی؟"

"کنجوس مہا کنجوس ہیں یہ لوگ۔" وہ چڑ کر بولا۔

"بکواس مت کرو۔ جاؤ آپا سے کہو' چائے بھجوا دیں۔"

"ارے بھئی کہاں ہے زیب۔ میں نے سنا تھا آئی ہے۔" آپا کہتے ہوئے اندر آئیں۔

"لو پھر تنہا چلی آئی ہو؟" انہوں نے اس سے ملتے ہوئے خفگی سے کہا۔ زیب مسکرا دی۔

تھوڑی دیر میں سادگی سے رسم ہو گئی۔ سات سہاگنیں ثوبیہ کو ابٹن اور تیل لگانے لگیں۔ زیب قدرے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ نجانے کیوں اس کا دل اداس سا ہو رہا تھا۔

یہی سب تو اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

یونہی سات سہاگنوں نے ڈھیروں دعاؤں میں ابٹن تیل لگایا تھا۔

کون جانتا تھا کہ یہ دعائیں مستجاب نہیں ہوں گی۔

وہ پھر سہاگن سے ابھاگن ہو کر واپس لوٹ آئے گی۔

بری بات بہت بری بات زیب۔ خوشی کے اس موقع پر اس طرح کیوں سوچتی ہو۔ خدا تمہارے مقدر میں ساری خوشیاں لکھ دے۔

طاہر ٹھٹک کر رکا

مہندی رنگ کے سادہ سوٹ پر کڑھائی والا دوپٹہ اوڑھے' بالوں کی سادہ سی چوٹی اور ہلکے سے میک اپ میں وہ سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں آج بھی ہمیشہ کی طرح کھوئی کھوئی سی تھیں۔

"اے کاش! کبھی یہ آنکھیں محض میرے نام پر مسکرا دیں۔"

عجیب سی خواہش نے اس کے دل میں جنم لیا۔

سب لوگ مصروف تھے۔ لڑکیوں نے ڈھولک رکھ لی تھی۔ اب اپنی اپنی آواز میں سہاگ کے گیت گا رہی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے پاس آن رکا۔

"مجھے یقین تھا' آپ آئیں گی۔"

"جی' وہ چونک کر اس کی طرف گھومی پھر ذرا مسکرائی۔

"ثوبیہ نے بہت اصرار سے بلایا تھا۔ کیسے نہ آتی۔"

"کوئی اور بھی منتظر تھا آپ کا۔" طارق کی نگاہیں اس کی خالی کلائیوں سے ٹکرا کر لوٹیں۔ اس کی گمبھیر آواز پر زیب نے متعجب سا ہو کر اسے دیکھا تھا اور ایک لمحے کو بھول گئی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔

نہ آنگن میں کھڑی ڈھیر ساری خواتین یاد رہیں نہ ڈھولک پر پڑتی تھاپ

بس لو دیتی چمکتی سیاہ دو آنکھیں تھیں۔

زیب کے اندر جمی برف قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔

"طارق ماموں!"

اک خواب سا تھا جو ٹوٹ گیا۔ طارق نے پلٹ کر دیکھا۔ گڑیا اسے بلا رہی تھی۔ طارق نے زیب کی طرف دیکھا جو گوری ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آپ عادل کو آج بھی نہیں لائیں۔؟" طارق نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"وہ بھیڑ میں تنگ بہت کرتا ہے۔" وہ نظریں چرا کر ثوبیہ کو دیکھنے لگی۔

"اس طرح تو مزید تنگ کرنے لگے گا۔ اسے لوگوں سے ملنے کا عادی بنائیں زیب۔"

"شادی پر لاؤں گی۔"

گڑیاں کے دوبارہ پکارنے پر وہ پلٹ گیا تھا۔ زیب ایک خوب صورت سے احساس میں گھر کر مسکرا دی۔ لڑکیاں اسے ڈھولک کے پاس بلا رہی تھیں۔ وہ دھیرے سے ان کے پاس آ بیٹھی۔ مگر کچھ ہی دیر میں شام کے رنگ گہرے ہوتے دیکھ کر اٹھ گئی۔

"میں اب چلتی ہوں ثوبیہ۔"

"اتنی جلدی۔ تھوڑی دیر تو رکو۔"

"نہیں شام گہری ہو رہی ہے۔ امی پریشان ہو جائیں گی۔" زیب نے معذرت کی۔

"طارق چھوڑ آئیں گے تمہیں۔ ساتھ میں فروا چلی جاتی ہے۔"

"نہیں' اب اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔ یوں بھی اچھا نہیں لگتا۔" وہ چادر اوڑھنے لگی۔

ثوبیہ نے وسیم کو بلا کر تاکید کی کہ رکشہ میں بٹھا کر آنا۔ وہ سب سے مل کر چلی آئی۔

امی کھانا بنا چکی تھیں۔ عادل بے وقت سو گیا تھا۔

"آ گئیں بیٹا۔"

"جی امی! سب لوگ آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" زیب نے سالن نکالتے ہوئے بتایا۔

"اچھے ملنسار لوگ ہیں۔"

زیب کچھ دیر یونہی کھانا کھاتی رہی۔ پھر ہاتھ روک کر امی کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کے رنگ بہت گہرے تھے۔

"کیا ہوا؟" امی نے اسے یوں ہاتھ روکے دیکھا تو پوچھنے لگیں۔

"امی! وہاں ہر شخص عادل کا ذکر کر رہا تھا۔ یوں جیسے میرا وجود عادل کے ذکر کے بغیر نامکمل ہو۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" انہوں نے رسانیت سے کہا۔

"ہاں۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ لوگ عادل کو پہلے ہی سے تسلیم کر چکے ہیں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"پہلے ہی سے؟" امی کی گہری سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ زیب گڑبڑا گئی۔ نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گھبراہٹ میں اس نے پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔ امی نے ایک طویل سانس لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔ زیب اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

"تم سے بات کی کسی نے۔" انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

"جی۔ ثوبیہ نے بات کی تھی۔" وہ نظریں چرا کر برتن سمیٹنے لگی۔

"ہوں۔" وہ کسی گہری سوچ میں کھو گئیں۔ "اس دن طارق کی بہن بھی کچھ اشارے کنائے میں ذکر کر رہی تھیں۔"

"تو......تو آپ نے کیا سوچا؟" زیب نے آہستگی سے پوچھا۔

"مجھے کیا سوچنا ہے فیصلہ تو تم نے کر لیا۔" وہ ذرا سا مسکرائیں۔ زیب برتن سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں امی! میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

"ابھی بھی۔" انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے امی! انجانے میں کچھ غلط نہ ہو جائے۔" وہ نچلا ہونٹ کچلتے ہوئے بولی تھی۔ امی مسکرا دیں۔

"بس ایک سراب ہے بیٹا کہ فیصلہ ہم کرتے ہیں ورنہ یہ سب تو کہیں اور رقم ہوتا ہے۔ خدا پر بھروسہ کر کے کوئی ایک فیصلہ کر لو۔ وہی تمہیں صحیح رستہ دکھائے گا۔"

زیب اثبات میں سر ہلا کر کچھ سوچتی الجھتی باہر نکلی تھی۔

* * *

"اسکول نہیں جانا آج" امی نے اندر آ کر پوچھا۔

"جانا ہے۔" وہ ٹرنک کھولے نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔" وہ بھی ٹرنک کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔

"دیکھ رہی ہوں کہ ثوبیہ کی مہندی پر کیا پہنوں۔"

وہ مسکرا دیں۔ آج کتنے عرصے بعد ان کی بیٹی کو پہننے اوڑھنے کا دھیان آیا تھا۔ انہوں نے جھک کر ٹرنک کھنگالا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔" زیب کی نظر پرپل اور سلور کنٹراسٹ کے سوٹ پر پڑی۔ کسی اچھے وقت میں بنایا تھا۔

"ہاں اچھا لگے گا اور ایسا کو شادی کے لئے نیا جوڑا لے آؤ۔"

"نیا جوڑا۔ مگر اتنی جلدی سیوں گی کیسے؟" وہ متامل تھی۔

"ریڈی میڈ لے آنا۔ میرے پاس کچھ پیسے رکھے ہیں۔" انہوں نے تکیہ اٹھا کر بٹوا نکالا اور اس میں سے پیسے نکال کر زیب کو تھما دیئے۔

"آپ کیا پہنیں گی امی۔"

"میرے پاس تو کئی جوڑے رکھے ہیں۔ کبھی کہیں گئی ہی نہیں تو پہننے کیا تھے۔ چلو اب تیار ہو جاؤ میں ناشتہ بناتی ہوں۔"

زیب نے روپے پرس میں ڈال لئے۔ کتنے عرصے بعد اس کا دل نیا جوڑا پہننے کو چاہ رہا تھا۔ آج وین میں بھی طارق کی ملی۔ اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے زیب کے احساسات عجیب اور انوکھے سے تھے اس کے ساتھ ایک ٹیچر اور بھی بیٹھی تھیں۔ طارق بات نہیں کر سکا بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالی وہ معمول سے زیادہ نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ جب وہ اترنے لگی تب اس سے رہا نہیں گیا۔

"سنیں زیب!" زیب کے ساتھ ساتھ وہ ٹیچر بھی چونک کر طارق کو دیکھنے لگی۔

"مہندی پر سب لوگ آپ کا انتظار کریں گے۔ عادل کو ضرور لایئے گا۔"

زیب دھیمے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر پلٹ گئی۔

"میری بہن ان کی سہیلی ہیں۔ آج اس کی مہندی ہے۔" طارق نے بلا ارادہ ہی ٹیچر کی حیران حیران آنکھوں کو دیکھ کر وضاحت کی تھی۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ تنک کر رخ بدل گئی۔

اسکول سے واپسی پروین مارکیٹ کے پاس ہی رکتی تھی۔ وہ ریڈی میڈ ملبوسات کی دکانوں کی طرف چلی آئی۔ شیشے کے پار سجے ملبوسات کو دیکھتے ہوئے اس نے ساری مارکیٹ گھوم لی مارکیٹ تھی' ہی کتنی بڑی۔ ایک دکان پر خوب صورت سی شال دیکھ کر اسے خیال آیا کہ امی کے پاس شال پرانی ہے۔ اس نے امی کے لئے شال' عادل کے لئے خوب صورت اونی سوٹ اور ثوبیہ کے لئے گفٹ خرید لیا۔

"وہ آف وائٹ اور گرین سوٹ پہن لوں گی جس پر موتیوں کا کام کیا ہے۔" اس نے اپنے بارے میں سوچ لیا تھا۔ کچھ فروٹ خرید کر وہ خوشگوار موڈ میں گھر لوٹی تھی تو گلابی شام در و دیوار سے ڈھل رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ امی چارپائی پر نڈھال سی پڑی تھیں پاس ہی مسرت' اس کی امی اور صفدر بھائی امی کا ہاتھ تھامے نجانے کیا کہہ رہے تھے۔

"کیا ہوا امی کو؟" وہ لپک کر ان کے پاس آئی۔ امی اس کو دیکھتے ہی ضبط کھو بیٹھیں اور بازو آنکھوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ زیب کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھوٹ گئے۔

"امی' امی! بولیے نا کیا ہوا آپ کو' طبیعت تو ٹھیک ہے نے آپ کی۔" وہ ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا کر بے تابی سے پوچھنے لگی۔ مگر وہ روئے چلی گئیں۔

"صفدر بھائی۔" زیب نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔ "کچھ بتایئے نا کیا ہوا امی کو اس طرح کیوں رو رہی ہیں اور یہ عادل۔" وہ ایک دم چونکی۔

"عادل تمہارے گھر ہے مسرت؟" اس نے مسرت کی طرف دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی اور اس کی ماں کا چہرہ۔ خطرے کی گھنٹی اس کے اندر کہیں زور سے بجی تھی۔ وہ متوحش سی کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟ عادل کہاں ہے؟" وہ سہمی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اسے کچھ بتا سکے۔ مگر اس کا وجدان چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں۔ عادل کہاں ہے؟" وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں جا گھسی۔ مسرت نے بے بسی سے صفدر کی طرف دیکھا۔

"عادل کو وحید لے گیا ہے زیب۔" انہوں نے آہستگی سے بتایا۔ زیب نے یوں بے یقینی سے اسے دیکھا' جیسے سننے میں کچھ مغالطہ ہوا ہو۔

"کیا کہا' کون لے گیا اسے۔" وہ ان کا بازو ہلاتے ہوئے بے یقینی سے پوچھنے لگی۔ انہوں نے بس لب کاٹتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ زیب کے زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔ وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بڑبڑائی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"زیب!" امی نے خوفزدہ ہو کر اسے پکارا۔

"نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ امی یہ نہیں ہوسکتا۔" وہ چیختی چلی گئی۔ "آپ کے ہوتے ہوئے وہ کیسے لے گیا عادل کو' آپ نے روکا بھی نہیں اسے۔"

"زیب!" مسرت نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

"مت ہاتھ لگاؤ مجھے۔ وہ تم سب کے ہوتے ہوئے کیسے لے گیا اسے۔ تم سب نے مل کر عادل کو اس کے حوالے کیا ہے۔"

"میں بوڑھی کیسے روکتی۔ وہ تو طوفان کی طرح آیا اور عادل کو چھین لے گیا۔" امی رو پڑی تھیں۔

زیب تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔

"زیب! کہاں جا رہی ہو؟" صفدر بھائی نے لپک کر اسے روکا۔

"کہاں جاؤں گی میں۔ عادل کو لینے جا رہی ہوں۔ ایسے کس طرح لے جاسکتا ہے وہ۔"

"زیب بات تو۔"

"آپ کو اگر ساتھ چلنا ہے تو چلیں۔" اس کی آواز پھٹ گئی۔ مجبوراً صفدر بھائی کو اس کے ساتھ قدم بڑھانے پڑے۔ سارا راستہ وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی تھی۔ جب رکشہ رکا تو دروازے پر تالا دیکھ کر اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ساتھ والوں کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

"ارے زیب تم۔"

"یہ یہ۔" زیب نے بہ دقت بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لوگ تو چلے گئے۔"

"ک' کہاں؟" زیب کی آواز پاتال میں سے ابھری۔

"پتا نہیں شاید کراچی یا لاہور۔ وحید کی تو شادی ہوگئی تھی وہ لوگ آج صبح ہی یہاں سے ......"

زیب نے سہارے کو دونوں ہاتھ پھیلائے تھے مگر وہ بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گئی تھی۔

* * *

"یہ میں کیا سن رہی ہوں صفدر؟" صفدر کی امی آندھی و طوفان کی طرح کمرے میں وارد ہوئیں۔

"کیا سن لیا آپ نے؟" صفدر نے ٹی وی کی آواز ہلکی کی۔

"وحید اپنا بیٹا لے گیا۔" ان کا لہجہ سخت متجسس تھا۔

"ٹھیک سنا آپ نے۔" وہ اطمینان سے بولے گویا یہ کوئی بات ہی نہیں ان کے نزدیک۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"کافی دن ہوگئے۔" ان کا لہجہ و انداز ہنوز وہی تھا۔

"تمہیں پتا تھا؟" وہ متحیر سے لہجے میں بولیں۔

"ظاہر ہے' میں تو اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں۔" اب کے وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولے۔

"اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔" وہ بگڑ کر بولیں۔

"کیا بتاتا آپ کو یا پھر بتا دیتا تو آپ زیب کا بیٹا اسے واپس لا دیتیں۔" ان کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہوگیا۔

"اے لو میں کاہے کو واپس لا کر دیتی جس کی چیز تھی واپس کرلی۔" وہ تنک کر بولیں۔

"پر مجھے بتاتے تو سہی آخر کو میری بہن ہے افسوس کے لئے تو جانا ہی تھا۔ ساری دنیا ہو کر آ بھی گئی۔ مجھے اب خبر ملی۔" وہ بہن کی طرف سے ایسی ہی بے خبر تھیں۔

"تو اب چلی جائیں' اب کون سا عادل واپس آگیا ہے۔"

وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگیں۔

"ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ میں کہتی ہوں صفدر۔ اب موقع دیکھ کر بات کر ہی آؤں شادی کی۔"

"امی! ان حالات میں۔" وہ بری طرح چونکے۔

"لو حالات کو کیا ہوا۔ بلکہ یہی تو مناسب وقت ہے۔"

"امی! آپ کو نہیں معلوم زیب کی حالت کیا۔ اس حالت میں یہ بات نہیں۔ اسے ذرا سنبھلنے دیں۔ پھر بات ہو جائے گی۔" وہ حقیقتاً زیب کی حالت کی طرف سے فکرمند تھے بہر حال انہوں نے زیب سے محبت کی تھی۔

"ٹھیک ہے ویسے میں کل جاؤں گی افسوس کیلئے۔"

* * *

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا!

کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ' بہت اندھیرا ہے

نہر کے پانیوں پر دھند کھیلتی تھی۔ اس کے دونوں کناروں پر کھڑے برہنہ پیڑ زمین کی گود

زرد پتوں سے بھر چکے تھے۔ تھوڑی دور آباد گاؤں دھند کی بدولت اپنی خدوخال واضح نہیں کر پارہا
تھا۔ زرد ہوا کی سرگوشیاں سسکیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ زرد ہوا کے جھونکے نے اداسی سے اس کے
خزاں زدہ وجود کو دیکھا اور چپکے سے گزر گیا۔

وہ کب سے اس کنارے پر خشک پتوں کے ڈھیر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ سیاہ بیگ
اس کے دائیں طرف پڑا تھا۔ سیاہ چادر سر سے کھسک کر کندھوں پر آ گئی تھی اور اس میں اتنا دم نہ تھا
کہ وہ یہاں سے اسکول تک کا فاصلہ طے کر سکے۔

چائے بناتے بابا جی نے پلٹ کر اسے دیکھا اور تاسف سے سوچا تھا۔

"اچھی بھلی تھی پتا نہیں کیا غم لگ گیا نمانی کو۔"

وہ اکثر یونہی آ کر نہر کنارے بیٹھی رہتی اور پھر کسی رکنے والی ویگن میں بیٹھ کر واپس چلی
جاتی۔ کبھی کبھی بختو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی۔

"کی ہو گیا اے کڑیے۔"

وہ یونہی لب بستہ خشک پتوں کو مسلتی نہر میں جھانکتی رہتی۔ پھر وہ اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں تک
چلا آتا۔ اس کا بھاری ہاتھ نرمی سے اس کے کندھے کو چھوتا تو اپنی ہی سوچوں کے گرداب میں
الجھی زیب ڈر جاتی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں زیب۔" وہ بڑے ضبط سے مسکراتا اور کندھوں پر ڈھلکی چادر سر پہ رکھ دیتا۔

"تم، تم طارق ہو نا۔" وہ غور سے اسے دیکھتے ہوئے پہچان کی منزلیں طے کرتی۔

"ہاں میں طارق ہوں۔ چلو گھر چلیں۔" وہ اس کا یخ ہاتھ تھام لیتا۔

"تم کیوں خوار ہوتے ہو میرے پیچھے۔" زیب کے لہجے میں بے بسی در آتی۔

"تم مت خوار کرو نا۔" طارق کا لہجہ دکھ کی آنچ پر پگھلنے لگتا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس لڑکی
کی آنکھوں میں روشنیاں بھر دے گا۔ مگر ہوا کیا؟

وہ ان خزاں زدہ آنکھوں میں جھانک بھی نہ پاتا۔

اتنی سکت تھی نہ تاب۔

"تمہیں پتا ہے طارق! میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔" وہ اس کے ساتھ قدم بڑھاتے
ہوئے کہتی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"کیسے؟" اس کے قدم ٹھٹک جاتے۔

"تم جیسی لڑکی کسی کا برا چاہ ہی نہیں سکتی۔ جن کے ہونٹوں پر دعائیں کھیلتی ہوں۔ وہ کسی کو
بددعا نہیں دے سکتے۔"

"تو پھر میرے ساتھ کیوں برا ہوا؟" وہ ہذیانی ہو کر اس کا بازو جھنجوڑ ڈالتی۔

"یہ آزمائش ہے زیب اور تم۔" طارق بے بسی سے لب کاٹ کر رہ جاتا۔

"اور میں کمزور نکلی۔" وہ جیسے تھک جاتی۔

"پتا ہے طارق! وہ مجھ سے کہتا تھا اپنی ساری تنخواہ ماں کو دو۔ وہ گھر چلاتی ہے۔ میں نے
دے دی۔ کچھ بھی نہ کہا۔ پھر مجھے پورا مہینہ ایک ایک پیسے کیلئے ترسنا پڑتا۔ میرے پاس کرائے
کے پیسے بھی نہ ہوتے۔ میں اکثر پیدل اسکول جاتی تھی۔"

زیب کو پتا بھی نہ ہوتا وہ یونہی اپنے ماضی کے زخم عیاں کرتی جاتی۔

"وہ کہتی تھی۔ پڑھی لکھی لڑکیاں فیشن کرتی ہیں۔ لوگوں کو دکھانے کیلئے۔ میں نے اچھے
کپڑے پہننے چھوڑ دیئے۔ پھر اس نے ایک دن کہا اسکول کے بہانے کہاں کہاں جاتی ہوں اور وہ
بے وقوف وحید اس کی باتوں میں آ کر مجھے مارنے لگتا۔ تب تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میں
اس گھر کو چھوڑ دوں گی مگر جب دو سال بعد میں نے اسے بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو اس
نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس کا بچہ ہے۔"

طارق دکھ کے مارے منہ پھیر لیتا تو وہ اس کا کندھا کھینچ کر رخ اپنی طرف کرتی۔

"میں سچ کہتی ہوں۔ اس نے یہی کہا تھا۔ پھر میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ پھر بتاؤ طارق!
کوئی حق تھا اس شخص کا کہ وہ عادل کو لے جاتا۔" اس کی آنکھیں بھیگتیں پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو
دیتی۔

"بتاؤ طارق! پھر وہ عادل کو کیوں لے گیا؟"

اور طارق روتی بلکتی زیب کو تھام کر ویگن میں بٹھا دیتا۔ اس نے سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ لوگ
ان دونوں کو دیکھ کر کیا باتیں کرتے ہیں۔

آج بھی وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسکول نہیں گئی
ہوگی۔

"زیب!" وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا۔

"تم پھر آ گئے ہو؟" اس کے لہجے میں نہ مزاحمت ہوتی نہ ضد وہی ایک بے بس سی کیفیت۔

"تم یوں مت نکلا کرو گھر سے۔"

"میں تو اسکول آتی ہوں۔" اس نے خشک پتے مسل کر نہر کے پانیوں کو اچھال دیئے۔

"مگر تم اسکول نہیں جاتی ہو زیب۔" طارق کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

"تم مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کرتے ہو۔" زیب کی تیوری چڑھ گئی۔ طارق لب بھینچ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"یہاں بہت سکون ملتا ہے طارق! یہاں لوگ نہیں ہوتے بار بار آ کر تنگ نہیں کرتے۔ یہاں بیٹھ کر کتنے آرام سے میں عادل کو سوچتی ہوں۔ اس کی آنکھیں' اس کے ہونٹ' اس کے ننھے منے ہاتھ' اس کی آنکھیں کتنی پیاری کتنی معصوم تھیں۔ طارق' طارق! وہ اس کا خیال تو رکھتا ہو گا نا۔" وہ ایک دم سہم کر پوچھنے لگی۔ طارق کھڑا ہو گیا۔ وہ مایوسی سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں چلتے ہیں۔ میں نے بہت چھٹیاں کر لیں اسکول سے' اب میرا خیال ہے مجھے جانا چاہئے۔ بچیوں کا بہت حرج ہوتا ہو گا۔" اس کے ذہن میں ایک مثبت سوچ نے سر اٹھایا تھا۔ طارق نے سوچا۔ شاید وہ اس طرح بچیوں کے ساتھ بہل جائے۔

"تمہیں واقعی جانا چاہئے زیب۔"

"کل جاؤں گی آج تو بہت دیر ہو گئی ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا پرس اٹھانے لگی۔

"جب میں اسکول سے گھر جاتی تھی تو عادل میرا پرس لے لیتا تھا پھر سارا پرس کھول کر دیکھتا کہ میں اس کے لئے ٹافیاں لائی ہوں گی۔"

"میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔" طارق نے دانستہ اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔

"تم میری وجہ سے خوامخواہ تکلیف اٹھاتے ہو۔" زیب کو پشیمانی نے گھیر لیا۔

"مجھے تکلیف نہیں ہوتی"۔ وہ اس کے ساتھ قدم بڑھانے لگا۔ آج زیب میں بہت دنوں بعد مثبت تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتی رہی پھر رک گئی۔

"کیا ہوا؟"

"طارق! اس نہر میں چھلانگ لگا دینے سے کوئی مر جائے گا۔"

طارق نے گھبرا کر اس کی کلائی تھامی۔ زیب نے اس کی گرفت کو دیکھا پھر سر اٹھا کر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"تم یونہی ڈر گئے ہو۔ میں خودکشی تو نہیں کر رہی۔ ابھی تو۔" کچھ کہتے کہتے رکی پھر سر جھٹک کر بولی۔

"چلو! گھر چھوڑ آؤ مجھے۔"

"پتر خیال رکھا کر اس کا۔" بابا جی طارق سے کہہ رہے تھے۔

"بابا جی۔" زیب نے دو قدم آگے بڑھ کر بابا جی کے گھٹنوں کو چھوا اور لجاجت سے پکاری۔

"دعا کریں' مجھے میرا عادل مل جائے۔"

"اللہ تیرا کلیجہ ٹھنڈا کرے دھیے۔" بابا جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

"چلو زیب!" طارق کے کہنے پر وہ خاموشی سے جا کر وین میں بیٹھ گئی۔

"کل ثوبیہ آئے گی۔ پرسوں میں اسے تمہارے گھر لے کر آؤں گا۔" طارق نے اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں لے آنا۔" زیب کا لہجہ سپاٹ تھا پھر سارا رستہ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ بس چپ چاپ ویگن کے سامنے بھاگتے' پھدکتے اور اڑتے رنگ برنگے پرندوں کو دیکھتی رہی۔ تب ہی ایک خوبصورت ننھا سا پرندہ ویگن کے بے حد قریب آنے پر ایکدم اڑا مگر ویگن کے شیشے سے بری طرح ٹکرایا تھا۔ زیب کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ طارق کا پاؤں ایکدم بریک پر جا پڑا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

تب طارق کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کے دل سے صدا اٹھی تھی۔

"اے رب ذوالجلال۔ میں نے کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ پر آج...... آج بس ایک التجا ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی نیکی کی ہے تو اس کے بدلے اس لڑکی کو سکون دے دے۔ اسے اس کا بیٹا لوٹا دے۔"

اس نے ایک طویل سانس لے کر وین آگے بڑھا دی۔

* * *

"عادل کی طبیعت کیسی ہے اب؟"

"کبھی بیوی کی طبیعت بھی پوچھ لیا کرو۔ آتے ہی اس دو چھٹانک کے چھوکرے کی پڑ جاتی ہے۔" جمیلہ کو تو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔

"اُفوہ' بخار تھا اسے صبح' اس لئے پوچھ لیا تھا۔" اس نے جھنجلا کر فائل ایک طرف اچھالی اور بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اب وہ زیب تو تھی نہیں کہ یوں جواب دینے پر اس پر برس پڑتا۔ ماں کی چہیتی بہو تھی۔

"کہاں ہے عادل؟" اس سے رہا نہیں گیا تو پھر سے پوچھ لیا۔ جمیلہ نے خطرناک تیوروں سے اسے گھورا۔

"مجھے کیا پتا' ہو گا تمہاری چہیتی بھابی کے کمرے میں۔ اسے ہی ہمدردی کے دورے پڑتے رہتے ہر وقت۔"

"کیوں تم گھر پہ نہیں تھیں؟" وحید نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تھی۔ ابا کا فون آیا تھا' بیمار تھے۔ میں وہاں گئی تھی۔" اس نے اطمینان سے بتایا۔

"کس سے پوچھ کر گئی تھیں؟" وہ طیش میں بولا۔ (وہی زیب سے پوچھ گچھ کی عادت)۔ جواباً وہ تڑخ کر بولی۔

"تمہاری اماں سے۔ اب کیا تمہارے پیچھے دفتر بھاگی جاتی۔ بہت طبیعت خراب تھی ابا کی۔"

وحید کو اس کے ابا کی بیماری سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ ہفتے کے سات دن بیمار رہتے تھے اور جمیلہ ساتوں دن ان کے پاس۔ وہ اٹھ کر باہر چل دیا۔ خیال یہی تھا کہ عادل کو دیکھے۔ صبح جب وہ دفتر گیا تھا تو اسے شدید بخار تھا۔ وہ اماں سے کہہ گیا تھا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں' پر اب اماں بھی غائب تھیں۔ جمیلہ سے تو کوئی امید ہی نہ تھی۔ اسے سوکن کا بیٹا سنپولیا لگتا۔ عادل کو تو وہ دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ کجا کہ اس کی تیمارداری۔ وحید کو باہر نکلتا دیکھ کر وہ پھنکاری۔

"کدھر جا رہے ہو۔"

"عادل کو دیکھوں' پتا نہیں اس کا بخار اترا ہے یا نہیں۔" بہر حال وہ اس کا بیٹا تھا۔

"ہاں ...... ہاں اس کو جا کر دیکھو۔ میرے باپ کا حال نہ پوچھنا۔ وہ چاہے مرے جائے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا باپ۔" وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا۔ اماں تو کہیں نہیں تھی۔ وہ بڑی بھابی کے کمرے میں آ گیا۔ وہ وحید کو دیکھتے ہی لتاڑنے لگیں۔

"شرم کرو' کوئی خدا کا خوف ہے تم میں کہ نہیں۔ بیمار بچے کو چھوڑ کر دفتر بھاگ گئے۔ پیچھے جو مرضی ہوتا رہے تمہاری بلا سے۔"

"میں اماں سے کہہ گیا تھا' وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔"

"اماں کی خوب کہی۔ ہماری ساس کو تو بس شوق تھا' بس کسی طرح زیب سے بچہ چھین لے اسے نیچا دکھا لے۔ پوتے سے کوئی دلچسپی نہیں اسے۔ مرے یا جئے۔" وہ چمک کر بولیں۔ "پر تم تو باپ ہو۔ تم ہی خیال کر لیا کرو۔ نہیں سنبھالا جاتا تو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آؤ یا پھر اپنی بیوی سے کہو۔ اس کی دیکھ بھال کیا کرے۔ پتا نہیں' کیسی سنگدل عورت ہے۔ میرے اپنے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں کب تک سنبھالوں۔ اسے تو رتی بھر ترس نہیں آتا۔ غصہ کسی بات پر ہو' روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتی ہے' معصوم کو۔"

وحید بری طرح چونکا۔

"مارتی ہے اس کو جمیلہ؟"

"تو کیا پھولوں کی طرح رکھتی ہے۔ تم نے تو آنکھ کان بند کر رکھے ہیں۔" وہ خفگی سے بولیں۔ وحید تو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اتنے چھوٹے بچے کو مارا بھی جا سکتا ہے۔

"بخار اترا یا نہیں۔" بولا تو لہجہ پشیمان سا تھا۔

"سیرپ دیا ہے میں نے زبردستی۔ روتے روتے سو گیا ہے۔" بھابی کہتے ہوئے باہر نکلیں پھر پلٹ کر بولیں۔

"ذرا غور سے دیکھو' جب آیا تھا تو کیا ایسا تھا بلکہ غور سے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئیں۔

"پڑھا آئیں پٹیاں میرے میاں کو۔" جمیلہ دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی' تنک کر بولی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے پٹیاں پڑھانے کی۔ اس کام کیلئے تم اور اماں کافی ہو۔"

بھابی بھی ہنوز اسی لہجہ و انداز میں بولیں۔ ہمیشہ چپ رہنے والی زیب کا حشر دیکھ چکی تھیں۔ یہ لوگ اس قابل ہی نہ تھے کہ مروت برتی جائے۔ باہر نیا معرکہ شروع ہو گیا تھا۔

وحید چٹختے اعصاب کے ساتھ عادل کے پاس لیٹ گیا۔ وہ نیند میں بھی سسکیاں بھر رہا تھا۔ پپوٹے سوجے ہوئے اور سرخ تھے۔

"ذرا غور سے دیکھو' جب آیا تھا تو کیا ایسا تھا۔"

اور واقعی غور سے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پھولے پھولے گلابی گال زرد اور پچکے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ جب سے آیا تھا' بیمار ہی رہتا تھا۔ کبھی نانی کو یاد کرتا' کبھی ماں کو۔

وحید نے اس کا ماتھا چھو کر دیکھا۔ بخار قدرے کم ہو گیا تھا۔ اس کی گرم سانسیں وحید کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کی گھٹی گھٹی سسکیوں میں دبا دبا احتجاج تھا' فریاد تھی۔

"شاید میں نے تم پر ظلم کیا ہے عادل مگر ...... مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔"

وحید نے اس کی بند مٹھی کھول کر جلتی ننھی سی ہتھیلی اپنے لبوں پر رکھ لی تھی۔

* * *

وہ اتنی تھکی اور اجڑی سی گھر میں داخل ہوئی تھی کہ اماں اپنی شدید پریشانی کے باوجود اس سے کچھ بھی نہ پوچھ سکیں۔ وہ یوں ہی بغیر چادر اتارے اندر پلنگ پر ایک بازو آنکھوں پر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا ایک طویل مسافت طے کر کے آئی ہے۔ اب تو وہ امی سے باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ بس ضرورتاً کچھ بولے تو بولے یا پھر جب ضبط کا یارا نہ رہتا تو ان کی گود میں سر رکھ کر

عادل کی باتیں کرنے لگتی۔

وہ زیب کو ساری ساری رات روتے دیکھتیں۔

سردیوں کی کہر زدہ راتوں میں چھت پر صحن میں ننگے پاؤں چکراتے دیکھتیں تو گھٹ گھٹ کر رونے لگتیں۔ تڑپ تڑپ کر خدا کے سامنے دعائیں کرتیں۔ پر وہ بے نیاز تھا۔

کون جانتا تھا کہ نازوں پلی بیٹی کے ایسے اپسے دکھ دیکھنے کو ملیں گے کہ کلیجہ شق ہو جائے گا اور زندگی بوجھ لگنے لگے گی۔

وہ بلکتی، سسکتی، تڑپتی بیٹی کو دلاسا بھی نہ دے سکتی تھیں کہ ماں کا دلاسا اولاد کے چہرے پر پڑنے والی پہلی نظر ہوتی ہے اور نوچنے والے اس کا کلیجہ نوچ کر لے گئے تھے۔

‘‘زیب! اٹھو بیٹی کپڑے بدل لو۔’’ امی نے سارے آنسو اپنے اندر گراتے ہوئے دھیرے سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ آج کل وہ باقاعدگی سے اسکول جا رہی تھی۔

‘‘بعد میں بدل لوں گی۔ ابھی دل نہیں چاہ رہا۔’’ وہ شکستہ انداز میں بولی۔ وہی ہارا ہوا لہجہ۔

‘‘کھانا لاؤں تمہارے لئے؟’’ انہوں نے اصرار نہیں کیا۔

‘‘ابھی دل نہیں چاہ رہا۔’’ اس کا دل ہی مر گیا تھا۔ اتنا بھی نہیں کھاتی تھی جتنا جینے کے لئے ضروری تھا۔ ان کے ہونٹوں پر خاموش سسکی ٹوٹ کر بکھری۔ وہ آنسو چھپا کر باہر نکل گئیں۔ جانتی تھیں نا اب وہ لاکھ اصرار کریں، وہ نہیں کھائے گی۔ گھر کی بوجھل بوجھل خاموش فضا میں ادھر ادھر چکرانے لگیں۔

‘‘کیسے کلکاریاں سی گونجا کرتی تھیں عادل کی۔ ہر پل رونق سی لگی رہتی۔’’ انہوں نے سکھ چین کے زرد رو پژمردہ سے پتوں پر نگاہ ڈالی۔ خزاں دھیرے دھیرے اس کے سبز وجود میں سرایت کر رہی تھی۔

تب ہی دروازے پر ہونے والی دستک گھر کی خاموش و ساکت فضا میں زندگی کی طرح دوڑ گئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ ثوبیہ کو دیکھ کر بے چین و بے کل وجود میں طمانیت دوڑ گئی۔

‘‘السلام وعلیکم آنٹی۔’’ ثوبیہ نے آہستگی سے کہا۔

‘‘وعلیکم السلام، جیتی رہو بیٹی۔ آؤ اندر آجاؤ۔’’ انہوں نے رستہ دیا۔ اس کے پیچھے ہی طارق بھی آ گیا۔

‘‘کیسی ہو بیٹی! سسرال والے کیسے ہیں؟’’ وہ شادی کے بعد پہلی بار آئی تھی۔

‘‘ٹھیک ہوں، سسرال والے بھی اچھے ہیں۔’’

‘‘اللہ نصیب اچھے کرے۔’’ وہ دعا دیتے ہوئے طارق کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جو دونوں

ہاتھ پشت پر باندھے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں وہ سادہ، سچا اور کھرا نوجوان انہیں بیٹوں کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔

‘‘زیب اندر ہے، جب سے اسکول سے آئی ہے یوں ہی پڑی ہے۔ کچھ کھایا بھی نہیں۔ تم ذرا......’’

‘‘میں دیکھتی ہوں۔’’ ثوبیہ نے کہا۔ وہ طارق کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

ثوبیہ نے اندر جھانکا وہ یوں ہی بازو آنکھوں پر رکھے لیٹی تھی۔

‘‘زیب!’’ ثوبیہ نے دھیرے سے پکارا۔ اس نے بازو ہٹا کر دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کی اداس و ویران آنکھوں میں تحیر سا لہرایا اور پھر سے سپاٹ ہو گئیں۔

‘‘آؤ ثوبیہ!’’ اس کے لہجے میں کوئی خوشی کی رمق نہ جاگی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی دیکھ کر ثوبیہ کا چہرہ دکھ و تشویش کا عنوان بن گیا۔ وہ ساکت کھڑی اس کے وجود سے لپٹی خزاں کی زرد چادر کو دیکھے گئی۔ یہ وہ زیب تو نہ تھی۔

‘‘ایسے کیا دیکھ رہی ہو، اندر آؤ نا۔’’ زیب کے ہونٹوں پر بھولی بھٹکی مسکراہٹ آرکی۔

‘‘یہ تم نے کیا حالت بنالی ہے زیب؟’’ وہ اندر آ کر اس سے لپٹ گئی۔

‘‘کیا ہوا، ٹھیک تو ہوں میں۔’’ وہ کڑے ضبط سے مسکرائی تھی۔

‘‘ہاں شاید۔’’ اس نے بمشکل آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔

‘‘سوری، میں تمہاری شادی پر نہیں آسکی۔’’ ثوبیہ سر جھکا کر نجانے کیا سوچنے لگی۔

‘‘تم ابھی تک کھڑی کیوں ہو، بیٹھو نا، کس کے ساتھ آئی ہو۔’’

‘‘طارق کے ساتھ، تم نے ابھی تک چادر بھی نہیں اتاری، کیا ابھی آئی ہو اسکول سے۔’’ ثوبیہ نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

‘‘نہیں ابھی کچھ دیر پہلے۔’’ اس نے چادر اتار کر یونہی پڑا ایک دوپٹہ اوڑھ لیا۔

‘‘تم بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔’’

‘‘وہیں چلتے ہیں۔’’ ثوبیہ اس کے ساتھ ہی کچن میں آ گئی۔

‘‘تمہارے سسرال والے کیسے ہیں اور تمہارا شوہر۔’’ زیب نے ادھر ادھر ماچس ڈھونڈتے ہوئے پوچھا۔

‘‘اچھے ہیں سب۔’’ ثوبیہ نے مختصراً بتایا۔

‘‘میں نے تمہارے لئے گفٹ لیا تھا۔ یونہی رہ گیا امی نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔’’ وہ بات کرتے کرتے اسے غور سے دیکھنے لگی۔

’’ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟۔‘‘

’’میں تمہیں دعا دینا چاہتی ہوں ثوبیہ! کاش تمہارے چہرے کی یہ چمک یونہی قائم ودائم رہے۔‘‘

’’تو دونا‘‘ ثوبیہ مسکرائی۔ زیب کے چہرے پر خالی پن کچھ اور واضح ہوا۔ وہ نظریں چرائے چولہا جلاتے ہوئے بولی۔

’’میری دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں۔‘‘ اس کے لہجے کی شکستگی پر ثوبیہ تڑپ اٹھی۔

’’ایسی باتیں مت کرو زیب۔‘‘

’’کبھی کبھی مجھے پتا نہیں چلتا۔ میں کیا کہہ جاتی ہوں۔‘‘ وہ سر جھٹک کر چائے کا پانی چڑھانے لگی۔

دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہوگئی تھی جسے ثوبیہ کی آواز نے توڑا۔

’’میں بہت خفا تھی تم سے کہ تم میری شادی پر کیوں نہیں آئیں طارق نے مجھے بتایا ہی نہیں اس دن بتایا تب مجھے جنید لینے آگئے‘ میں چاہنے کے باوجود نہیں آسکی۔‘‘ وہ ندامت بھرے لہجے میں بولی۔

’’مجھے معلوم ہے‘ اب تم اتنی آزاد نہیں رہی کہ جب چاہو آجاؤ۔‘‘

’’طارق چلا گیا ہے‘ کہہ رہا تھا‘ تھوڑی دیر میں آکر لے جائے گا۔‘‘ امی نے آکر بتایا۔

’’آپ نے چائے کیلئے روکا ہوتا۔‘‘

’’اسے کسی کام سے جانا تھا۔‘‘ وہ ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔ ثوبیہ چاہتی تھی وہ اس سے عادل کے متعلق بات کرے۔ وحید کو برا بھلا کہے مگر زیب کے ردعمل سے ڈرتی تھی۔ طارق نے اسے بہت تفصیل سے زیب کے متعلق بتایا تھا۔ چائے بن گئی تھی زیب نے خاموشی سے بسکٹ نکال کر اس کے سامنے رکھے۔ خود خالی چائے لینے لگی تو ثوبیہ نے ٹوک دیا۔

’’تم نے ابھی کھانا نہیں کھایا زیب! خالی چائے مت لو۔‘‘

زیب کے ہاتھ سے چائے چھلک گئی‘ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی پھر بے بسی سے ثوبیہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

’’مجھ سے کھایا نہیں جاتا ثوبیہ! عادل کتنا چھوٹا سا تھا‘ ابھی تو خود سے کوئی چیز بھی نہیں نکال سکتا اپنے لئے‘ اسے کون اپنے ہاتھوں سے اپنی گود میں بٹھا کر کھلاتا ہوگا۔ وہ اتنا سا ہو کر کتنے نخرے کرتا تھا کون اس کے ناز نخرے اٹھاتا ہوگا۔‘‘

وہ سسک اٹھی تھی۔ ثوبیہ کی آنکھیں اسے چپ کرواتے کرواتے خود بھی چھلک گئیں۔

* * *

’’کیا بات ہے خالہ جان! اس طرح کیوں بیٹھی ہیں اور دروازہ کھلا چھوڑ رکھا ہے۔‘‘

صفدر ان کے پاس بیٹھ کر تشویش سے پوچھنے لگے۔ انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور ایک طویل سانس لے کر سیدھی ہو بیٹھیں۔

’’اب یہاں کیا رکھا ہے بیٹا! جو دروازے بند کروں۔‘‘ ان کے لہجے پر صدیوں کی تھکن بھری‘ وقت نے بڑا کاری وار کیا تھا۔ ان کے چہرے کی جھریوں سے وقت کی سفاکیاں جھلک رہی تھیں۔

سب کچھ سہہ جانے والی آج بیٹی کا دکھ نہیں سہہ پا رہی تھی۔ صفدر نے ادھر ادھر دیکھا‘ پیڑ چڑیوں سے خالی تھا۔ پورے گھر پر مہیب خاموشی چھائی تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ ساکت سی تھی۔ صفدر کو اس گہری چپ سے الجھن ہونے لگی۔

’’پہلے تو سارا دن عادل کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں یوں گزرتا تھا کہ پتا نہیں چلتا تھا اب صبح ہوتی ہے تو ڈھلنے کا نام نہیں لیتی۔‘‘

’’زیب اوپر ہے؟‘‘

صفدر کے سوال پر ایک لمحے کو انہوں نے نظریں چرالیں۔ پھر آہستگی سے بولیں۔

’’ابھی آئی نہیں۔‘‘

’’ابھی آئی نہیں۔‘‘ صفدر نے تعجب سے ان کے الفاظ دہرائے پھر کلائی موڑ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

’’کیا وقت ہو رہا ہے خالہ جان زیب ابھی تک نہیں آئی‘ خدا خیر کرے۔‘‘ وہ واقعی پریشان ہوگئے تھے۔ ’’وین نہ خراب ہوگئی ہو‘‘ وہ زیر لب بڑبڑائے۔

’’آتی ہی ہوگی۔‘‘ وہ انہیں بتا نہیں پائیں کہ وہ اسکول سے اکثر مقررہ وقت سے لیٹ ہی آتی ہے اور اتنی پریشان حال اور بکھری ہوئی ہوتی ہے کہ وہ جرح کا حق رکھتے ہوئے بھی کچھ پوچھ نہیں پاتیں یا شاید اس پر اعتماد ہی بہت تھا۔

’’انتظار کر لیتے ہیں ورنہ پھر میں جا کر دیکھتا ہوں‘‘ وہ متفکرانہ انداز میں بولے۔

’’اس کی ضرورت نہیں‘ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔‘‘

ان کے سپاٹ لہجے میں صفدر نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ پھر کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب وہ طارق کے ساتھ آئی تھی۔ صفدر اضطراری انداز میں کھڑے ہوگئے۔ وہ یونہی خاموشی سے بڑھ جانے والی تھی جب وہ اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"کہاں تھیں تم؟" نادانستگی میں لہجہ سخت ہو گیا۔ اس کے دیر سے آنے پر غصہ تھا یا طارق کے ساتھ آنے پر' وہ خود بھی نہ سمجھ سکے۔ تب ہی زیب نے اپنی خالی آنکھیں ان کے چہرے پر ٹکائیں۔

"کیا آپ مجھ سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا مگر صفدر زندگی میں پہلی بار ان آنکھوں میں غصہ' مزاحمت اور ضد دیکھ رہے تھے۔ اور اس کا بات کرنے کا انداز... لب بھینچ کر رہ گئے۔

"میں تو رکھتی ہوں نا یہ حق۔" امی کو زیب کا صفدر سے اس لہجے میں بات کرنا اچھا نہیں لگا تھا تب ہی سامنے آ کر بولیں۔

"تو آپ کو بتا دوں گی۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور پلٹ گئی۔

"اچھا خالہ جان! میں چلتا ہوں' اچانک مل گئیں تو میں انہیں چھوڑنے چلا آیا۔" طارق نے اس ماحول میں خود کو فالتو سا محسوس کیا تو اجازت چاہی' صفدر پلٹے۔

"یہ تمہیں ہمیشہ اچانک کیوں مل جاتی ہے۔ میرے ساتھ تو ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔" صفدر کا لہجہ استہزائیہ و طنزیہ تھا۔

(اسے اپنے جذبوں کی سچائی نہ مانوں تو اور کیا کہوں)

طارق نے سنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا اور متانت سے بولا۔

"یہ بہت چھوٹا سا شہر ہے صفدر صاحب! اور میں یہاں وین چلاتا ہوں۔ ہر گلی' ہر کوچے سے گزر ہوتا ہے میرا' اگر کہیں شناسا چہرہ مل جائے تو اسے منزل تک پہنچانا میری ذمہ داری ٹھہری۔"

طارق کا لہجہ پر اعتماد تھا۔ صفدر کے چہرے پر ناگوار سے تاثرات بکھر گئے۔

"تو ڈرائیور صاحب! بہت بہت شکریہ اس ذمہ داری کو نبھانے کا' اب آپ جا سکتے ہیں۔" وہ لفظ چبا کر بولے تھے۔ طارق کی کنپٹیاں اس توہین آمیز لہجے پر سلگ اٹھیں۔

"طارق رکو' چائے پی کر جانا۔" زیب کی آواز پر صفدر بھائی لب بھینچ کر پلٹے۔ زیب کچن میں جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں' آپ چائے پئیں طارق صاحب۔"

"صفدر بیٹا! بات تو سنو!" امی نے بے اختیار پکارا مگر وہ رکے نہیں' طارق شرمندہ ہو گیا۔

"میں چلتا ہوں خالہ جان۔" امی نے بس اثبات میں سر ہلایا تھا۔ طارق نے ایک ...

پڑی نظر کچن کے دروازے میں کھڑی زیب پر ڈالی اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ امی نے پلٹ کر زیب کو دیکھا پھر تخت پر بیٹھ گئیں۔

"کیوں تنگ کرتی ہو زیب؟" ان کا لہجہ بے بسی لئے ہوئے تھا۔ وہ تھکے تھکے قدم گھسیٹتی ان کے پاس آئی اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"تمہیں صفدر سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

"مجھے غصہ آ گیا تھا اس کے لہجے پر' وہ یوں پوچھ رہے تھے جیسے میں ......" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"تو کہاں جاتی ہو تم ہر روز اتنی دیر سے آتی ہو۔ یہ خیال بھی نہیں آتا کہ پیچھے ماں بیچاری اکیلی ہوتی ہے۔ یہی سوچ کر ہولتی رہتی ہے کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔"

"جو حادثہ ہو گیا امی! اس سے زیادہ کیا ہو گا؟"

اس کے ٹوٹے بکھرے لہجے پر وہ لمحے بھر کو چپ کی چپ رہ گئیں۔

"تمہارا اس طرح دیر سے آنا بھی تو ٹھیک نہیں' لوگوں کی زبانیں' آخر کب تک خاموش رہیں گی اور پھر تم مجھے بتا کر بھی نہیں جاتی ہو۔" اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے رسانیت سے کہا۔

"کہاں جانا ہے مجھے' دیکھنے جاتی ہوں' بند دروازے کھلے یا نہیں' امی! وہ کہاں چلا گیا ہے اسے لے کر۔" وہ ان کی گود میں منہ چھپا کر تڑپ اٹھی تھی۔ اس کے لہجے میں کانچ ٹوٹ کر بکھرے اور ماں کے دل کو زخمی کرتے چلے گئے۔

"امی! مجھے رات کو نیند نہیں آتی ذرا جو پلک جھپک جائے تو یوں لگتا ہے جیسے عادل مجھے پکار رہا ہے۔ امی! وہ کیسے سوتا ہو گا اتنا چھوٹا سا بچہ ماں کے بغیر کیسے سو پائے گا' وہ دانت نکال رہا تھا' امی بیمار رہتا ہو گا کون اسے سنبھالتا ہو گا۔ کون اس کی ضدیں پوری کرتا ہو گا' امی میں کیا کروں میرا دل کٹ کٹ کر گرتا ہے' میرا عادل ...... میرا عادل کس حال میں ہو گا۔"

وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ امی نے تڑپ کر اسے اپنی گود میں چھپا لیا۔

"میں کیا کروں زیب! میں کیا کروں۔ میرے بس میں کچھ نہیں میرے بس میں ہو تو اسے کہیں سے ڈھونڈ لاؤں' پر میں بھی تیری طرح بے بس ہوں بیٹی۔"

"امی ......!" زیب نے ایک دم ان کی گود سے سر اٹھایا۔ "میں ...... میں کراچی نہ چلی جاؤں۔"

"کیا کہہ رہی ہو زیب؟" وہ دہل گئیں۔

"امی! وہ لوگ ضرور کراچی شفٹ ہوئے ہوں گے' وہاں اس کے بڑے بھائی اور بھابی رہتے ہیں نا۔"

"تمہیں پتا ہے' وہ کس جگہ رہتے ہیں۔"

"نہیں ...... اتنا تو کبھی میں نے پوچھا نہیں تھا مگر میں انہیں ڈھونڈ لوں گی۔" اس کی آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔ "بس ایک بار وہ مجھے مل جائے میں اس کے پیر پکڑ لوں گی۔ اس سے کہوں گی وہ مجھ سے سب کچھ لے لے مگر بس ایک عادل مجھے دے دے۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو زیب! کراچی چھوٹا شہر نہیں ہے۔ کہاں تلاش کرو گی انسانوں کے جنگل میں محض ایک شخص کو۔"

"امی! میں ڈھونڈ لوں گی اسے۔"

"بس کرو زیب! انہونی باتیں مت کرو۔" انہوں نے سخت لہجے میں کہا درحقیقت وہ ڈر گئی تھیں۔

"آپ نہیں چاہتیں نا کہ عادل میرے پاس آئے آپ سب ہمیشہ سے چاہتے تھے کہ وہ چلا جائے۔" اس کا چہرہ پتھرا گیا تھا۔

"زیب! ایسی بات نہیں ہے۔"

"ایسی بات ہے امی! آپ نے وحید کو یہاں آنے سے کبھی نہیں روکا' آپ چاہتی تھیں کہ وہ میرے بیٹے کو یہاں سے لے جائے آپ......"

"زیب......!" انہوں نے کہنا چاہا۔

"آپ سمجھتی تھیں۔ وہ میری شادی کی راہ میں رکاوٹ ہے' میری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ ہے اور وہ آپ کا چہیتا صفدر یہی چاہتا تھا نا کہ عادل یہاں آپ کے پاس رہے اس کے گھر میں میرے بیٹے کے لئے اتنی سی جگہ بھی نہ تھی تو آپ کے تو حسب خواہش ہوا نا سب کچھ اس کی راہ کا کانٹا ہٹ گیا۔ یہ بھی نہیں سوچا آپ نے کہ میری ساری خوشیاں میرے بیٹے سے وابستہ تھیں میں اس کے بغیر ایک پل کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

وہ چیختے چیختے بے حال ہو گئی تو اندر بھاگ گئی۔ اس کا بدگمان زہر آلود لہجہ انہیں اندر تک کاٹتا چلا گیا۔ ان کے وجود کو دولخت کر گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے خشک آنکھوں کے ساتھ لمبے لمبے سانس لیتی رہیں۔ تن پژمردہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود کو سنبھال کر روتی سسکتی بیٹی کو سنبھالتیں یا اس کی بدگمانی دور کرتیں۔

* * *

وہ کب سے چارپائی پر اوندھا لیٹا زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ دھوپ نے پوری چارپائی کے گرد حصار باندھ رکھا تھا۔ اس زرد چمکیلی دھوپ میں اب اتنی شدت تھی کہ جسم و جاں میں چبھنے لگی تھی مگر وہ یوں ہی کسل مندی سے پڑا تھا۔ بعض لفظ' بعض جملوں اور بعض لمحوں کی چبھن اس سے کہیں زیادہ تھی۔

وہ جانتا تھا۔ وقت گزر گیا ہے اور اس مادہ پرست زمانے نے خلوص' وفا مروت اور سب سے بڑھ کر محبت جیسے جذبے کو بھی وقت کے ہاتھوں رہن رکھ دیا ہے اور بے مہر وقت پر کیا الزام دھرنا کہ وہ تو سب کچھ اپنی زنبیل میں ڈالے چلتا بنے گا۔ پر اسے یقین سا تھا یہ سب کھو بھی جائے تب بھی ختم نہیں ہو سکتا۔

لیکن آج صفدر کی آنکھوں میں ابھرتی اس کے لئے استہزائیہ چمک اس کے بے ریا' پر خلوص دل میں دکھ کے بیج بوتی چلی گئی اور اب اس خزاں کی زرد چمکیلی جسم و جاں میں اترتی دھوپ سے بے نیاز زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"ہم جیسے لوگوں کو محبت کرنی ہی نہیں چاہئے۔"

وسیم پینٹ کے پائنچے چڑھا کر اپنی سائیکل دھونے میں مصروف تھا۔ اس نے کئی بار پلٹ کر دیکھا۔ وہ بے وقت گھر میں موجود تھا اور تب سے یوں ہی پڑا تھا۔ آپا جب بھی اسے دیکھتیں آنکھوں میں تشویش اترنے لگتی۔ کچھ زیادہ شوخ تو وہ پہلے بھی نہ تھا۔ کل سے بالکل ہی چپ ہو گیا تھا۔ ان کی سوچوں کا تار دھاگے کے ساتھ ہی ٹوٹا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر وسیم کو دیکھا۔ اس کی سائیکل چمک چکی تھی اور وہ خود تولیہ کندھے پر لٹکائے نکلا چلا رہا تھا۔

"وسیم! ذرا دکان سے ریل تو لا دو۔ دھاگا ختم ہو گیا ہے۔" انہوں نے پکار کر کہا۔

"امی! ٹیوشن سے لیٹ ہو رہا ہوں میں اور ابھی نہانا بھی ہے۔" اس نے رکتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔

"اچھا......" وہ کچھ سوچ میں پڑی تھیں۔ گڑیا بول اٹھی۔

"امی! میں لا دوں۔"

"ہاں' تم لا دو......" انہوں نے متعلقہ کپڑے کی کترن اور پیسے اسے تھمائے' وہ بھاگ لی۔

وسیم نہانے گھس گیا تھا۔ کام تو رک ہی گیا تھا۔ وہ طارق کے پاس آ گئیں۔

"طارق!"

طارق نے سنا نہیں یا سنی ان سنی کر گیا۔

"طارق ......! ایسے کیوں پڑے ہو؟" انہوں نے جھک کر کندھا ہلایا۔

"یونہی آپا! سستی سی ہو رہی ہے۔" وہ کسل مندی سے کروٹ بدل کر سیدھا ہوا پھر انہیں بیٹھنے پر آمادہ دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ انگلیوں کی قینچی بنا کر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ لیے۔ سرمئی ملگجے سے شلوار قمیص میں بے ترتیب بالوں کے ساتھ وہ کچھ الجھا الجھا سا لگا۔

"ہاں موسم بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" آپا نے پیار سے اس کی پیشانی پر بکھرے بال انگلیوں سے سلجھائے۔

"پتا نہیں، کب بہار آئے گی۔" اس نے امرود کے ٹنڈ منڈ پیڑ اور کیاریوں میں بکھرے زرد وخشک پتوں پر بیزار سی نگاہ دوڑائی۔

"بہار تو آسکتی ہے مگر......" آپا مبہم سا مسکرائیں۔

"چھوڑیں آپا! کہاں کی بہار، کیسی بہار، غریبوں کے گھر میں بہار آئے بھی تو کہاں ٹھہرتی ہے۔"

"کیوں موسموں پر بھی ٹیکس لگ گیا ہے کیا؟" آپا نے ہنس کر چھیڑا، اس کے ہونٹوں کی تراش میں ذرا سی مسکراہٹ جاگی۔

رتوں پر بس نہ چلا ورنہ یہ جہاں والے
بہار بیچتے، نیلام رنگ و بو کرتے

"اچھا اب تمہیں شعر بھی یاد ہونے لگے ہیں۔" انہوں نے اپنے لہجے کی شوخی میں شعر کا مفہوم اڑا دیا۔ طارق جھینپ گیا۔

"میں تو اس بہار کی بات کر رہی ہوں جو تمہارے دل میں جاگی ہے اور اسے اب اس گھر میں آجانا چاہئے۔ دیکھتے نہیں، کیسا خزاں زدہ سا لگنے لگا ہے، یہ گھر، زیب آجائے تو......"

"آپا......! آپ لوگوں نے کتنی آسانی سے اسے اپنی زندگی اور اس گھر میں شامل کرلیا، ضروری تو نہیں وہ میرا نصیب ہو۔" وہ ذرا سا جھنجلایا۔

"کیسی بات کر رہے ہو بیٹا۔" آپا نے تحیر سے اسے دیکھا۔ "ہم نے اسے تمہاری خوشی صرف اور صرف تمہاری خوشی جان کر قبول کیا ہے اور تم......"

"آپا! ضروری تو نہیں، جو میں سوچ رہا ہوں وہ ہو بھی جائے۔"

"کیوں اب کیا ہوگیا ہے۔؟" آپا نے دھیان سے اس کا چہرہ کھوجا۔

"ہے ہی کیا میرے پاس آپا! نہ تعلیم نہ معاشرے میں کوئی اعلیٰ مقام، ہوں کیا میں؟ محض ایک ویگن ڈرائیور جو دو وقت کی روٹی کیلئے صبح تا شام سواریوں کی چخ چخ سنتا ہے۔"

وہ اٹھ کر جانے لگا تھا جب آپا نے اس کا بازو پکڑ کر روکا، پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"یہ احساس کمتری کیسے جاگا تمہارے اندر؟" وہ نظریں چرا گیا۔ آپا اس کا چہرہ چھوڑ کر کھڑی ہوگئیں۔

"آج سے پہلے تو کبھی تمہیں احساس نہیں ہوا کہ تم محض ایک ڈرائیور ہو کیا زیب کی تعلیم تم سے زیادہ ہے اس لئے۔"

"آپا ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر کیا کمی ہے تم میں، خوبصورت ہو، کنوارے ہو، برسرروزگار ہو، ٹھیک ٹھاک کماتے ہو، یہ گھر، ابا کی دکان سب تمہاری ملکیت ہے کہ مجھے اور میرے بچوں کو تو کچھ بھی نہیں چاہئے ہم سب نے تم سے تمہاری ہمت اور اپنے حق سے بھی زیادہ لیا ہے۔"

"آپا! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟" وہ بے تاب سا ہو کر کھڑا ہوگیا۔

"اور کیا میں تمہیں بتاؤں کہ ہمارے خاندان میں کن کن بیٹیوں کی مائیں تم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے گھر جاتے ہو تو کیوں وہ تمہارے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ اس لئے کہ محبت، شرافت اور کردار بھی کوئی چیز ہے اگر انہیں معلوم ہو جائے تم نے ایک بچے کی ماں، مطلقہ اور عام شکل وصورت کی لڑکی کو پسند کیا ہے تو وہ کیا کیا باتیں کریں گے۔"

"آپا! بس کریں اب۔"

"ہم نے صرف تمہاری محبت اور تمہاری خوشی کی خاطر یہ روایتی اعتراض نہیں کیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہماری خواہش اور چاہتوں کے برعکس اور ان سے بالاتر کچھ باتیں اور کچھ فیصلے ہوتے ہیں لیکن اگر تم یہ سوچو کہ وہ لوگ تمہیں محض اس بناء پر انکار کریں گے کہ تم اک ڈرائیور ہو تو یہ تمہاری بھول ہے اور پھر اس دنیا میں کون ہے جو پرائی اولاد کو قبول کرنے پر تیار ہو جائے۔"

"آپا!" طارق نے ایک بازو ان کے کندھے کے گرد پھیلا کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "آپ تو سچ مچ جذباتی ہوگئیں۔"

"تم نے بات ہی ایسی کی مجھے سچ مچ غصہ آگیا اور ابھی اترا نہیں ہے اس لئے بس اتنا بتا دو کہ ہم زیب کے گھر کب جائیں، اب تو وہ سنبھل گئی ہوگی۔"

"آپا اتنی جلدی کیا ہے؟"

آپا نے جھٹکے سے اس کا بازو کندھے سے ہٹایا اور جا کر مشین کے پاس بیٹھ گئیں۔

"یہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔" ان کا چہرہ شدید ناراضگی کا عنوان بن گیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے" وہ ان کے پاس آکر دوستانہ لہجہ میں بولا۔ "لے جاؤں گا کسی دن۔"

"لیکن اب جلدی کرنا۔" آپا نے کہا تھا وہ اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

* * *

گھر میں داخل ہوتے ہی وحید کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ بدزبان و بدتہذیب بیوی ایک عذاب کی طرح اس پر مسلط ہوگئی تھی۔ البتہ اماں بہت خوش تھیں' وہ بالکل ان جیسی جو تھی۔ پھوہڑ، ان پڑھ اور بدسلیقہ' اماں کے ساتھ اس کی بنتی بھی بہت تھی۔ اماں سارا دن اس کے ساتھ مل کر باقی دونوں بہوؤں کی برائیاں کرتی' ایک لڑ جھگڑ کر الگ ہوگئی تھی۔ دوسری ان کے ساتھ رہتی پر اس نے یہی سیکھا تھا کہ اس گھر میں معصوم اور بے زبان لوگوں کی کوئی قدر نہیں۔ اس نے زیب سے خاصا سبق سیکھا تھا۔ خود سے کچھ نہ کرتی پر اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی تھی اماں کو اس سے بھی چڑ تھی ایک تو بہو نے بیٹے کو سب سے پہلے قابو کیا پھر وہ زیب جیسی بے وقوف بھی نہ تھی۔ سمجھتی تھی کہاں موم ہونا ہے کہاں پتھر کی طرح برس جانا ہے۔

زیب ان کیلئے سب سے آسان ہدف ثابت ہوئی تھی۔ اس کی ساری تعلیم اماں کی چالبازیوں کے سامنے ٹھس ہو کر رہ گئی۔ وہ یوں بھی اماں کی ناپسندیدہ بہو تھی وجہ بس یہی کہ وہ انہیں ہر لحاظ سے اپنے سے بہتر لگتی۔ ایک پڑھی لکھی' شائستہ اطوار والی' بااعتماد لڑکی انہیں احساس کمتری میں مبتلا کرتی تھی۔

وحید کو اب زیب یاد آتی۔ وہ کتنی سلجھی ہوئی اور نرم خو تھی اور یہ عورت جمیلہ اس کی زبان پر کانٹے اگے تھے۔

آج بھی گھر کا وہی منظر تھا جو تھکے ہارے اعصاب کو کوفت میں مبتلا کر گیا۔ عادل کے رونے کی آواز ہتھوڑے کی طرح اس کے اعصاب پر برسی' وہ پلنگ سے نیچے پڑا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ رو رو کر اس کا گلا بیٹھ گیا پر وہ پھر بھی روئے جا رہا تھا۔ وحید نے دیکھا پلنگ پر بیٹھی اماں آرام سے پان چبا رہی تھیں۔ ان کے پاس جمیلہ بال سنوارنے میں مشغول تھی۔ وحید غصے میں ابلنے لگا تھا۔ پر ضبط کر کے عادل کو اٹھانے کو جھکا۔

"کیا ہوا اسے۔" وہ وحید کے ہاتھوں سے پھسل پھسل گیا۔

"خدا جانے ماں کی طرح رونے کی عادت پڑی ہے اسے" جمیلہ تنفر بھرے لہجے میں بولی تھی۔

"بکواس بند کرو تم۔" وحید پھٹ ہی تو پڑا' جمیلہ بھونچکی رہ گئی۔ اماں وحید کے تیور دیکھ کر تیزی سے سیدھی ہوئیں۔ وحید نے عادل کو بہلانے کی کوشش کی۔ پر وہ تو یوں مچل مچل کر رو رہا تھا

جیسے کہہ رہا ہو مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔

"کیا ہو گیا اسے؟" وہ قدرے پریشان ہوا۔

"مجھے تو لگتا ہے اس کے پیٹ میں درد ہے۔" اماں بولیں' وحید نے کڑے تیوروں سے انہیں دیکھا۔

"تو اماں دو قدم آگے ہو کر دیکھ ہی لیتیں۔ اس طرح تو کوئی جانور کے بچے کو بھی نہیں پھینکتا۔" وہ نجانے کب سے رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

"کیسے بول رہے ہو مجھ بوڑھی جان میں اتنی ہمت ہے کہ اس عمر میں بچے سنبھالوں۔"

"نہیں سنبھالے جاتے تو تب کیوں بڑھ بڑھ کر بولتی تھیں اماں کہ جاؤ اسے لے آؤ' تمہاری اولاد غیروں کے در پر رل رہی ہے۔ تب یہ حال تھا کہ عادل کیلئے محبت چھٹی پڑ رہی تھی اور اب کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ بھوکا پیاسا ہے' اسے نہلانا ہے یا کپڑے بھی بدلوانے ہیں۔ یاد رکھنا اماں یہی حال رہا تو چھوڑ آؤں گا اسے پھر مت کہنا مجھے۔" وہ غصے میں دھاڑا تھا۔

"اے ہے' تو مجھے کاہے کو کہہ رہے ہو۔" اماں بوکھلائیں۔

"تو اور کسے کہوں' تمہاری یہ چہیتی۔" اس نے خون آشام نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔ "خود کچھ نہیں کر سکتیں تو اس کو ہی بول دیا کرو' یا یہ صرف آرام کرنے آئی ہے اس گھر میں۔"

"میں کیوں کروں؟" جمیلہ تڑخ کر بولی "اس کی ماں کی نوکر ہوں یا مجھ سے پوچھ کر لائے تھے اس کو۔ میری بلا سے کل کے چھوڑتے آج چھوڑ آؤ' مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔"

"تم سے کوئی گدھا ہی امید رکھے گا۔" وہ پھنکار کر پلٹا' دیکھا تو عادل کے کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے' ہاتھ پاؤں مٹی سے لتھڑے ہوئے' چہرے پر آنسوؤں نے نقش و نگار بنائے ہوئے تھے۔

"اس کے ہاتھ پاؤں تو دھلا دو' ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔" اس نے پلٹ کر جمیلہ کو دیکھا۔

"اس کی ماں سے کہو' آکر دھو دے۔" وہ کہہ کر اندر چلی گئی بیٹے کا چہرہ دیکھ کر اماں اٹھی۔ پر وہ اپنا سارا غصہ دروازے پر اتار کر چلا گیا تھا۔

کلینک میں اگرچہ خاصا رش تھا مگر عادل نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھایا یا تھا' اسی لئے ڈاکٹر پہلے عادل ہی کی طرف متوجہ ہوا پھر اس کی حالت دیکھ کر وحید پر ہی برس پڑا۔

"بچے کی حالت دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ اس کے ہاتھ پاؤں ملاحظہ کریں مٹی سے لتھڑے ہوئے ہیں' منہ تک مٹی سے بھرا ہوا ہے' یہ آپ کا بچہ ہے" برستے ہوئے ڈاکٹر نے اچانک پوچھا۔

"جی ......!" وہ نظریں جھکا کر شرمندگی سے گویا ہوا۔

"شکل و صورت سے لگتا ہے آپ اتنے پڑھے لکھے تو ہوں گے کہ صحت و صفائی کی اہمیت سے آگاہ ہوں اور آپ کی بیوی کیا اتنی جاہل ہیں کہ۔"

اب وہ کیا بتاتا کہ اس کی بیوی اتنی سے بھی زیادہ جاہل ہے۔ ڈاکٹر جو کچھ کہہ رہا تھا یہ سننا وحید کی مجبوری تھی۔ سو وہ سر جھکا کر سنتا رہا۔ ڈاکٹر نے عادل کا تفصیلی معائنہ کیا۔ منہ میں چند قطرے ٹپکائے اور ساتھ تین چار سیرپ پکڑا دیئے۔ انہیں قطروں کا اثر تھا کہ گھر پہنچنے تک وہ پرسکون ہو کر اس کے کندھے کے ساتھ لگا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ یہ انگوٹھا چوسنے کی عادت بھی اسے یہیں آکر پڑی تھی۔ گھر آکر وہ بیوی سے زیادہ ماں پر برسا تھا۔

"آپ کو بے چینی تھی اماں! عادل کو یہاں لانے کی۔ اب میں نے عادل کو اس حالت میں دیکھا تو خدا کی قسم میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

اس نے حتمی لہجے میں دھمکی دی تھی۔

* * *

"چلو بھائی جی ......" کنڈیکٹر نے دروازے پر ہاتھ مار کر کہا' طارق دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وین فل ہو چکی تھی اور اس کی چھت سبزیوں اور پھلوں سے لدگئی تھی۔

"کیا وہ آج بھی نہیں آئی۔" طارق نے تفکر سے سوچا جب کہ اس کی سیٹ ابھی بھی خالی تھی۔ تب ہی طارق کی نظر ایک طرف اٹھی۔ وہ سیاہ چادر میں لپٹی سارے جہان سے بے خبر وین کے انتظار میں کھڑی جوتے کی نوک سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی اور اتنی بے خبر تھی کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی' کب ویگن آکر بھر بھی گئی تھی۔ اس کے پاس سبزی کا ڈھیر لگا تھا جس پر پانی چھڑکتا دکاندار کبھی کبھی چور سی نظر اس پر بھی ڈال لیتا تھا۔

"زیب!" طارق نے پاس جا کر پکارا' اس کے پاؤں کی حرکت رک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر پکارنے والے کو دیکھا۔

"وین چلنے والی ہے" طارق نے مسکرا کر اطلاع دی۔ سبزیوں پر پانی چھڑکتا دکاندار معنی خیزی سے کھنکھارا' طارق نے سنجیدہ سی نظر اس پر ڈالی۔ وہ جھینپ کر اپنے کام میں مصروف ہوا۔

"مجھے خیال نہیں رہا۔" زیب نے بھری وین پر نگاہ دوڑائی۔

"آجائیں! آپ کی سیٹ خالی ہے۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا' پسنجر سیٹ پر کنڈیکٹر نے ایک بوڑھی اماں کو بٹھا دیا تھا بہر حال اتنی گنجائش تو تھی کہ وہ بیٹھ جاتی' پیچھے بھری اور لدی ہوئی وین میں بیٹھنے سے زیادہ تر خواتین آگے کی دو سیٹوں پر بیٹھنے کو ترجیح دیتی

تھیں۔ زیب بھی بیٹھ گئی' وین ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تھی۔ وہ بوڑھی اماں 44 چک کے کھیتوں کے بیچ سے جھانکتے سنسان اور ویران راستے پر اتری تھیں۔ طارق نے دیکھا وہ معمول سے زیادہ الجھی ہوئی اور پریشان حال نظر آرہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ آپ زیادہ پریشان لگ رہی ہیں۔"

اس کے محتاط اور اپنائیت بھرے لہجے پر زیب نے ذرا کی ذرا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

"کچھ خاص بات نہیں۔"

"کچھ خاص ہے یا نہیں مگر کچھ ایسا ضرور ہے جس نے آپ کو پھر سے مضطرب کر دیا ہے۔"

طارق کی نظریں ونڈ اسکرین پر جمی تھیں۔ بس ایک پہلی نظر میں وہ اس کا چہرہ پڑھ گیا تھا

"ثوبیہ ہوتی تو شاید آپ اس سے کہہ لیتیں' میں شاید اس قابل نہیں کہ ......" زیب کی خاموشی پر اس کے اندر کا احساس کمتری مایوسی بن کر اس کے چہرے پر چھا گیا تھا۔

"کچھ دنوں سے بہت عجیب و غریب خواب آرہے ہیں مجھے۔" وہ پیچھے کی طرف بھاگتی درختوں کی قطار دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کا مضمحل و مغموم لہجہ طارق کو تڑپا گیا۔

"خواب تو خواب ہوتے ہیں ان سے کیا ڈرنا یا گھبرانا' اور ہر خواب کی قسمت میں تعبیر ہونا تو نہیں لکھا ہوتا۔" وہ سادہ و عام سے لہجے میں بولا تھا۔

"طارق! میں کراچی جانا چاہتی ہوں۔"

"کراچی؟ مگر کیوں؟"

"تم میرے ساتھ چلو گے؟" وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے اچانک پوچھنے لگی۔ طارق بری طرح ٹھٹکا۔

"آپ نے گھر میں بات کی۔" زیب کی بے تابانہ سی کیفیت کو مدنظر رکھ کر اس نے محتاط سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں کی تھی۔" وہ گود میں دھرے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے مایوسی سے بولی۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"ان کے خیال میں ...... میں پاگل ہو گئی ہوں۔" اس کے حد درجہ مایوس کن لہجے پر طارق نے ایک نظر اس کے زرد ویران چہرے پر ڈالی۔ آج پھر اس کی آنکھوں میں اولین دنوں والا غائب دماغی محسوس ہو رہی تھی۔

"تم ...... تم ...... چلو گے طارق میرے ساتھ؟" اسے شاید خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ کیسے جاسکتا ہوں" موڑ کاٹتے ہوئے طارق نے اسے آہستگی سے حقیقت حال سے روشناس کرایا۔

"کیوں تم ......" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے نجانے کیا کہنے والی تھی کہ ایک دم کچھ یاد آنے پر سر جھکا کر مایوسی سے بولی۔

"ہاں تم کیسے جاسکتے ہو میرے ساتھ۔"

طارق نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس سے پہلے ہی بول اٹھی۔

"تم بھی سوچتے ہوگے' کبھی کبھی میں کیسی عجیب سی باتیں کرنے لگتی ہوں۔" وہ پیشانی مسلتے ہوئے پریشان سے انداز میں مسکرائی۔

"میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔" طارق نے گاڑی روکتے ہوئے کہا موڑ پر بیٹھے دو تین مسافر لپک کر وین میں سوار ہوئے تھے۔ زیب نے غور سے طارق کو دیکھا پھر سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

"اس دن صفدر بھائی نے تم سے عجیب سے لہجے میں بات کی تھی معاف کرنا طارق وہ ایسے ہی ہیں' ہر چیز پر اپنی ملکیت جتانے والے اور ہم پر تو بہت احسان ہیں ان کے پر تم بھی سوچتے ہو گے۔"

"زیب جی! میں نے کچھ نہیں سوچا تھا۔"

طارق نے مضبوط لہجے میں کہا' وہ ایک بار پھر بے خیالی میں اس کے چہرے پر نظریں جما گئی تھی۔

* * *

مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ وہ نیچے اتر آئی۔ صفدر بھائی امی کے پاس بیٹھے تھے۔ زیب کا دل ان کے پاس رکنے اور بات کرنے پر آمادہ نہ ہوا تھا مگر انہوں نے خود ہی پکار لیا۔ وہ آئے بھی بہت دنوں بعد تھے۔

"کیسی ہو زیب؟"

"ٹھیک ہوں" زیب کے ہونٹ قصداً بھی مسکرا نہ سکے۔ جانے کیوں وہ ان سے بیزار ہوگئی تھی۔ اور مزید کوئی بات سنے بغیر وضو کرنے چلی گئی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے اسے؟" صفدر نے اس کی بیزاری پوری طرح محسوس کی تھی۔

"تمہیں تو پتا ہے بیٹا۔" امی دبے دبے لہجے میں بولیں۔ "مصروف ہوگئی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اسکول نہیں آتی اب۔"

"سالانہ امتحان ہوگئے ہیں اب تو دس پندرہ چھٹیاں ہیں۔ اس کی ساتھی استانیاں بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اسے روز آنے کی ضرورت نہیں بس رزلٹ بنا کر دے جائے۔"

انہوں نے تفصیل بتائی۔ صفدر سر ہلا کر کھڑے ہوگئے۔ نجانے اس کے اسکول نہ جانے کا سن کر انہوں نے سکون کا سانس کیوں لیا تھا۔

"خالہ! میں اب چلتا ہوں' کل امی آئیں گی آپ کی طرف۔"

انہوں نے چونک کر صفدر کو دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولیں۔

"اچھا بیٹا! میں انتظار کروں گی۔"

صفدر نے طائرانہ نظر وضو کرتی زیب پر ڈالی اور چلے گئے۔ امی نے دروازہ بند کیا اور کچن میں آگئیں۔ صفدر کے آنے سے قبل وہ دال چن رہی تھیں۔ دال کا تھال یوں ہی چولہے پر دھرا تھا۔

"چلے گئے صفدر بھائی۔" تخت پر جائے نماز بچھاتی زیب نے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے مختصراً کہا اور دال چڑھانے لگیں۔ ان کی نظریں نماز پڑھتی زیب کے گرد بھٹک رہی تھیں۔ اس حادثے سے قبل اس کی نماز میں اتنا خشوع وخضوع نہ تھا۔ اب تو سجدے میں جاتی تو سر نہ اٹھاتی۔ دعا مانگتی تو ہاتھ پھیلے ہوئے' لب بستہ' آنکھوں سے بہتے آنسو۔ سر اس کی بارگاہ میں جھک جھک جاتا۔

دال چڑھا کر وہ بھی وضو کرنے چل دیں۔ نماز پڑھ کر آئیں تو وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔

"ہٹو روٹی میں پکا دیتی ہوں۔"

"نہیں امی! میں پکا لوں گی۔" کئی مہینے بعد اس نے گھر کے کاموں کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ پیڑھی کھینچ کر وہیں بیٹھ گئیں اور دال کے لئے ہرا دھنیا کترنے لگیں۔ آٹا گوندھ لیا تھا۔ زیب نے توا چڑھا دیا اور پیڑا بنانے لگی۔

"کل تمہاری خالہ آرہی ہیں۔" امی نے بغیر اس کی طرف دیکھے اطلاع دی۔

"کیوں؟" وہ سپاٹ سے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"وہ چاہتی ہیں کہ اب بات طے ہو جائے۔" وہ زیب کے ردعمل سے خائف تھیں پھر بھی دل کڑا کر کے کہہ گئیں۔

"ہاں اب تو وہ آئیں گی۔ راستے کا کانٹا جو نکل گیا۔ وہ ننھا سا وجود آپ کی بہن اور

بھانجے کی آنکھوں میں کس طرح کھٹکتا تھا' کیا میں نہیں جانتی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی تھی۔

"زیب! بس کرو۔ خوامخواہ کی بدگمانی کو دل میں جگہ مت دو۔" انہوں نے فوراً ٹوکا۔

"خوامخواہ کیوں؟ امی! سچ سچ بتائیں۔ جب ایک دفعہ آپ نے کہا تھا کہ عادل کو آپ اپنے پاس رکھ لیں گی تو کیا یہ بات خالہ جان نے نہیں کی تھی؟"

"نہیں۔" وہ زیب کے تند و تیز لہجے کو نظر انداز کر کے آرام سے بولیں۔ عادل اب یہاں نہیں تھا اور وہ اس بنا پر زیب کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں یقین تھا صفدر زیب سے محبت کرتا ہے اور اسے یقیناً خوش رکھے گا اور اب وہ اسے کسی بیگانے کے حوالے نہیں کر سکتی تھیں کہ ایک دفعہ کا تجربہ ہی کافی تھا۔ وہ صفدر کو اچھی طرح جانتی اور سمجھتی تھیں۔ وہ یقیناً زیب کو خوش رکھے گا۔ بس ایک عادل کی پریشانی تھی۔ عادل چلا گیا۔ اس کا انہیں بھی دکھ تھا مگر اب وہ خودغرض بن کر بیٹی کا گھر پھر سے آباد کرنے کی سعی کر رہی تھیں۔

"مجھے یقین نہیں امی۔" زیب بے یقینی سے کہہ رہی تھی۔ "کیا میں نہیں دیکھتی رہی۔ خالہ اول تو آتی نہیں تھیں اگر آتیں تو انہوں نے کبھی عادل کو پیار تک نہیں کیا اور ان کے صاحبزادے ان کی محبت بھی بس زبانی کلامی تھی۔ اس کے برعکس طارق ......"

امی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ خود بھی خائف سی ہو کر لب کاٹنے لگی۔ اس موقع پر طارق کا نام نجانے کیوں اس کے لبوں پر آیا تھا۔

"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی۔" زیب نے سنبھل کر بات نبھانا چاہی۔

"روٹی ڈال دو۔ توا بہت گرم ہو گیا ہے۔"

امی سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر ہنڈیا میں دھنیا ڈالنے لگیں جبکہ زیب کے ہاتھ سست روی سے روٹی بیلنے لگے تھے۔ بات ادھوری رہ گئی مگر وہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔

* * *

"مجال ہے جو کبھی میں گھر آؤں تو یہ محترمہ گھر میں ملیں۔ اتنی بھی فکر نہیں ہوتی کہ شوہر تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے۔ اسے کھانے پانی کا بھی پوچھنا ہے۔ اس کے خیال میں تو شوہر اُلو کے پٹھے ہوتے ہیں۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ تھکے ہارے محنت مزدوری کر کے لوٹو تو آگے سے سارا گھر بھائیں بھائیں کرتا ملتا ہے۔"

وحید کا دماغ گھوم گیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی فائل اس نے پوری قوت سے پلنگ پر دے ماری تھی۔

"اور تو اور اماں بھی غائب ہیں۔ اب میں ہوا کھاؤں یا غصہ پیوں۔ اس کی بلا جانے۔ کچھ کہہ دو تو یوں فساد اٹھاتی ہے جیسے گلا دبا دیا ہو اس کا۔ بدزبان و بدعقل عورت۔ ایسا تنگ تو کبھی زیب نے بھی نہیں کیا تھا۔ زیب۔" وہ بری طرح چونکا۔

"آہ۔" وہ سر پکڑ کر چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اندر کہیں خسارے کا احساس سر اٹھا رہا تھا۔ "اتنی بری تو نہ تھی۔ پتا نہیں اماں کو کیوں ناپسند تھی اور میں ...... میں نے کیا کیا اس ہنستی کھلکھلاتی لڑکی کے ساتھ۔ شاید...... شاید اسی کی سزا ہے یہ جمیلہ۔"

جمیلہ کے نام پر اس کا حلق کڑوا ہو گیا تھا۔

"نہ ڈھنگ سے بات کرنے کی تمیز ہے اور نہ مرد کی عزت کی عادت۔ زیب نے تو کبھی اونچی آواز سے بات تک نہ کی تھی مجھ سے۔"

زیب کے نام کی تکرار کچھ زیادہ ہونے لگی تو وہ کھڑا ہو گیا۔ آج خلاف معمول عادل اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ نہ گھر کے کسی کونے سے اس کے رونے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"یا خدا! یہ خاموشی کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں۔"

وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔ سارا گھر خاموشی میں ڈوبا تھا۔ بس بھابی کے کمرے سے کچھ آوازیں اٹھ رہی تھیں۔

"بھابی!"

"عادل یہاں ہے؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تو اور کہاں جائے گا۔ تمہاری بیوی تو اسے ہاتھ تک لگانے کی روادار نہیں۔" بھابی چھوٹے کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ذرا تنک کر بولیں۔ انہیں یوں بھی اپنے اس دبو اور بزدل قسم کے دیور سے چڑ ہوتی جا رہی تھی۔ ایک تو وہ ماں کی بہت سنتا تھا۔ اسی لئے اپنا اچھا بھلا گھر برباد کر بیٹھا تھا۔ دوسرے وہ خود ماں تھیں۔ فطری طور پر عادل کیلئے ان کے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھرتے تھے۔ معصوم بچے کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا کم از کم ان کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ بڑے آرام سے جب بھی وحید ہتھے چڑھتا' اسے بے بھاؤ کی سنا جاتی تھیں۔ وحید شرمندہ شرمندہ سا عادل کے پاس آ بیٹھا جو انگوٹھا منہ میں لئے ٹکر ٹکر بھابی کے بچوں کو کھیلتے دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا یوں ہی چپ چپ اور خاموش رہتا تھا۔ وحید اسے گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگا۔

"کہاں گئی ہیں یہ اماں اور جمیلہ۔" اس نے بھابی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا کہ جواباً جن نظروں سے بھابی نے اس کو دیکھنا تھا وہ ان کی چبھن اچھی طرح جانتا تھا۔

"اماں تو محلے کے دورے پر نکلی ہیں اور جمیلہ بی بی کی چچی کی نند بیمار ہیں' ان کی تیمار داری

کو گئی ہیں میکے۔'' بھابی کے لہجے میں محسوس ہونے والا طنز تھا۔

''آج پکایا کیا ہے؟'' وہ سنی ان سنی کر کے بولا۔

''تم نے کھانا نہیں کھایا؟'' بھابی نے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں' ابھی تو آیا ہوں۔''

''میں لاتی ہوں۔'' انہوں نے چھوٹے کو پلنگ پر بٹھایا اور باہر نکلتے نکلتے بولیں۔ ''ہاں بھئی بیوی گھر میں ہو تو میاں کو چائے پانی کا پوچھے۔ یہاں تو اسے سیر سپاٹے سے فرصت نہیں۔ ویسے ایسی ڈھیل تم نے زیب کو تو کبھی نہ دی تھی۔''

وحید نے یہ طنز بھی بڑے صبر سے برداشت کیا اور آنکھوں پر بازو رکھ کر عادل کے پاس لیٹ گیا۔ عادل قمیض کے بٹنوں سے کھیلنے لگا۔ بھابی ذرا سی دیر میں کھانا لے آئیں۔ عادل کھانا دیکھ کر لپکا اور اس کے ہاتھ سے روٹی چھیننے لگا۔ وحید کے حلق میں نوالا اٹکنے لگا۔

بھابی نے پیار سے عادل کے سر ہاتھ پھیرا اور اس کے پاس بیٹھ کر ہمدردی سے بولیں۔

''تم اپنی بیوی کو سمجھاتے کیوں نہیں ہو وحید۔''

''کیا سمجھاؤں بھابی!'' وحید نے نوالہ چھوڑ کر پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔

''مجھے بہت ترس آتا ہے اس بچے پر۔ اتنا ننھا سا تو ہے۔ ابھی تو اپنی کوئی ضرورت زبان سے بتا بھی نہیں سکتا اور سچ تو یہ ہے کہ ماں کے سوا کوئی ہے' جو اتنے سے بچے کی بات سمجھ سکے۔ تم سارا دن گھر سے باہر ہوتے ہو۔ یہ یوں لاوارثوں کی طرح ادھر ادھر پڑا ہوتا ہے۔ بچہ ہے' ابھی تو پاؤں پاؤں چلنا بھی نہیں سیکھا اس نے کہ جمیلہ کو اس سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ اماں کا دل چاہے تو دیکھ لیں ورنہ پڑا رہے یہاں وہاں۔ میں سوچتی ہوں کل کو جمیلہ کے بچے ہو گئے' تب اس معصوم کا کیا بنے گا۔ نہ تعلیم' نہ تربیت' اس طرح تو یتیم بھی نہیں پلتے۔''

''میں کیا کروں بھابی! میں جتنا اس عورت کو سمجھانے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی ناسمجھی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ غصہ دکھاؤ تو مزید ضد میں آ جاتی ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''سب اماں کی شہ ہے۔'' بھابی نے فٹ کہا۔

''ہاں اماں خوش ہو گئیں اس جاہل اور کم عقل عورت کو میرے پلے باندھ کر۔''

''اماں کی تو لاڈلی بھانجی ہے۔''

''زندگی تو میری برباد ہوئی۔ نہ اسے بولنے کا سلیقہ ہے' نہ پہننے اوڑھنے کا۔ بات کرے تو لگتا ہے انگارے چبا رہی ہے یا زبان پر کانٹے اگے ہیں۔'' وہ کھانا بھول کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا تھا۔

''سچ تو یہ ہے وحید! کہ زندگی تم نے خود برباد کر لی اپنی۔ میں تو کبھی زیب سے ڈھنگ ... ہی نہیں کہ بس کھڑے کھڑے جانا ہوتا تھا۔ پر تمہارے بھائی جب بھی آئے انہوں نے تعریف ہی کی اس کی۔ پر تم نے اماں کی باتوں میں آ کر اپنا گھر برباد کر لیا۔ اماں تو شروع سے زیب کے ... تھیں۔ وہ تو تمہارے بھائی اور ابا نے سوچا کہ پڑھی لکھی لڑکی گھر آئے گی تو تمہاری اولاد ... جائے گی۔ پر تم ...... تم نے سخت عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیا۔ اب وہ دیکھے کہ اس کی اولاد رل رہی ہے تو جیتے جی مر جائے۔ خیر جی تو اب بھی کہاں رہی ہو گی بیچاری۔ اولاد کی جدائی ... جی مار دیتی ہے۔ بڑا ظلم کیا تم نے وحید اور اگر لانا ہی تھا تو پہلے اپنی بیوی کو تو اعتماد میں ... بات کرتے کرتے اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

''میں کب لانا چاہتا تھا عادل کو۔ وہ تو اماں نے کچھ یوں آفت مچائی کہ......'' وہ شرمندہ ...رمندہ سے لہجے میں بولا تھا۔

''اماں کی خوب کہی۔ اس کو تو عادت ہے ذرا سی بات کو آسمان تک لے جانے کی اور تم ...ں کی طرح آ گئے اس کی باتوں میں۔'' بھابی کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور ...تیں باہر سے جمیلہ کے بولنے کی آواز آنے لگی۔

''لو آ گئی اماں کی چہیتی۔'' بھابی نے کہا اور چھوٹے کو اٹھا کر کرسی پر جا بیٹھیں۔ وحید تڑپ ...کر کھڑا ہو گیا۔

''کھانا تو کھا لو۔'' اسے یوں ہی اٹھتے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

''اب بھوک نہیں رہی۔''

بھابی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ جانتی تھیں کہ اب باہر زبردست معرکہ ہونے والا تھا اور ...فائر کیلئے اماں بھی موجود نہ تھیں۔

* * *

عادل مختلف چیزوں کا سہارا لے کر قدم اٹھانے لگا تھا۔ کبھی گر جاتا تو کوئی ہاتھ تھامنے کو ...گے نہ بڑھتا۔ وہ پھر سے پلنگ' چارپائی کا سہارا لے کر چلنے لگتا۔ چلنا اس کے لئے ایک نئی بات ...ی۔ قدم بڑھانا اک نیا تجربہ۔

وہ یوں ہی کمرے میں جا گھسا تھا' گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے پھر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کا ...ارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ دراز کھلی تھی۔ اس کو نجانے کس چیز کی تلاش تھی یا وہی معصومانہ سا تجسس ...نے ساری چیزیں کھینچ کھینچ کر باہر نکال دیں۔ گلابی نیل پالش کو وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ...ی جمیلہ اندر آئی۔ وہ معصوم اسے دیکھ کر گھبرایا تھا یا یوں ہی ہاتھ سے نیل پالش کی شیشی کھسک

کرتوتی تھی۔

''ہائے ہائے کیا مصیبت ہے۔'' وہ اس پر جھپٹی اور بازو سے گھسیٹتے ہوئے باہر لائی۔ ماں سے نجانے کس بات پر الجھ رہا تھا۔ جمیلہ نے عادل کو اس کے پاس پٹخا۔ نجانے وہ کس رخ سے گرا تھا کہ حلق سے چیخیں نکل گئیں۔

''سنبھالو اس شیطان کی اولاد کو۔ میری جان کا عذاب۔''

الٹے ہاتھ کا تھپڑ پڑا تھا اس کے منہ پر۔

''الو کی پٹھی' اتنے چھوٹے بچوں کو یوں اٹھاتے ہیں' اس کا بازو نکل جاتا تو۔''

''تم......تم نے مجھے مارا۔'' جمیلہ کی آنکھوں سے شرارے لپکنے لگے۔

''اے ہے بیٹا! یہ کیا کیا؟'' اماں نے بھی دہائی دی۔

''تو کیا کروں۔ جتنا بھی ڈھیل دے رہا ہوں اتنا ہی سر پہ چڑھتی آ رہی ہے۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔ ''دیکھا نہیں کس طرح پٹخا ہے اس نے عادل کو۔'' وہ روتے بلکتے عادل کو اٹھانے جھکا۔

''تم نے اس دو چھٹانک کے چھوکرے کی خاطر مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ جب سے یہ آیا ہے۔'' وہ عادل پر جھپٹی تھی۔ وحید نے اسے بازو سے روک کر پیچھے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی پھر نہ تو اس کی زبان رکی اور نہ وحید کا ہاتھ۔ دونوں طرف بہت دنوں کا رکا ہوا غبار تھا' جو کسی نہ کسی طرح تو نکلنا تھا۔

''رکو تو' وحید پتر! کیا کرتے ہو۔ ارے چھوڑ دو اس کو۔'' اماں دونوں کے درمیان آئیں۔

''تو ٹھیک ہے سنبھالو اس کو۔ آئندہ اس نے میرے سامنے زبان چلائی یا عادل کو ہاتھ لگایا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔ طلاق دے دوں گا۔''

''ہاں...... ہاں دے دو طلاق۔ تمہیں تو عادت پڑی ہے ایک چھوڑ کر دوسری لانے کی۔'' وہ روتے روتے چلائی تھی۔ جواباً وہ دروازے توڑتا گھر سے ہی نکل گیا۔ دوڑتی بھاگتی ٹریفک' چلتی سڑکوں اور ویران جگہوں میں اس نے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''یہ میری سزا ہے۔'' مٹھیوں میں بال جکڑتے ہوئے وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا۔

''ہاں یہ سزا ہے۔'' اس نے خود سے اعتراف کیا۔ ''اس معصوم لڑکی کی زندگی برباد کرنے کی سزا۔ اس کے پاکیزہ کردار پر کیچڑ اچھالنے کی سزا۔ کیا کیا فرد جرم عائد کرو گے وحید الرحمٰن تم نے اس کی زندگی تو کیا اس کا دل بھی برباد کر دیا لیکن اب مزید نہیں۔''

اسے اچانک خیال آیا کہ وہ روتے بلکتے عادل کو یوں ہی چھوڑ آیا تھا۔ وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے آنسو پونچھ سکے یا کوئی شفیق ہاتھ اٹھا ہو گا اسے اپنی مہربان گود میں لینے کو۔

''شاید نہیں۔''

وہ گھر میں داخل ہوا۔ دل پر جیسے کوئی گھونسا پڑا تھا۔ عادل اسی جگہ پڑا تھا۔ شاید روتے روتے سو گیا تھا۔ دھوپ براہ راست اس کے کومل وجود کو جھلسا رہی تھی۔ اس نے بس نیکر ہی تو پہنی تھی۔ مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ اس کے قریب آیا اور پنجوں کے بل اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ عادل کی دبی دبی سسکیاں اس کے وجود پر کوڑے کی طرح برسیں۔ وہ سویا نہیں تھا۔ روتے روتے بے دم سا ہو کر سسکیاں بھر رہا تھا۔

''چاچی نے جاتے جاتے عادل کو بہت مارا اور گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے چاچا۔'' چھوٹے نے اطلاع دی۔ وحید نے لب بھینچ کر ضبط کیا۔ پر آنکھوں سے عرق ندامت بہنے لگا تھا۔ عادل کے چہرے اور پیٹھ پر انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔

''جن کے باپ مجھ جیسے ہوں' ان بچوں کا یہی حال ہوتا ہے۔''

بچہ سمجھ نہ پایا کہ اتنا بڑا ہو کر چاچا کیوں رو رہا تھا۔ وحید نے عادل کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اس نے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں کھول کر باپ کو دیکھا۔ اس کی بھیگی معصوم آنکھوں میں کچھ تو ایسا تھا کہ وہ جیتے جی مر گیا۔

''یہاں مارا تھا اس نے۔'' اس نے عادل کا سرخ گال چوما۔ عادل نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وحید نے جھپٹ کر اسے گود میں بھر لیا۔ وہ روتا جاتا تھا اور اسے چومتا جا رہا تھا۔

''چاچا! چاچا جی! کیا ہوا آپ کو؟'' چھوٹے وقاص نے آ کر اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ وحید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر عادل کو اٹھا کر نل کے پاس لے گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں' منہ دھلانے کے بعد اس نے عادل کو پلنگ پر بٹھایا اور اسے کپڑے پہنانے لگا۔ خوبصورت سی ٹوپی اوڑھا کر اس نے اٹھایا تو عادل نے اپنے بازو اس کے گلے میں حمائل کر کے اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا تھا۔

وحید نے بے اختیار اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

* * *

زیب نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

خزاں کی چادر اوڑھے سکھ چین کا درخت ٹنڈ منڈ کھڑا سرگوشی' بہار کا منتظر تھا۔ جو اس کے برہنہ وجود کو اپنی سبز چادر سے ڈھانپ دے۔ اس کے زرد و خشک پتے سرد و بے مہر ہوا کے سامنے بے دست و پا آنگن میں بکھرے تھے۔

پوری کائنات میں بہار اپنے رنگ بکھیر چکی تھی۔ پر اس کے آنگن میں خزاں ٹھہری سی گئی تھی۔

"ہاں کچھ لوگ ان ہی موسموں میں اور ان ہی موسموں کیلئے پیدا ہوتے ہیں۔"

زیب نے خالی نظریں اٹھا کر گرد آلود آسمان' بند دروازے اور ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھا۔

کوئی بوند' جو اس بنجر زمین کو سیراب کر دے۔

کوئی موہوم سی آہٹ' جو اس مضطرب دل کی ڈھارس بن جائے۔

کوئی ہلکی سی دستک' جو ان گونگی بہری ساعتوں میں آواز بن کر دھڑکے۔

کوئی سبز کونپل' جو بتائے کہ خزاں کبھی مستقل کہاں ٹھہری ہے۔

اس کی نگاہیں مایوس ہو کر پلٹ آئی تھیں۔

تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

اس دستک میں خوف تھا۔ جھجک اور گھبراہٹ۔

"ایسی آہٹیں تو ان خوش فہم ساعتوں نے کئی بار سنی ہیں۔"

دستک پھر ہوئی تھی۔

اس دستک میں اضطراب تھا' تیزی تھی۔

زیب کا دل نجانے کیوں ڈوب کر ابھرا۔ اس کے رکے رکے سے قدم دروازے تک گئے اور ٹھٹکے ٹھٹکے ہاتھوں نے ایک دم دروازہ پورا کھول دیا تھا۔ اس کی بے یقین نگاہیں سامنے کے منظر پر جم سی گئی تھیں۔

"زیب!" کسی نے پکارا تھا۔ اس کے ساکت وجود میں پھر بھی جنبش نہ ہوئی۔ وحید نے عادل کو دروازے کے پاس کھڑا کیا اور ایک نظر اس کے ساکت وصامت چہرے پر ڈالی۔

"ہو سکے تو معاف کر دینا اگرچہ اس قابل تو نہیں ہوں۔"

وہ چلا گیا تھا۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔

زیب نے گردن گھما کر دیکھا۔

یہ حقیقت ہے یا سراب۔

یقین ہے یا محض اک گمان۔

میرے خوابوں کا عکس ہے یا حقیقت۔

بے یقینی راستہ روکے کھڑی تھی۔

"امی!" عادل نے اس کا دامن تھام کر پکارا۔

بے یقینی کی دھند ایکدم ہٹی تھی۔ اس نے بے اختیار جھک کر اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ رو رہی تھی۔ عادل کو چوم رہی تھی اور چیخ چیخ کر امی کو پکار رہی تھی۔

اسے معلوم ہی نہ ہوا۔ سکھ چین کے پیڑ پر کب نئی کونپل پھوٹی تھی۔

* * *

خوشی اس کے دل پر بادل کی طرح برس گئی تھی۔

امی نے ڈھیروں مٹھائی منگوائی تھی۔ محلے دار' رشتے دار مبارکباد دینے آتے تھے۔ زیب مسرور سی ان کے درمیان عادل کو لیے بیٹھی رہتی اور مسرت بھاگ بھاگ کر چائے کے ساتھ سب کا منہ میٹھا کرواتی۔ عادل ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھتا رہتا۔ وہ اب تک سہما ہوا تھا۔

مسرت اپنے گھر گئی تھی۔ ثوبیہ حسب معمول اس کے پاس کچن میں آ بیٹھی۔ امی کے پاس محلے کی کوئی عورت آ بیٹھی تھی اور ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے وہ طارق اور عادل کو دیکھ سکتی تھی۔ عادل طارق کی گود میں بیٹھا تھا اور وہ بال پوائنٹ سے اس کے منے سے ہاتھ پر بیل بوٹے بناتے ہوئے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہا تھا۔ عادل متجسس انداز میں اپنے ہاتھ پر جھکا تھا۔

"پھر بہن! کیا سوچا تم نے زیب کے بارے میں؟" وہ عورت امی سے پوچھ رہی تھی۔

زیب کوفت زدہ سی ہو کر چائے پر جھک گئی۔

جس دن عادل گھر آیا۔ اسی دن شام کو ہی صفدر بھائی آ گئے تھے۔

"ارے یہ آ گیا۔"

ان کے لہجے پر زیب سٹپٹائی پھر کھلکھلا کر اس نے عادل کو اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔

"جی یہ آ گیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔"

"کون چھوڑنے آیا تھا؟" ان کا لہجہ سرسری ہوا۔

"وحید۔" زیب نے کہا پھر سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "آپ مجھے مبارکباد نہیں دیں گے صفدر بھائی؟"

"ہاں" وہ چونک پھر قصداً مسکرائے۔ "مبارک ہو۔"

درحقیقت تو وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ اب ماں کو کیا کہیں گے جو عادل کی غیر موجودگی کی بنا پر بخوشی مان گئی تھیں پھر وہ رکے نہیں' فوراً چلے گئے تھے۔

"خالہ کو بھی بتا دیجئے گا' وہ یقیناً بہت خوش ہوں گی۔" زیب نے مسکراہٹ لبوں میں دبائی مگر خالہ کو نہیں آنا تھا۔ وہ نہیں آئیں۔

آج اتفاقاً ثوبیہ اپنے گھر آئی تو زیب سے ملنے طارق کے ساتھ آ گئی تھی۔

عادل کو دیکھ کر ثوبیہ بھی ہکا بکا رہ گئی۔ طارق ایک ہی جست میں اس کے پاس آیا۔

"ارے عادل آ گیا۔" اس کے لہجے سے چھلکتی بے ساختہ خوشی کو محسوس کر کے زیب نے پلٹ کر ماں کو دیکھا۔ وہ مسکرا دیں۔ طارق نے عادل کو گود میں اٹھالیا اور عادل نے اس کی جیب سے چابیاں نکال لی تھیں۔ طارق خوشی سے نہال ہو گیا۔ وہ چھوٹا سا بچہ اسے بھولا نہیں تھا۔

"پھر تم نے کیا سوچا زیب؟" ثوبیہ نے چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"کس بارے میں؟" زیب چونکی۔

"اپنے اور عادل کے بارے میں۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔ لوگ جو ہیں ہمارے بارے میں سوچنے کو۔" اس کا اشارہ باہر بیٹھی عورت کی طرف تھا' جو اب بھی زیب کی شادی کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھی۔

"زیب! کیوں تنگ کرتی ہو اسے۔" ثوبیہ بے چارگی سے بولی۔

"کسے؟" زیب کی نظروں نے ڈرائنگ روم تک کا سفر کیا۔ وہاں کشتی کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ ثوبیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"زیب! مجھے نہیں پتا وہ تم سے کتنی محبت کرتا ہے' مگر مجھے اتنا پتا ہے کہ وہ صدیوں تمہارا انتظار کر سکتا ہے۔ مگر زیب! وہ تنہا تو نہیں ہے نا۔ اس معاشرے میں اگر پابند عورت ہے تو آزاد مرد بھی نہیں' اس کے گرد بہت سے لوگ ہیں جن کی محبتیں اس کے گرد حصار باندھے کھڑی ہیں۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہیں اور وہ تمہاری طرف دیکھتا ہے۔ وہ راستہ نہیں بدلے گا' مگر وہ ڈھیر ساری محبتیں اسے کمزور تو کر سکتی ہیں۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے ثوبیہ۔"

"اس کی محبت سے؟"

"اپنی بدنصیبی سے۔ کہیں میری بدنصیبی کا سایہ......"

"بے وقوف ہو تم۔ کوئی بھی انسان مکمل بدقسمت یا خوش قسمت نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی موسموں کی طرح ہوتی ہے اور موسم کبھی مستقل نہیں رہتے۔ غم کے بادل چھاتے ہیں تو خوشی کی کرنیں بھی رقصاں ہوتی ہیں۔ خزاں آتی ہے تو اس کے عقب سے کہیں بہار بھی جھانک رہی ہوتی ہے' تم قدم تو بڑھاؤ اس شخص کی خوش نصیبی تمہیں اپنے حصار میں لے لے گی۔" آخر میں ثوبیہ ہنسی تھی۔ زیب مسکرا دی۔

"تو پھر میں بات کروں؟"

ثوبیہ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات کرو گی۔"

"یہی کہ تم طارق سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" ثوبیہ کا لہجہ شوخ ہوا۔ زیب نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں طارق سے شادی کرنا چاہتی ہوں یا میں شادی کرنے کو تیار ہوں۔" ثوبیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر خفگی سے بولی۔

"میرا دماغ خراب تھا' جو میں اتنی دیر سے تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"کس نے کہا تھا سمجھانے کو۔"

زیب نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہاری اماں نے۔ ورنہ تم بچی نہیں ہو جو یہ نہ سمجھ پاؤ کہ اس معاشرے میں تنہا عورت کا رہنا سہل نہیں اور یہ کہ تمہاری پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزرے گی۔"

اس کے خفگی بھرے تلخ لہجے پر زیب بے اختیار ہنس دی۔

"اس وقت تم مجھے ہنستی ہوئی زہر لگ رہی ہو۔ میرا بھائی بے وقوف تھا جو تم جیسی لڑکی سے محبت کر بیٹھا۔" وہ چڑ کر بولی پھر سر جھٹک کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کر رہی کہ تم طارق ہی سے شادی کرو۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں زیب بی بی! کہ فیصلے کا بھی ایک لمحہ ہوتا ہے۔ وہ لمحہ کانچ کی طرح ہاتھ سے پھسل کر کرچی کرچی ہو گیا تو کبھی نہ جڑ پائے گا۔ اسے غنیمت سمجھو کہ تمہارا ہاتھ تھامنے والے موجود ہیں۔ میری بلا سے تم کسی سے بھی شادی کرو۔" آخر میں اسے مسکراتا دیکھ کر وہ جل کر بولی تھی۔

"آؤ باہر چلیں۔" زیب باہر آ گئی۔

آنگن میں زرد رو پتے بکھرے تھے اور سکھ چین پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔

"چلیں۔" طارق عادل کو لے کر باہر آ گیا۔ اس نے ثوبیہ کے خاموش و سنجیدہ چہرے پر نگاہ دوڑائی۔

"ہاں چلو۔"

ثوبیہ کا لہجہ مایوس و اداس تھا۔

"کسی دن بے بے کو لے کر آنا طارق! امی ملنا چاہتی ہیں۔" زیب نے خود اعتمادی سے کہا۔

"جی۔"

طارق نے چونک کر پہلے زیب پھر ثوبیہ کو دیکھا۔ ثوبیہ کی بے یقین آنکھیں پھیلیں۔ امی مسکراتی ہوئی ان کے پاس آ گئیں۔

"ہاں بیٹا! میں تو کب سے ان کی منتظر ہوں۔"

"یاہو۔"

وہ بے اختیار خوشی کے اظہار میں عادل کو اچھال گیا۔ زیب نے لپک کر اسے تھامنا چاہا' مگر وہ پہلے ہی اسے مضبوط ہاتھوں میں تھام چکا تھا۔

عادل کی معصوم ہنسی آنگن میں گونجی۔

سکھ چین کے پیڑ پر بہار بہت دیر سے آتی ہے' مگر آتی ضرور ہے۔ بہار پوری کائنات پر اپنے رنگ بکھیر چکی تھی اور سرگوشی بہار کہتی تھی۔ "اپنا دامن پھیلاؤ۔ میں تمہارا دامن پھولوں سے بھردوں گی۔"

زیب نے نئی کونپلوں کو پھوٹتے دیکھا اور بے اختیار دامن پھیلا دیا تھا۔

اب اسے اپنے حصے کے سبز موسم چرانے تھے۔

* * *

میں تمہارا ساون ہوں

کھڑکی کھلی تھی اور کھلی کھڑکی سے فٹ پاتھ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ قطرہ قطرہ برستی بارش میں فٹ پاتھ کا وہ حصہ جو نگاہوں کی زد میں تھا' بھیگ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایستادہ صنوبر کے سبز پتے بارش کی تال پر محورقص تھے۔ یوں لگتا تھا ان کا زمردیں رنگ بارش میں گھل گھل کر سرخ فٹ پاتھ پر بکھر رہا ہو۔ لندن کی قدیم عمارتوں کے عقب سے جھانکتے کلیسا کے خدوخال بارش اور بادلوں میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ہوا محو شرارت تھی اور صنوبر کے سبز پتے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ یہ لندن کی ایک ابر آلود شام تھی۔

دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ حماد آیا تھا۔ اس نے اپنا رین کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور اپنے لیے کافی بنانے کچن میں جا گھسا۔

"اور میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ زندگی میں وہ کون سا مقام ہوتا ہے جب انسان سب کچھ پا کر بھی خود کو خالی خالی سا محسوس کرنے لگتا ہے۔" اس نے یخ و تلخ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوچا تھا۔ اس یخ کافی نے اس کے ہونٹ جلا دیئے۔ مقام حیرت کبھی ٹھنڈ بھی یوں جلاتی ہے۔

اس نے بے خیالی میں دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے ہونٹ رگڑ کر سرخ کر ڈالے۔

"آج آسمان مجھ سے کتنا قریب ہے اور میں آسمان سے کتنا دور۔ پاؤں دھرتا ہوں تو پھسل سا جاتا ہوں۔ شہرت کسی پالتو بلی کی طرح میرے قدموں میں لوٹتی ہے۔ تو مجھے اس کی چمکتی گھاگ اور عیار آنکھوں سے خوف کیوں محسوس ہو رہا ہے' اس نے بے خیالی میں اپنے پاؤں جھٹکے تھے۔

"بہت کچھ پا کر میں نے کچھ کھویا تھا اور یہ کچھ میرے اندر کہیں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے۔ ذرا سوچو ہزاروں کے مجمع میں۔ جب میری آواز طلسم بکھیر رہی ہوتی ہے' ہزاروں لاکھوں نگاہیں بے قراری سے مجھے چھو کر پلٹ رہی ہوتی ہیں۔ تو ان میں کتنی محبت' کتنی حسرت ہوتی ہے۔ یوں

جیسے وہ مجھے پورے کا پورا ازبر کرنا چاہتی ہو' مجھے اپنی آنکھوں کے بند دریچوں میں چھپا کر کہیں دور لے جانا چاہتی ہوں۔ جانتی ہو ان محبت وحسرت بھری نگاہوں کے حصار میں مقید تمہیں صرف اور صرف تمہیں سوچتا ہوں۔

"چھوڑو اس کو' گرم کافی انجوائے کرو۔" اس کے ہاتھ میں گرما گرم بھاپ اڑاتا خوشبودار کافی کا مگ آ گیا تھا۔

"کل کا تمہارا شو۔"

"آج ساون کی تین تاریخ ہے۔"

"لندن میں ساون۔ ہاؤ فنی۔" حماد کا جاندار قہقہہ بارش کی جلترنگ میں گھل مل گیا۔ اس کے مغموم ہونٹوں پر اک طویل عرصے بعد بڑی پیاری مسکراہٹ بکھری تھی۔

"وہاں ساون کے رنگ بہت مختلف ہوا کرتے تھے۔" وہی رنگ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں اتر کر ماضی کو جگانے لگے۔

"یوں لگتا تھا۔ بارش نہیں برستی۔ آسمان سے رنگ برستے ہیں۔"

"کون سے رنگ؟ سرخ' سبز' بسنتی یا لاجوردی۔"

"پیار کے محبتوں اور چاہتوں کے خلوص ووفا کے رنگ۔"

"تم نے پاکستان فون کیا تھا؟"

وہ چپ ہوگیا اور سرخ فٹ پاتھ پر صنوبر کے سبز پتوں کا رقص دیکھنے لگا۔ اک بے جان اور بے روح رقص۔ جیسے بٹن دباؤ تو کرسٹل کی گڑیا دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اک دائرے میں گھومتی اور پتھرائی ضرغام صہیب کو وہ محو دعا لگتی۔

اور وہ ہمیشہ اس کی آنکھوں میں منجمد پتھرائے ہوئے آنسو دیکھا کرتا تھا۔

* * *

ساون کی بنیاد میں کس کے آنسو ہیں۔
صدیوں پہلے شاید کوئی۔
صدیوں بیٹھ کے رویا تھا۔

کھلی کھڑکی کے نم پٹ پر گال ٹکائے وہ کب سے مانند بت ایستادہ تھی۔ اس کی نگاہوں کے عین سامنے مخملیں گھاس پر بارش کے قطرے پھسل رہے تھے۔ سرسبز درخت دیوانہ وار جھومتے ہوئے مہینوں کی کثافت دھو رہے تھے۔ دیوار کے سہارے ٹکی سرخ اور سفید پھولوں کی بیل نے وارفتگی سے جھوم کر سبز گھاس پر پھولوں کی چادر سی اوڑھا دی تھی۔ دور آسمانی کی گود پرندوں کی

پھڑپھڑاہٹ سے بھر گیا تھا۔

سب کچھ تو وہی تھا۔

بارش کی جلترنگ
ہوا کی تال پر پتوں کا رقص
کچے انگوروں کی سبز خوشبو
فضا میں گھلی ملی لیموں اور جامن کی مہک
فالسے سے بھرا پیڑ اور گلاب کے پھول
یہ ساون کی مہکتی ہوئی خوش رنگ صبح تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے منظر بن اور بگڑ رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی۔ آج سے قبل بارش اک چنچل سہیلی کی طرح لگتی تھی۔ آنگن میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کِکلی ڈالتی شوخ اور رازداں سہیلی۔

مگر آج اس میں شناسائی کا کوئی ایک رنگ بھی نہیں۔

ساون اتنا بے رنگ کیوں ہے۔

پہلے تو لگتا تھا۔ فطرت اپنے سارے رنگ برسا رہی ہے۔

سرخ' نیلے' پیلے' اودے' لاجوردی۔

بارش کا پہلا قطرہ دھرتی کے بدن میں اترتا تو من تن کے بھیگے جنگلوں میں مور بن کر ناچتا تھا۔

آسمان کی گاگر چھلکتی تو گوری کی کنواری آنکھوں میں خوابیدہ خواب انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگتے تھے۔ پاگل ہوا کی ذرا سی سرگوشی پر ہنسی قلقل کرتے پہاڑی جھرنے کی طرح بہہ نکلتی۔

مگر اب کیا ہوا ہے؟

سب کچھ تو وہی ہے مگر......

بارش کے قطرے دھرتی کے بدن کو اک تواتر سے چھو رہے ہیں۔ مگر من تن کے بھیگے جنگلوں کی ہولناک تاریکی میں بہتے سناٹے سے ڈر جاتا ہے۔

آسمان کی گاگر آج بھی چھلک گئی ہے۔ مگر آنکھوں میں خوابیدہ سپنے جاگتے ہیں تو سسکنے لگتے ہیں۔

پاگل ہوا اب بھی مائل بہ شرارت ہے۔ میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہے۔ ہنسی من سے پھوٹتی ہے' مگر ہونٹوں پر آ کر مردہ ہوجاتی ہے۔

"لو فالسے کا شربت پیو۔" سمیرا اس کے ٹھنڈے ہاتھوں میں گلاس تھما گئی۔

"وہ ایک شخص تھا۔ جب عام تھا تو میرے اندر دل بن کر دھڑکتا تھا۔ سانسوں کی طرح رواں تھا۔ خون کی جگہ گردش کرتا تھا۔

"جب وہ بہت عام سا تھا۔ تو کتنا خاص لگتا تھا۔ اب خاص ہے تو عام بھی نہیں لگتا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔"

"نہیں، میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ اسے بھول جاؤں۔ اس کو اپنے اندر سے کھینچ نکالنے کی اک بے چاری سی کوشش کر رہی ہوں۔"

اس کے مغموم ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ پھیلی۔

"یہ ساون آج ہمیشہ جیسا کیوں نہیں ہے۔"

اس نے پلکیں جھپک کر اپنے سامنے بنتے بگڑتے منظروں کو دیکھا۔

"جب وہ ہزاروں کے مجمعے میں اپنی آواز کا جادو جگاتا ہوگا۔ لاکھوں نگاہوں کے حصار میں کبھی اسے میرا خیال بھی آتا ہوگا۔" اس کے ہونٹوں پر جمی ہنسی تڑخ تڑخ گئی۔

"شاید نہیں۔" وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔

تو ہوا یہ ہے کہ تم نے میری محبت اپنے نغموں میں سمو لی۔

میرے آنکھوں کے کنوارے خواب اپنی سروں میں ڈھال لئے۔

میرے ہونٹوں کی معصوم ہنسی اپنے لفظوں میں پرو لی۔

تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میرے پاس کیا بچے گا۔

میں اپنا خالی دل، خالی آنکھوں اور خالی ہونٹوں کو لے کر کب تک جی پاؤں گی۔ تم نے مجھے کرسٹل کی وہ گڑیا بنا ڈالا، جو دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے مسلسل ایک دائرے میں چکراتی اور محو تماشا افراد کو اپنی پتھرائی آنکھوں سے تکا کرتی ہے۔ جگنو کو وہ محو التجا لگتی۔

کبھی تم بھی اس کی آنکھوں میں منجمد پتھرائے آنسو دیکھ پاؤ گے۔

* * *

رات عجیب اداس ہوئے ہم
ٹھہرے نہ بے چین ہوئے
پلک پلک جاگے نہ سوئے
منزل پر پہنچے نہ کھوئے

کتنی عجیب اداسی تھی اس خالی پن میں سارا کچھ تھا اور پھر کچھ بھی نہیں تھا من میں بارش کی

چادر اک تواتر سے آسمان سے زمین تک آ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف میں پانی تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ جس میں کئی بچے چھپا چھپ کھیل رہے تھے۔ اردگرد فروٹ کی ریڑھیاں آموں سے لدی ہوئی تھیں۔ آموں کا تازہ سبز اور پیلا رنگ ماحول میں تازگی سی بھر رہا تھا۔ سامنے سگریٹ کی دکان کے شیڈ کے نیچے دو لڑکیاں کالج یونیفارم میں ملبوس بارش سے بچنے کیلئے آ رکی تھیں۔ گہری سانولی رنگت والے دکاندار کے انداز میں تیزی اور سرخوشی آ گئی تھی۔

وہ کن اکھیوں سے انہیں دیکھتا اور دھیرے دھیرے گنگناتا تھا۔ کچھ من چلے سڑک پر گاتے ہوئے گزرے تھے۔ ان کی شوخ آوازوں کی بازگشت بارش کے پانیوں میں گھل مل سی گئی تھی۔ دور مسجد کے سبز مینار پر کسی دور دیس سے آیا پرندہ بارش میں کھو جانے والے راستوں کو ڈھونڈتا ہوا آنکلا تھا۔

یہ لاہور پر اترتی دوپہر تھی جو آسمان پر چھانے والے بادلوں میں چھپ گئی تھی۔ وہ کب سے آفس کی گلاس ونڈو کے سامنے کھڑا چھاجوں چھاج برستے مینہ، شیشے پر پڑتی بوچھاڑ اور سڑک پر ہونے والی چہل پہل دیکھ رہا تھا۔

"جب میں یہاں آیا تھا تب ساون یوں نہیں برستا تھا۔"

"صاحب! چائے۔" اس کے سامنے بھاپ اڑاتا چائے کا کپ تھا۔

"تب شاید میں بھی ایسا نہیں تھا۔ زندگی اک خوش رنگ تتلی کی طرح میرے گرد رقص کرتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ واقعی اک خوش رنگ تتلی ہی تو ہے۔ میں تو تب خود کو فاتح عالم سمجھ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں وہ چمک لہرائی تھی۔ جو آدھی دنیا فتح کرنے کے بعد سکندر اعظم کی آنکھوں میں لہرائی تھی۔ جب ضرغام نے وہ گھر چھوڑا تب مجھے لگا میں آدھی دنیا فتح کر چکا ہوں۔ میرے اندر باہر روشنی جگمگاہٹیں ہی جگمگاہٹیں تھیں۔

"پر اب میں سوچتا ہوں سکندر اعظم باقی آدھی دنیا کیوں فتح نہیں کر پایا۔" بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا۔ شاید صبح سے برستا آسمان تھکنے لگا ہے اور اس کے ہاتھوں میں چائے ٹھنڈی ہو کر بدمزہ ہونے لگی تھی۔

میرے نزدیک محبت ہمیشہ اک تلاش رہی ہے۔ اک مجسم تلاش جو ہمیشہ میرا ہاتھ تھامے نجانے کن بھولی بسری وادیوں میں نجانے کس کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی اور پھر یوں ہوا۔

پھر یوں ہوا کہ جگنو کے چہرے پر پڑتی پہلی نظر اس تلاش کو مٹا گئی۔ مجھے لگا یہی تو محبت ہے۔

مجسم محبت۔

تلاش ختم ہوئی تو ایک پیاس جگ گئی۔

تب میں نے محبت کو اپنے ہاتھوں سے تراشنا چاہا اور یہ بھول گیا کہ نہ تو تم سنگ ہو اور نہ میں سنگ تراش۔

شاید میں نے تمہیں کرسٹل کی وہ گڑیا سمجھ لیا تھا۔ جو بٹن دباتے ہی ایک مدار میں گھومنے لگتی ہے۔ شاید میں نے خود کو وہ مدار سمجھ لیا تھا۔

اور اب میں اپنی فگار انگلیاں دیکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں۔ ''میں نے کتنا غلط سوچا تھا کہ وہ ٹوٹ کر بکھرے گی تو میں سمیٹ لوں گا۔'' مگر اب جانا' توڑ دینا کتنا آسان ہے اور سمیٹنا (میری فگار انگلیاں میرے سامنے ہیں) محبت کی خوبصورت گڑیا ٹوٹ کر بکھر گئی ہے اور آزر مراد کو سمیٹنے کا ہنر نہیں آتا۔

مجھے نہیں معلوم اس کہانی کا مرکزی کردار کون ہے؟

یہ کہانی کس کی ہے؟

ضرغام کی' جگنو کی۔

ان دونوں کی یا میری؟

* * *

بھری دوپہر میں آموں کے باغ میں تنہا گھومنا اس کی ہابی تھی۔ چلتی ہوا کی سرسراہٹیں' پرندوں کی بولیاں اس خاموشی میں شگاف ڈالتی ہوئیں سرسبز ٹہنیوں میں چھپے طوطوں کی پکاریں اور بہتی ندی کا ٹھنڈا پانی۔ جس کے کناروں میں جھکی مخملیں گھاس پر بیٹھ کر درختوں میں سے چھن چھن آتی سورج کی کرنوں کو تکتے ہوئے گھنٹوں بتا دیتی تھی۔ یوں لگتا دھوپ اپنے چاند کے سکے پانی کی ٹھنڈی سطح پر بکھیر رہی ہے۔

اس کے کرتے کی جیب میں ہمیشہ نمک مرچ کی پڑیا اور چھوٹا چاقو موجود رہتا تھا۔ اس وقت بھی پانی میں پاؤں لٹکائے وہ کچی کیری کو چاقو کی مدد سے صاف کر رہی تھی۔ منہ میں پانی سا بھر رہا تھا۔ تب ہی دائیں طرف سے ننھا سفید ہرن قلانچیں بھرتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے دائیں بازو پر منہ رگڑنے لگا۔

''او مائی سویٹ سونو۔'' اس نے ہرن کے گلے میں بازو حمائل کر کے پیار کیا۔ ''کہاں تھے تم؟''

وہ پلٹ کر پانی کی طرف آیا۔ کچھ لمحے ہلتے پانی میں ڈولتے اپنے اور جگنو کے عکس کو دیکھتا رہا۔ پھر پانی پینے لگا جبکہ وہ کیری پر نمک مرچ چھڑک کر چٹخارے لینے لگی۔

''بیٹا! آپ یہاں ہیں؟'' یہ باغ کا راکھی تھا خدا بخش۔

''کیوں بابا کیا دنیا میں انقلاب بپا ہو گیا ہمارے پیچھے۔'' اس نے ننھے سے ہرن کو کھینچ کر گود میں بٹھا لیا۔

''چھوٹی بی بی آپ کو یاد کر رہی ہیں۔''

''کون سمیرا؟''

''جی' انہوں نے کہا ہے آپ جہاں بھی ہوں آپ کو ڈھونڈ کر لاؤں۔ مجھے معلوم تھا جگنو بیٹا یہیں ہوں گی۔ لو سیدھا یہیں چلا آیا۔''

خدا بخش کے لہجے میں مشفقانہ سی ٹھنڈک تھی کہ جگنو ہو یا سمیرا۔ اس کی گود میں پل کر بڑی ہوئی تھیں۔ بہت چھوٹی تھیں تو وہ انہیں اپنے کندھوں پر سوار کر کے یہاں سیر کرواتا۔ پاؤں پاؤں چلنے لگیں تو اس کی انگلی تھام کر یہاں تک آنے لگیں۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتا۔ انہیں رنگ برنگی چڑیاں اور طوطے پکڑ کر دیتا۔ جگنو تو اسے بہت زیادہ عزیز تھی کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ ان پودوں درختوں کو بھی اتنا ہی پیار کرتی تھی جنہیں خدا بخش نے اپنے ہاتھوں پروان چڑھایا تھا۔ اک عمر لگائی تھی اس نے ان درختوں کی آبیاری میں اگرچہ اس کی مدد کیلئے دو اور مالی بھی تھے۔ مگر خدا بخش کی تو بات ہی کچھ اور تھی اور مزے کی بات یہ کہ اس نے جگنو کا نام بھی خود ہی رکھا تھا۔ اس کا اصل نام تو رخشندہ الماس تھا۔ خدا بخش کے منہ پر نہ چڑھتا تو اس نے اس کی جگنوؤں جیسی چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر اسے جگنو پکارنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ نام کچھ یوں زبان زد عام ہوا کہ لوگ اس کا اصل نام ہی بھول گئے۔

''ایسی کیا افتاد آن پڑی اس پر۔ کہیں پھر سے بڑی امی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی۔'' اس نے باآواز بلند سوچا۔ خدا بخش بس کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اس نے سونو کو پیار کر کے گود سے اتارا۔ چاقو بند کر کے کرتے کی جیب میں ڈالا اور ہاتھ جھاڑتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ باقی کیری اس نے پانی میں اچھال دی تھی۔ وہ ایک لمحے کو غڑاپ سے اندر گئی۔ ابھری اور پانی کے ساتھ بہہ نکلی۔

''میں جاتی ہوں بابا! مگر آپ میرے سونو کا دھیان رکھا کریں۔ دیکھیں تو کیسا دبلا ہو گیا۔''

''دھیان تو بہت رکھتا ہوں بیٹا!''

وہ ندی پھلانگ کر دوسری طرف آ گئی۔ داہنی طرف مڑتے ہی بے تحاشا پھولوں اور درختوں میں گھرا بڑا سا وائٹ ہاؤس اس کے سامنے تھا۔ اس کی طرز تعمیر دیکھ کر خیال آتا تھا کسی نے اس گھر کو بڑی محبتوں سے بنایا ہے اور واقعی آغا جی اور ابی نے یہ فارم ہاؤس اور یہ گھر بڑی محنت اور محبت کے ساتھ بنایا تھا۔ اس امید اور یقین کے ساتھ کہ وہ دونوں بھائی اور پھر ان کے

بچے بھی اسی گھر میں رہیں گے۔ وہ تایا کو آغا جی کہتی تھی اور تائی کو بڑی امی۔ ان کے بس دو ہی بچے تھے۔ ضرغام اور سمیرا جبکہ خود وہ اکلوتی بیٹی تھی اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ غزنی اور خضر۔ اس کی چھوٹی پھپھو بھی بیوگی کے بعد یہیں رہتی تھیں۔ ان کا اکلوتا بیٹا آزر مراد اعلیٰ تعلیم کیلئے ملک سے باہر ایسا گیا کہ سات سال گزرنے کے بعد بھی نہ لوٹا تھا اور اس خوبصورت گھر کی قسمت میں سب سے بڑا حادثہ اس کی تعمیر کے ٹھیک دو سال بعد ہی ابی کی وفات کی صورت لکھا گیا۔ وہ تب آٹھویں کلاس میں تھی۔

اگرچہ آغا جی نے انہیں کبھی باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ مگر ابی کی کمی اک خلا کی صورت اس کے وجود میں گھر کر گئی تھی۔

''کہو بڑی امی کے شکنجے میں پھر سے گردن پھنس گئی ہے۔'' اس نے نیچے سے فون کیا تھا۔

''جگنو کی بچی کہاں ہو تم؟''

''میں بہ نفس نفیس تم سے مخاطب ہوں۔''

''یار! امی کہہ رہی ہیں۔ میں کڑھی بناؤں۔ اف میں ہاسٹل سے کیوں واپس آ گئی۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''تمہاری حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے میں اوپر آ رہی ہوں۔''

''امی مجھے اس سے بھی اوپر پہنچا دیں گی۔ انہوں نے سب سے پہلے تمہاری آمد پر پابندی لگائی ہے۔''

اس نے دہائی دی۔

''تو پھر کیا مدد کر سکتی ہوں میں تمہاری۔'' اس نے قدرے پرسکون ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور کشن کھینچ کر گود میں رکھ لیا۔

''تم صرف ترکیب سمجھا دو۔'' جگنو نے ترکیب سمجھائی۔ پھر اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

بدقسمتی سے جتنی محبت آغا جی اور ابی کے درمیان تھی وہ محبت و یگانگت بڑی امی اور امی کے درمیان پیدا نہ ہو سکی۔ دونوں گھروں کا کچن الگ ہو گیا۔ پھپھو کا سامان تو انیکسی میں تھا۔ مگر خود وہ یہیں رہتی تھیں اور ان کی دونوں بیٹیاں عنبرین اور ثمینہ بھی ہمہ وقت یہیں پائی جاتیں۔

''جگنو!'' امی کی فہمائشی نگاہوں نے اسے گھورا۔ اس نے جھٹ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔

''سوری امی! وہ بس وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا کیا بنا رہی ہیں۔''

''غزنی قیمہ پلاؤ کی فرمائش کر رہا تھا۔'' وہ امی کو ہٹا کر خود بنانے لگی۔ امی نے اسے

شروع سے گھر کے کاموں کی عادت ڈالی تھی جبکہ تائی اماں کو اب احساس ہوا تھا۔ تب ہی جیسے ہی سمیرا ہاسٹل سے واپس آتی۔ بڑی اماں شدومد سے اسے گھرداری سکھانے لگتی تھیں اور وہ اس سے کوسوں دور بھاگتی تھی۔ سو ہمیشہ جگنو کی مدد لیتی۔ پچھلی دفعہ بڑی امی سمیرا کو کڑھی کی ترکیب سمجھا کر خود پھپھو کے ساتھ باتیں کرنے لگی تھیں جو سمیرا کی منتوں پر بنائی جگنو نے تھی۔ اب بڑی امی اس کا ٹیسٹ لینا چاہتی تھیں۔ سو تھوڑی دیر میں اس کا پھر سے فون آ گیا۔ تب ہی عنبرین اور ثمینہ آ گئیں۔

''آہا! قیمہ پلاؤ۔''

''امی جی!'' پیچھے ہی غزنی کی دہائی بھی سنائی دی وہ مسکراتی ہوئی سمیرا سے پوچھنے لگی۔

''کہو بھئی کیا کنڈیشن ہے؟''

''میں بیسن بھون رہی ہوں۔''

''خوب بھونو۔''

''خوب بھون لیا ہے۔'' خوب بھوننے کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔

''سرخ ہو گیا۔''

''لگتا ہے۔''

''بڑی امی کے چہرے جتنا سرخ کرنا ہے۔''

''پھر تو نہیں ہوا۔'' اس نے معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دی۔ حکم صادر ہوا ''اور بھونو۔'' دوسری طرف ذرا دیر کو خاموشی چھائی۔

''کیا ہوا؟'' جگنو نے حیرت سے ریسیور کو دیکھا۔

''بھاڑ میں جاؤ تم۔ وہ جل گیا ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر چیخی اور ریسیور پٹخ دیا۔ جگنو نے فوراً سے پیشتر اوپر دوڑ لگا دی۔ کچن کے عین سامنے سوئٹر ہاتھ میں لئے بڑی امی اونگھ رہی تھیں۔ براستہ کھڑکی اس نے کچن میں لینڈ کیا تھا۔ جہاں جلے ہوئے بیسن پر سمیرا بے آواز آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی تھی۔

''احمق۔'' جگنو نے پتیلی سنک میں پٹخی اور دوسری دیگچی اٹھا لی۔ جب بیسن بھننے کے آخری مراحل میں تھا تب ہی بڑی امی کی آنکھ کھلی تھی۔

''جگنو! تم کب آئیں؟''

''ابھی بس ابھی بڑی امی۔ یہ سمیرا چیک کروا رہی تھی۔'' اس نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے چمچ سمیرا کے ہاتھ میں منتقل کیا۔

"سمیرا کو آتا ہے۔" بڑی امی وہیں براجمان ہوگئیں۔ جگنو بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ذرا سی دیر میں اس کی ناک نے بیسن بھننے کی خوشبو محسوس کرلی تھی۔ جبکہ سمیرا مزے سے بھونے جا رہی تھی۔

"شاید کمبخت کی ناک بند ہے۔"

جگنو نے اشارے کنائیوں میں اسے بتانے کی کوشش کی کہ اب وہ لسی ڈال دے جگنو کا اشارہ کچھ ایسا تھا کہ وہ سمجھی آنچ تیز کرنے کا کہہ رہی ہے۔

"اوہ گاڈ۔" جگنو سر تھام کر بیٹھ گئی۔ ابھی دو منٹ کے بعد دوسری دیگچی کا بھی ستیاناس ہونے والا تھا۔

"یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔" بڑی امی نے اس کی بے چینی محسوس کرکے گھورا۔ تب وہ اٹھی۔ جگ بھر لسی دیگچی میں انڈیل کر براستہ کھڑکی فرار ہوگئی۔ اب بڑی امی نے جو کچھ کرنا تھا۔ سمیرا کے ساتھ کرنا تھا۔

* * *

ٹوکری ہاتھ میں پکڑے وہ انیکسی کے سامنے لگے لیموں کے پیڑ سے لیموں توڑ رہی تھی۔ کھلی کھڑکی میں عنبرین بیٹھی گپیں ہانک رہی تھی۔

"یار! ایک بارش ہوجائے تو نا جامنوں کا رنگ نکھر آئے۔" جگنو نے پلٹ کر جامنوں کے پیڑ دیکھے۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔"

"یہ اس دفعہ ضرغام نے بہت دن لگا دیئے۔ یونیورسٹی تو بند ہوچکی۔"

ثمینہ پلیٹ میں فالسے لے کر آ گئی۔ عنبرین نے اٹھنا چاہا تو فوراً ہاتھ پیچھے کرلیا۔

"کھٹے ہیں۔"

"میں ضرغام نہیں کہ گلا بند ہونے کا خطرہ لاحق ہو۔" عنبرین نے مٹھی بھر فالسے اٹھالئے۔

"ہاں تو وہ ضرغام۔"

"تمہیں تو معلوم ہے اس کا میوزک کا شوق یہاں آ کر اپنی موت آپ مرجاتا ہے' سو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزارے۔"

"یہ میوزک اس کا شوق نہیں جنون بنتا جا رہا ہے۔" عنبرین نے فالسے پھانکتے ہوئے کہا۔

"وہ کہتا ہے اپنا البم بنائے گا۔" جگنو نے پنجوں کے بل اچک کر بڑا سا لیموں توڑا۔

"کم آن یار! آغا جی کو پتا چل گیا نا تو میوزک کا شوق ناک کے رستے باہر نکلے گا۔" ثمینہ

نے سر ہلایا۔

"ایسے تو نہیں ہونا چاہئے۔ اتنی اچھی آواز ہے اس کی اور میوزک کا بہت سینس ہے اسے وہ ایک دن بڑا سنگر بنے گا۔"

"اور وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" وہ دونوں ایک ساتھ بول اٹھیں۔ جگنو نے سنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ایسے تو مت کہو' تمہیں پتا ہے نا۔ یہ اس کا کتنا بڑا خواب ہے۔"

"نو ڈیئر' ہمیں نہیں پتا کیونکہ وہ اپنے سارے خواب صرف اور صرف تمہیں بتاتا ہے۔" وہ مائل بہ شرارت تھیں۔ جگنو جھینپ گئی۔ پھر لیموں سے بھری ٹوکری اٹھا کر اندر چل دی۔ یہ کہتی ہوئی کہ "میں سکنجبین بنا رہی ہوں۔ پینی ہو تو آؤ۔"

"لیموں کے چھلکے سنبھال کر رکھنا۔" عنبرین پیچھے سے چلا رہی تھی۔

"ان کا کیا کرو گی؟" ثمینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے لئے فیس ماسک بناؤں گی۔ منہ پر پھٹکار برس رہی ہے۔" وہ اطمینان سے بولی تھی۔

* * *

بہتی جائے یہ نیا
دور کنارہ' کہیں مل جائے گا
بہتی جائے یہ نیا

اس کی آواز میں بہتی ندیوں سی روانی تھی۔ ادھر ادھر ٹولیوں میں باتیں کرتے لوگ بھی متوجہ ہوگئے۔ بلیک جینز سفید ٹی شرٹ میں ملبوس وہ نوجوان ہاتھ میں مائیک پکڑے بڑے اعتماد کے ساتھ گا رہا تھا۔ مکمل آہنگ اور سر میں۔ اس کی آواز کا جادو حاضرین کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

"یار! اس کی آواز واقعی بہت خوبصورت ہے۔" حماد نے بے اختیار اسے سراہا۔

"واقعی! وہ بہت اچھا گا رہا ہے۔ ایک بار فیلڈ میں آجائے تو سب کے چھکے چھڑا دے۔" رضا نے کہا۔

"اس کی فیملی بہت کنزرویٹو ہے۔ یو نو فنکار کو میراثی سمجھنے والی۔" فہد اور رضا ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیئے۔

"گروپ تو جوائن کرلیا اس نے۔ قسمت اس کیلئے راستے خود کھول دے گی۔"

یہ حماد تھا۔ اس کا بیسٹ فرینڈ' لوگ ونس مور کے نعرے لگا رہے تھے۔ وہ معذرت کرکے مسکراتا ہوا ان کے درمیان سے نکل کر حماد کی سائیڈ پر آ گیا۔

"ہائے گائز کیا ہو رہا ہے؟" اس نے دور سے ہاتھ ہلایا۔ مدھم روشنیاں اس کے اردگرد رقص کر رہی تھیں۔ تب ہی اک چنچل سی لڑکی نے اسے روک لیا۔

"آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔ آپ ٹی وی پر کیوں نہیں گاتے۔"

"آپ نے کہا ہے تو اب ضرور گاؤں گا۔" اس کی شہد رنگ آنکھوں میں اردگرد رقصاں روشنیوں سے زیادہ جگمگاہٹیں تھیں۔ وہ لڑکی شرما سی گئی۔

"یار! یہ لڑکیاں شرماتی ہوئی کس قدر پیاری لگتی ہیں۔" وہ قریب آیا تو حماد کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنیاں اک عکس بنانے لگیں۔

"لڑکیاں لڑتی جھگڑتی بھی اچھی لگتی ہیں۔" وہ حماد کے کندھے پر بازو پھیلا کر بولا تھا۔ حماد آگہی کے ساتھ جبکہ باقی دونوں لاعلمی سے مسکرائے تھے۔

"آج تو تم نے کمال کر دیا۔"

سب ہی کہہ رہے تھے۔ وہ تفاخر سے مسکرا رہا تھا۔ "چلو کہیں چلتے ہیں۔" وہ چپکے سے فنکشن میں سے کھسک آئے تھے۔

رات کا حسن دیکھنا ہو تو آدھی رات کی خاموشی میں سفر کرو۔ رات آپ کے ساتھ چلنے لگتی ہے۔ وہ تینوں سنسان سڑکوں پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے True my Dream Comes گاتے رہے اوائل اگست کا ادھورا چاند آسمان کے عین وسط میں ایستادہ تھا۔ ستارے مدھم مدھم اور ہوا ٹھہری سی تھی۔

"سنو! جب تم فیمس (مشہور) ہو جاؤ گے' کیا تب بھی یوں رات کی بانہوں میں بانہیں ڈالے خود کو گاتے ہوئے سنو گے۔" جب وہ تھک کر صنوبر کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ حماد نے اچانک پوچھا۔ رات دھیرے سے مسکرائی تھی کہ اس کے اندھیرے سینے میں ان گنت گیتوں کی بازگشت گونجنے لگی تھی۔ جنہیں گنگنانے والے پھر کبھی یہاں نہیں آئے تھے۔ ضرغام دور جاتے فہد اور رضا کو ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

"گویا تمہیں یقین ہے کہ میں فیمس (مشہور) ہو جاؤں گا۔"

"ہاں اور میں نے سنا ہے شہرت قیمت بھی مانگتی ہے۔"

"میں ہر قیمت دینے کو تیار ہوں۔" وہ اس کے کندھے پر سر ٹکا کر مسکرایا تھا جب حماد کی نگاہیں ادھورے چاند پر جمی تھیں۔

* * *

"ہائے ہائے گرمی ہے کہ مانو آگ برس رہی ہے۔" چھمک چھلو آگے آگے تھی اور پیچھے پیچھے اس کا پراندہ چھنک رہا تھا۔ سبز ریشمی سوٹ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

"تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں کہ آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ تم جلدی سے چولہا بھر کے ہنڈیا چڑھا دو۔" سمیرا اپنے لئے موٹے موٹے آلو بخارے الگ کرتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں اس سال اتنی گرمی کیوں پڑی ہے۔" وہ قالین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"جہنم کا دروازہ کھل گیا ہے۔" عنبرین نے کہا تو ثمینہ اسے لتاڑنے لگی۔

"تم بھی کوئی ڈھنگ کا کپڑا پہنا کرو۔ یہ ریشمی سوٹ اس موسم میں پہننے کے ہوتے ہیں۔"

"تو کب پہنوں گی' ابھی نئی نئی تو میری شادی ہوئی ہے۔" تنک کر بولی۔ تب ہی بڑی امی آ گئیں اور لگیں لتاڑنے۔ چھمک چھلو تیزی سے اٹھی اور جھاڑو اٹھا کر اوپر چڑھ گئی۔ جگنو بور سی ہو کر اٹھ گئی۔

"میں باغ میں جا رہی ہوں۔"

"ظاہر ہے' اس دوپہر میں تمہارا ہی دماغ خراب ہو سکتا ہے۔" ثمینہ نے منہ بنایا۔

"ہم تو یہاں بیٹھ کر آلو بخارے کھائیں گے اور ڈائجسٹ پڑھیں گے۔" سمیرا نے کہا۔ پھر عنبرین سے پوچھنے لگی۔

"آج ساون کی کون سی تاریخ ہے' ابھی تک بارش کیوں نہیں ہو رہی ہے۔"

جگنو سر جھٹک کر باغ کی طرف نکل آئی۔ کچھ دیر ندی کے کنارے پھول چننے کے بعد وہ سونو کو ڈھونڈنے لگی۔ سونو ملا تو اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ صبح سے اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ضرغام بے طرح یاد آ رہا تھا۔

"پتا نہیں کیوں نہیں آ رہا۔ آغا جان نے اسے بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔"

سونو چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے کان کے پاس سے سبز طوطا پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس پھڑ پھڑاہٹ میں اس نے کوئی اور آواز بھی سنی تھی۔ مگر بھری دوپہر میں پرندوں کی چہکاریں تھیں جو کبھی کبھی ابھرتی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر سونو کی طرف دیکھنے لگی۔ تب ہی گٹار کے مدھم سر فضا میں بکھرے تھے۔

"ضرغام صہیب!" اس نے ہونٹوں کو بے آواز جنبش دی۔ پھر سونو کو اتار کر بھاگی۔ اس کی مخصوص جگہ پر وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ پاؤں گٹار کے ردھم کے ساتھ حرکت میں تھے۔ گٹار سینے پر دھرا تھا۔ ایک بازو موڑ کر تکیہ بنائے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں گٹار کے تاروں کو چھو رہی

تھیں۔

"ضرغام! تم کب آئے؟" وہ بے اختیار گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ انداز میں وارفتگی و بے تابی چھلک رہی تھی۔ ضرغام نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بدستور گاتا رہا۔

تیرے چہرے پر لکھا ہے
اک اجالا خوابوں جیسا
تجھ کو پڑھوں تو مجھ پر برسے
رنگ گلابوں جیسا

جگنو نے ذرا سا جھک کر بہتی ندی میں سے چلو بھر پانی لیا اور چھپاک سے اس کے منہ پر دے مارا۔

"اوہ" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"اب ہوش ٹھکانے آئے۔ یہ بتاؤ غائب کہاں تھے اور آئے کب ہو۔ سمیرا نے تو مجھے نہیں بتایا" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ضرغام آستین سے چہرہ صاف کرنے لگا۔

"آج صبح ہی آیا ہوں۔ سمیرا کو منع کیا تھا۔ تم سے یہاں ملنا چاہتا تھا" اس نے باقی سوال گول کئے پھر ایک دم پرجوش ہو کر بولا۔

"جگنو! میں نے اک نئی دھن بنائی ہے تمہیں سناؤں۔"

"ہاں سناؤ" وہ مسکرا دی۔ اس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا کہ ضرغام نے کبھی پہلے اس کے بارے میں نہیں پوچھا۔ وہ کیسی ہے؟

کیا کرتی رہی؟ شاید بعض رشتے ان سب سے مبرا ہوتے ہیں۔ اسے تو صرف اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ اس کیلئے اتنی اہم ہے کہ وہ اپنی ہر نئی دھن' نئی شاعری سب سے پہلے اسے سناتا تھا۔

پھر نجانے کب تک وہ دونوں وہیں بیٹھے نئی دھن ڈسکس کرتے رہے۔

* * *

اس کی بے قرار نگاہیں ابہتاج فارم ہاؤس کے بورڈ پر ٹک گئیں۔ دور دور تک آموں کے درخت قطار در قطار نظر آ رہے تھے۔ وہ ندی کے چھوٹے پل پر کھڑا تھا اور ندی بل کھا کر باغ میں داخل ہو رہی تھی۔ فضا میں سکوت تھا۔ جس میں خوشگواریت بہتی تھی۔ فضا میں ڈولتی خوشبوؤں میں اپنائیت سی تھی۔ اس نے پرسکون ہو کر اپنے پیروں سے طویل مسافت کی گرد جھاڑی تھی۔

سات سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔

محض تصویریں اور فون سے ہی تو ماں اور بہنوں کے دل کی تسکین نہیں ہو سکتی تھیں۔ باغ کے پچھی کونے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ میں مڑا تڑا اخبار سیدھا کیا۔ اس کی نگاہ تاریخ پر جم گئی۔

آج ساون کی چار تاریخ تھی۔

اس نے اک گہرا سانس کھینچ کر اپنی مٹی کی خوشبو کو محسوس کیا۔ یوں لگا جیسے کچی زمین پر تازہ تازہ ہل چلایا گیا ہو اور سوندھی مٹی میں کسان کے پسینے کی مہک شامل ہو۔

اپنی زمین' اپنا آسمان' اپنا سورج اور اپنا ساون۔

"یہ سات برس کیا میں نے خلا میں گزارے ہیں؟" وہ متحیر سا سوچ رہا تھا۔

اک بے قرار بوند بادل سے ہاتھ چھڑا کر زمین پر آ گری تھی۔

اسے اس سفید گھر میں ہونے والی ہلچل یاد آنے لگی۔ تائی جان بوکھلا اٹھتی تھیں۔

"اری سکینہ! ذرا بھاگ کر جائیو۔ میں نے اچار کی پھانکیں سوکھنے کو ڈلوائی تھیں۔" عنبرین کو دھلے ہوئے کپڑے یاد آ جاتے۔ وہ بگٹٹ سیڑھیوں کی طرف بھاگتی' چھوٹی تائی چلاتی۔

"ارے وہ کرسیاں' وہ پلنگ۔"

ضرغام ایسے میں ہمیشہ گھر سے باہر کھسکنے کی کوشش کرتا۔ اسے برستی بارش میں ندی میں ڈبکیاں کھانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ مگر یہ ساون کے بادل تھے۔ اتنا موقع ہی کہاں دیتے۔ ادھر آئے اور ادھر جل تھل کر گئے۔ لڑکیاں بے تاب ہونے لگتیں۔ کنوارے بدن بارش میں بھیگنے کو مچلنے لگتے۔ جامن کے درخت پر پینگ پڑ جاتی۔ بھیگے آنچل فضا میں لہرا کر رنگوں کی دھنک سی بکھیر دیتے۔ اونچا خوب اونچا اڑنے کی خواہش من میں ہلکورے لیتی تو پینگ تیز سے تیز تر ہونے لگتی۔ جیسے ایک پل کو آسمان چھو آنا ہو۔ سمیرا کو اس موسم میں بھیگتے ہوئے فالسے توڑنا اچھا لگتا۔ غزنی اور نصر جامن کے پیڑ پر چڑھ کر شاخوں کو ہلکورے دیتے۔ جگنو بھاگ بھاگ کر جامنیں اکٹھی کرتی اور لاپروائی سے اپنے آنچل میں جمع کرتی جاتی۔ منہ بھی چلتا رہتا۔ ہاتھ' ہونٹ' دانت' دوپٹہ سب جامنی ہو جاتے۔ امی ڈانٹتی جاتیں۔ وہ مزے سے جامنیں کھاتی رہتی۔ اس کے اور ضرغام کے درمیان آم کھانے کا مقابلہ ہوتا۔ جگنو ہمیشہ ضرغام کا ساتھ دیتی اور سمیرا عنبرین اس کا۔ مقابلہ ہمیشہ وہ جیت جاتا۔ جگنو کا منہ بن جاتا۔

آغا جی اور ابی آم تلوا تلوا کر برابر سارے رشتے داروں میں بھجواتے۔ غریب غربا کا حصہ نکالا جاتا۔

کچن میں کئی خوشبوئیں مل جل کر باہر نکلتیں۔ کئی قسم کے پکوان پکتے۔ بارش کے بعد پکنک منائی جاتی۔

چھمک چھلو اسٹیل کی بڑی سی بالٹی میں چینی گھولنے لگتی۔ لیموں نچوڑتے نچوڑتے وہ ساون کے گیت گنگناتی۔

اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا

''بیٹی! تیرا باوا تو بڈھا ہے۔ بڈھا کھوسٹ۔'' ضرغام اس کا ردھم توڑ دیتا۔ وہ ایک پل کو اسے گھورتی پھر برستی بارش کو دیکھ کر مغموم ہو جاتی۔

''ان امیر زادوں کیلئے بارش اک کھیل ہے۔ ادھر ابا نے کچے کوٹھے کی لپائی پھر نہیں کی ہوگی۔'' اس کا دل گاؤں کے کچے کوٹھے کی ٹپکتی چھت میں اٹک جاتا تھا۔

سیاہ بادل گرجے پھر تڑپ کر برس گئے۔ وہ وہیں کھڑا اپنے تن من کو بھیگتا محسوس کرتا رہا۔

بادل' ہوا' خوشبو' بارش اور موسم ازل سے کائنات کے باسی ہیں مگر ان سات سالوں میں یہ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ لگتا ہی نہیں آج سے قبل یہ بادل کبھی یوں جھوم کر آئے بھی ہوں گے۔ یہ بارش کبھی برسی ہوگی۔ شاید نہیں۔

یہ مٹی صرف میرے لئے مہکی ہے
یہ ہوا صرف میرے لئے گنگناتی ہے

اس کے اندر اک سرخوشی کا احساس سر اٹھانے لگا۔ قدم اک امنگ کے ساتھ آگے بڑھے تھے۔

* * *

''آ گیا' آ گیا ارے ذرا بھاگو۔'' افتاں و خیزاں پھپھو لپک کر اندر آئیں۔ ادھر ادھر لڑھکی ہوئی مخلوق میں ہلچل مچ گئی۔

''ک...... کون آ گیا؟'' عنبرین نے تیزی سے ادھر ادھر ہاتھ مار کر دوپٹا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پھر جو بھی ہاتھ لگا اسے کھینچ لیا۔ جواباً او...... آہائے کی آوازیں اک تواتر سے ابھری تھیں۔ معلوم ہوا دوپٹہ ثمینہ کی گردن کے گرد لپٹا تھا۔ سمیرا نے فوراً سے پیشتر باتھ روم میں دوڑ لگا دی تھی کہ وہ اس وقت بھنگن سے بدتر حلیے میں تھی اور کسی بھی مہمان کو ریسیو کرنے کیلئے قطعاً ناموزوں حلیے میں تھی۔ مگر باتھ روم کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ سو ناک ٹکرا کر واپس آ گئی۔

''یہ تم لوگوں کو ہوا کیا؟'' پھپھو جھنجھلائیں۔

''ک...... کون آ گیا اس وقت۔'' سمیرا نے ہاتھ مار مار کر اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹنے کی

کوشش کی۔

''بادل آئے ہیں۔ بارش آنے والی۔ اٹھ کر بکھری چیزیں سمیٹو۔'' انہوں نے بھنا کر حکم صادر کیا۔

''ہائے اللہ بادل آ رہے ہیں۔'' ان تینوں نے باہر کی طرف دوڑ لگائی۔

''اف یہ لڑکیاں!'' پھپھو نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ پھر جگنو کی طرف پلٹیں۔ جو کمرے کی بند کھڑکیاں کھول رہی تھیں۔

''تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ تم ہی سمیٹ لو۔'' پھپھو نے کہا تو وہ لاڈ سے بولی۔

''چھمک چھلو سے کہیں نا۔'' ذرا سی دیر میں معلوم ہوا چھمک چھلو جامن کے درخت پر پینگ ڈال رہی ہیں۔

''آوے کا آوا ہی بگڑا ہے۔'' پھپھو بڑبڑائیں۔ پھر ڈانٹ ڈانٹ کر احکامات صادر کرنے لگیں۔ اس ڈانٹ میں بڑی امی بھی شامل ہو گئی تھیں۔

اودے اودے بادل آسمان کے اک کونے سے امڈے چلے آ رہے تھے۔ بس ایک پل میں سارا آسمان ان کی گرفت میں تھا۔ سورج پر ذرا سا سیاہ بادلوں کا پردہ پڑا اور دن میں شام کا سماں ہو گیا۔ گھنگھور گھٹاؤں نے پل ہی میں سارا منظر بدل دیا تھا۔ کسی کو مہلت ہی نہ ملی۔ عنبرین گرل پر ڈالے کپڑے اتارنے اوپر چڑھی تھی۔ بڑی امی جامن کے سائے میں پڑا اپنا تخت اٹھوانے کی سعی کر رہی تھیں۔ بس ایک پل میں بادل گرجے اور زمین کی پیاس تڑخ گئی۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

وہ سب کی سب پاگلوں کی طرح کھیلنے اور شور مچانے لگیں۔ غزنی اور خضر حسب معمول جامن کے درخت پر چڑھ کر ہلکورے دینے لگے۔ جگنو نے ٹوکری اٹھائی اور جامنیں اکٹھی کرنے لگی۔

''کوئی مجھے جھولا دے۔'' چھمک چھلو چیخ رہی تھی۔ اوپر گٹار سے اک نئی دھن ابھرنے لگی تھی۔ جگنو نے سر اٹھا کر کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور مسکرا دی۔

''چلو میں دیتی ہوں۔'' سمیرا اسے پینگ دینے لگی تھی۔ تھی تو ملازمہ مگر بچپن کا ساتھ تھا۔ شادی بھی اسی فارم ہاؤس کے اک ملازم سے ہوئی سو ہمیشہ کیلئے اسی گھر کی مکین ہو گئی۔ سمیرا اسے زور زور سے پینگیں دے رہی تھی۔ وہ پینگ پر کھڑی ہو گئی۔

''کمبخت گر جاؤ گی۔'' عنبرین نے ڈانٹا۔

''نہ جی کبھی بھی نہیں۔'' وہ ہواؤں میں تھی۔ بڑے یقین سے بولی۔ وہ جسم کو کبھی ڈھیلا چھوڑ

کر کبھی اکڑا کر اب خود ہی پینگ بڑھا رہی تھی۔ ایک پل میں جیسے بادلوں کو چھو آتی تھی۔ وہ ساری دم بخود برستی بارش میں اس کے کرتب دیکھ رہی تھیں۔

"توبہ کتنی ماہر ہے۔" سمیرا کی آنکھیں نکل آئی تھیں۔

"میرا سر چکرا رہا ہے۔" ڈرپوک سی ثمینہ کا دل اس کے ہر چکر پر اچھل کر حلق میں آ جاتا تھا۔

"میں نہیں لوں گی جھولے۔ اللہ اتنی مہارت اسے تو کسی سرکس میں ہونا چاہئے۔"

"دیکھو جی اب اور تیز۔" پینگ اوپر جاتی پھر نیچے آتی۔ پھر نیچے پھر اوپر۔ اگلی بار پینگ اوپر گئی واپس آئی تو خالی تھی۔

"یاالٰہی۔" غزنی اور خضر اور عمر آسمان پر پھر ہائے ہائے کرتی چھمک چھلو زمین پر دریافت کیا تھا۔

"ہائے میری ٹانگ۔"

"نہیں تیز لو اور تیز لو۔" غزنی اور خضر چھیڑ رہے تھے۔ وہ تینوں اس کو گھسیٹ کر اندر لے گئیں۔ امی اور پھپھو مل کر پکوان تلنے لگی تھیں۔

"میں چکن رول بناتی ہوں۔" عنبرین بھی ان کے ساتھ مل گئی۔

"ہر بندہ ایک ایک ڈش بنائے گا۔" سمیرا نے اعلان کیا۔ غزنی اور خضر نے ہنس کر اسے دیکھا اور تنک کر بولے۔

"کیوں بندوں کا کیا قصور ہے۔ ہم تو نہیں بنائیں گے۔"

"اوہو! میرا مطلب ہے۔" سمیرا نے کچھ کہنا چاہا۔

"میری ڈش تو یہ ہے۔" جگنو نے جامنوں سے بھری ٹوکری لہرائی۔

"بکو نہیں۔ تم قیمہ بریانی بناؤ گی۔"

"وہ تو امی بنا رہی ہیں۔" جگنو نے کہا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر آ گئی۔

"ضرغام یہ کیا حرکت ہے۔ اتنے اچھے موسم میں تم کمرے میں بند ہو۔"

ضرغام نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر سے باہر جھانکنے لگا۔ کھلی کھڑکی میں دور تک پھیلے کھیتوں کا سرسبز منظر اور برستی بارش۔ جھومتے درخت اور ان کے درمیان جھانکتے کچے پکے مکان۔

"ان بوندوں کی چھم چھم سے اک نئی دھن کشید کر رہا ہوں۔" اس نے دھیرے سے گٹار کے تاروں پر ہاتھ مارا۔ کمرے میں سر سے بکھر گئے۔

"ضرغام! چلو نیچے۔ ہم تم سے بہت سے گیت سنیں گے۔"

"نہیں جگنو! آغا جی کو پتا چل گیا تو وہ مجھے گٹار سمیت باہر پھنکوا دیں گے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

"تو کب تک چھپاؤ گے ان سے۔ تم اسے اپنا پروفیشن بنانا چاہتے ہو اور آغا جی تمہیں انجینئر بنانا چاہتے ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوگا تو......"

"آؤ نیچے چلتے ہیں۔" وہ گٹار الماری میں بند کر کے اس کے ساتھ نیچے آ گیا۔ جہاں سب کے سب ڈھیر سارے آموں کے ساتھ انصاف کر رہے تھے جبکہ خضر انہیں یاد دہانی کروا رہا تھا۔

"دیکھو! ہم سب انتہائی مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔"

مگر کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھر رہا تھا۔ وہ سب ہنس رہے تھے۔ آم کھا رہے تھے اور چھمک چھلو سے ٹپے سن رہے تھے۔ وہ اپنی زخمی ٹانگ جھلاتے ہوئے گا رہی تھی۔ تب ہی اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔

بھیگا ککڑ بنیرے تے

کاسنی دوپٹے والیے

"تمہیں کوئی اور دوپٹہ نہیں ملتا۔" کاسنی دوپٹہ اوڑھے سمیرا نے دھپ اس کے کندھے پر رسید کی۔

"او جی مہمان آئے ہیں۔"

"مہمان۔" ایک بار پھر بھگدڑ مچ گئی۔ گھبراہٹ میں ثمینہ کے ہاتھ سے گٹھلی چھوٹ کر عنبرین کی گود میں جا گری۔ سمیرا آموں والی ٹوکری اٹھا کر کچن میں فرار ہو گئی تھی۔ جگنو نے تیزی سے چھلکے اٹھا کر ٹوکری میں ڈالنا چاہے۔ پھر دروازے میں کھڑے اس شخص کو دیکھ کر ڈھٹائی سے مسکرائی، پھر چھلکے وہیں چھوڑ کر آموں سے سنے ہاتھ پشت پر باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ غزنی نے اپنے پاؤں کے پاس لڑھک آنے والی گٹھلی کو کمال مہارت سے کرسی کے نیچے کک لگائی تھی۔

"کیا میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں۔" آنے والے کے لبوں پر بھرپور مسکراہٹ جاگی۔

"آ......آزر بھائی۔" عنبرین اور ثمینہ کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور دوسرے پل وہ اس کے گلے لگی دھواں دھار رو رہی تھیں۔

"ارے اب تو میں آ گیا ہوں۔" اس نے پیار سے دونوں کے سر تھپتھپاتے ہوئے علیحدہ کیا۔

"اسی لئے تو رو رہی ہیں۔" جگنو کی زبان پھسلی آزر نے ایک پل کو نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سفید چوڑی دار پائجامے' کرتے اور بڑے سے دوپٹے میں ملبوس دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ کھڑی تھی۔ ہونٹوں کے گوشوں میں شریر سا تبسم مچل رہا تھا۔

آزر کو وہ اپنی سات سالہ تلاش کا حاصل لگی۔

"تم......تم جگنو ہو نا۔ ہائے......" اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑے یقین سے کہا۔ جگنو نے ذرا ٹھٹک کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر آموں سے سنے ہاتھوں کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا تھا۔

* * *

آزر گھر کیا آیا۔ پھپھو کے قدم زمین پر نہ ٹکتے۔ عنبرین اور ثمینہ اڑی اڑی پھرتیں۔ جی کو اک مضبوط سہارا مل گیا۔ ورنہ اب تک وہ سب کچھ تنہا ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ پہلے اسٹڈیز کیلئے گیا تھا پھر وہیں جاب کرنے لگا۔ مگر سات سال بعد ہی اکتا کر یہاں بھاگ آیا۔ وہ پہلے کی نسبت زیادہ میچور اور سمجھدار ہو گیا تھا۔ اس دن وہ سب ہی باغ کی سیر کو نکل آئے۔ ادھر ادھر بھاگتے سونو کو جگنو نے گود میں اٹھا لیا۔ ضرغام گٹار کے بغیر ادھورا ادھورا سا لگ رہا تھا۔

"ایک بات تو بتائیں آزر بھائی! آپ اتنے عرصے بعد کیوں لوٹے۔" سمیرا نے اچانک پوچھا۔

"بس نیا نیا دنیا دیکھنے کا شوق تھا اور ملک سے باہر جانے کا پہلا موقع۔ سوچا اتنی جلدی لوٹ گیا تو پابند ہو جاؤں گا۔"

"تو واپس آنے کا خیال کیسے آیا؟" جگنو نے پوچھا۔

"بس یہ جو ہم جیسے لوگ ہوتے ہیں کسانوں کے بیٹے۔ ان کا اپنی مٹی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اکتا گیا تھا۔ یہاں کی مٹی پکارنے لگی تو بھاگ آیا۔" مدھم خاموشی میں چڑیوں کے چہچہانے کی آوازوں کے ساتھ کوئل کی کوک بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ ذرا خاموش ہو کر اسے سننے لگا پھر مسکرا دیا۔

"یہ آواز مجھے بار بار پکارتی تھی۔ واپس لوٹ آؤ۔ وہ تمہارا اصل نہیں ہے اور آج لگتا ہے یہ صرف میرے لئے بول رہی ہے۔ مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔"

"آپ یقین کر لیں' یہ صرف آپ کو ہی پکار رہی ہے۔" ثمینہ نے ہنس کر کہا پھر سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگی۔

"آزر بھیا! سچ سچ بتائیں۔ آپ نے وہاں شادی تو نہیں کر لی تھی؟"

"ارے نہیں بھئی۔ جوتے کھانے تھے آغا جی سے۔ ویسے بھی کوئی آئیڈیل لڑکی ملی ہی نہیں۔"

دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ ریلیکس موڈ میں چل رہا تھا۔

"آپ بھی آئیڈیل ازم کا شکار ہو گئے۔" جگنو نے اچانک کہا تھا۔ آزر نے یونہی ذرا سا پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو کیا تم بھی۔"

"نہیں بھئی۔ میں اس پر یقین نہیں رکھتی۔" وہ کندھے اچکا کر سونو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"ہاں بھئی اس کو تو جو ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر سب قبول ہے۔" عنبرین ضرغام کی طرف دیکھ کر شرارت سے ہنسی۔

"مطلب۔" آزر نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"شریف بچی ہے۔ والدین ہاں کہیں گے چپ چاپ سر جھکا دے گی۔" سمیرا کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"اب ایسی بھی موم کی گڑیا نہیں ہوں۔" جگنو چڑ گئی۔

"اچھا اگر انہوں نے۔" عنبرین اس کے کان میں گھسی' جواباً جگنو نے ایک دھپ رسید کی تھی۔ ضرغام سمیت سب ہی کے ہونٹوں پر اک معنی خیز سی مسکراہٹ تھی۔ آزر نے ایک نظر سب کو دیکھا۔ پھر کندھے اچک کر رہ گیا۔ وہ سب ندی کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ سو دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔

"ضرغام! تم کیا کرتے ہو آج کل؟" آزر نے قدرے خاموش بیٹھے ضرغام کو دیکھا۔

"یہ آج کل میوزک فرماتے ہیں۔" ثمینہ نے بتایا۔ آزر کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ انہیں چلتی ہواؤں' کوئل کی صداؤں' بہتے جھرنوں اور بارش کی رم جھم میں سر بجتے سنائی دیتے ہیں۔ یہ یہاں کیچ کرتے ہیں اور گیتوں میں ڈھال دیتے ہیں اور آغا جی سے ڈانٹ بھی کھا لیتے ہیں۔" عنبرین نے بتایا۔

"مگر وہ انجینئرنگ؟"

"وہ بھی پارٹ ٹائم جاری ہے۔"

"عنبرین۔" ضرغام نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

"یہ تو خوامخواہ بولے جا رہی ہے۔ آزر بھائی! ضرغام بہت اچھا سنگر ہے اور یہ اپنا کیسٹ بنانا چاہتا ہے۔" جگنو نے بتایا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آغا جی سپورٹ نہیں کر رہے۔" آزر نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"آپ وطن سے باہر گئے تھے آغا جی نہیں۔ ابھی تک تو سب کچھ چھپ چھپا کر جاری ہے۔ جس دن انہیں خبر ہوگئی اسی دن۔" ضرغام نے گردن پر چھری پھرنے کا اشارہ کیا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ تمہارا البم آجائے لوگ تمہاری تعریفیں کریں گے تو آغا جی بھی راضی ہو جائیں گے۔" جگنو نے گویا تسلی دی۔ ضرغام ہنس دیا۔

"سچ تو یہ ہے اس گھر میں صرف جگنو مجھے سپورٹ کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ جو میرا گٹار ہے اس پر بھی آدھے پیسے جگنو سے ادھار لئے تھے۔"

"جو تا حال واپس نہیں ہوئے۔" سمیرا نے لقمہ دیا۔

"مجھے چاہئے بھی نہیں ہیں۔" جگنو نے کہا۔

"ہاں' ایک ہی بار واپس لے گی۔" ثمینہ نے کہا تو وہ سب کے سب پھر سے ہنس دیئے تھے۔ جگنو انہیں بری طرح گھور رہی تھی۔ آزر الجھن آمیز انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔

* * *

اک بار پلٹ کر دیکھو
میں تمہارا ساون ہوں
بیتا تو لوٹ آؤں گا
اک آشا من میں جگاؤں گا
تیرے من کو بھی مہکاؤں گا
ذرا اپنے من میں جھانکو
میں تمہارا ساون ہوں

گٹار کے تار ذرا سا ارتعاش پھیلاتے ہوئے خاموش ہوگئے۔ اس کی مدھر آواز کا طلسم دھیرے سے سارے منظر پر چھا گیا تھا۔ سرمئی بادل جھکے جھکے سے تھے اور ندی کا پانی ٹھہرا ٹھہرا ہوا دم بخود تھی' جیسے کسی گوری نے سکھیوں کی قلقل بہتی ہنسی کے درمیان اپنے ساجن کی پکار سن لی ہو۔ وہ کچھ لمحے یونہی ندی کی ساکت سطح پر نظریں جمائے بیٹھا رہا' پھر ذرا سا رخ موڑ کر اسے

دیکھا۔

وہ اسے عالم خواب میں لگی۔

"کیسا لگا؟" اس کی آواز نے گویا سارا طلسم بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ وہ طویل سانس لے کر سیدھی آئی۔ پھر بے اختیار سراہتے ہوئے بولی۔

"فنٹاسٹک۔ بہت خوبصورت۔"

جگنو کا کہنا گویا سند تھا۔ وہ طمانیت سے مسکرایا۔

"جانتی ہو یہ گیت کیسے ہوا؟" وہ یونہی پیچھے کو دراز ہوگیا۔ دونوں بازو سر کے نیچے رکھ لئے۔ گٹار اس کے پہلو میں پیاری محبوبہ کی طرح پڑا تھا۔ اور نگاہوں کے سامنے گھنے درختوں میں سے ہوا کے رتھ پر سوار بادل ذرا ذرا سے جھلک رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئل تڑپ کر کوکتی تھی۔ فضا میں آموں کی سبز خوشبو گھلی ملی سی تھی۔ جگنو نے پوچھا نہیں۔ ندی کے کنارے کھلے چھوٹے چھوٹے خود رو پھول توڑ توڑ کر ندی میں بہاتی رہی۔

"رات اچانک آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر بارش قطرہ قطرہ برس رہی تھی۔ جس پل میری آنکھ کھلی میرے اندر بس ایک احساس جاگا تھا۔ میں تم سے دور ہوں۔ بہت دور۔ شاید کوئی خواب دیکھا تھا میں نے۔ مجھے لگا تم مجھے پکارتی ہو۔ میرا دل چاہا میں بھاگ کر جاؤں اور تمہارے کمرے میں تمہاری موجودگی کا یقین کروں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ جیسے اسی کیفیت کو پھر سے اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا ہو۔ جگنو متحیر و گم صم سی سن رہی تھی۔

"اس پل میری کیفیت بہت عجیب سی تھی۔ میں رونا چاہتا تھا مگر رو نہیں سکتا تھا۔ مرد تھا نا۔ ایک لڑکی کیلئے روتا اچھا لگتا۔" وہ عجیب سی ہنسی ہنسا۔ جگنو نے پلٹ کر قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔ وہ نجانے کس سوچ میں کھو گیا تھا۔

"یہ کھو دینے کا احساس بہت اذیت ناک تھا' بہت۔" وہ اس اذیت کو از سر نو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں ایسا کیوں ہوا۔ میں اٹھ بیٹھا اور قطرہ قطرہ گرتی بوندوں سے دھن کشید کرنے لگا۔ پھر میں نے یہ گیت لکھا تمہارے لئے۔ جگنو......" وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔

"میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مگر تم جانتی ہونا۔ میں تمہارے بنا نہیں جی سکتا۔" اس کی بے تاب نگاہیں جگنو کا چہرہ کھوج رہی تھیں۔ وہ ذرا سا مسکرائی۔

"محبت کبھی بھی لفظوں کی بیساکھیاں استعمال نہیں کرتی ضرغام۔ میں جانتی ہوں' میں ازل سے جانتی ہوں۔"

"اور...... اور تم۔"

"پاگل ہو۔" وہ دونوں ہاتھوں سے کپڑے جھاڑتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

"ہاں رات تو مجھے بھی شک ہوا تھا۔"

"بھول جاؤ رات کو۔ ہمارے درمیان کوئی خوف نہیں ہونا چاہئے اور مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا ہے۔ ہماری تقدیر کا فیصلہ بھی یہی ہوگا۔"

وہ دونوں پریقین انداز میں مسکرائے تھے۔ ہوا ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگی۔ وقت کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھری تھی۔

"یہ محبت ہمیشہ خوش گمان کیوں ہوتی ہے۔"

* * *

خوشگوار شام کے سائے جامن کے درخت سے لپٹے تھے۔ افق کے کناروں سے شفق پھوٹ رہی تھی۔ آسمان کی بیکراں وسعتیں پرندوں کی بولیوں اور پروں کی پھڑپھڑاہٹوں سے بھر گئی تھیں۔ عنبرین اور ثمینہ آنگن کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولے کچن میں مصروف تھیں۔ سمیرا ابھی ابھی بڑے سے ڈھیر ساری ڈانٹ کھا کر جا گی تھی اور اب کسلمندی سے کاریڈور میں دھری کرسی پر نیم دراز تھی۔ جگنو کیاریوں میں سے پودینہ چن رہی تھی کہ آغا جی کیلئے چٹنی بنانی تھی۔ چھمک چھلو آزر کیلئے سکنجبین بنا رہی تھی اور وہ بڑے بڑے پایوں والے نواڑی پلنگ پر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پھپھو کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا اور کبھی کبھی اچٹتی سی نظر پودینہ توڑتی جگنو پر ڈال لیتا تھا۔ جو نجانے کس سوچ میں مگن سی کبھی اٹھتی کبھی جھکتی۔ ہمیشہ کی طرح سفید پائجامے اور اورنج کڑھائی والے کرتے دوپٹے میں ملبوس سب سے منفرد لگ رہی تھی۔ بائیں کلائی میں چھ اورنج چوڑیاں بہار دکھا رہی تھیں۔ تب ہی بڑی امی بڑبڑاتی ہوئی آگئیں۔

"میں کیا کروں اس لڑکے کا؟"

"کس لڑکے کا؟" آزر اٹھ بیٹھا وہ سر پکڑ کر پھپھو کے پاس ڈھیر ہوگئیں۔

"یہ ضرغام۔ پتا نہیں کن چکروں میں رہتا ہے۔ گھر کو ہوسٹل اور ہوسٹل کو گھر سمجھ رکھا ہے۔" وہ تپی ہوئی تھیں۔ جگنو نے مسکراتے ہوئے پلٹ کر انہیں دیکھا اور پھر سے مصروف ہوگئی۔

"مگر وہ ہے کہاں۔ صبح سے نظر ہی نہیں آیا؟" آزر نے پوچھا۔

"چلا گیا ہے ہاسٹل۔ بغیر بتائے۔ چپکے سے کھسک گیا۔ یہ جگنو کو بتا گیا تھا کہ بعد میں بتا دینا۔ اب میں اس کے آغا جی کو کیا جواب دوں گی۔"

وہ بھی محض اتفاق تھا۔ جب جگنو اسے ناشتے کیلئے بلانے گئی تو وہ سامان پیک کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" حیرت بجا تھی۔

"دنگل۔"

"تم جا کہاں رہے ہو؟"

"ہاسٹل۔"

"دماغ خراب ہوگیا ہے۔" اس نے بھنا کر فتویٰ جاری کیا۔ وہ جگنو کی حالت دیکھ کر ہنس
با شرٹ گول مول کر کے بیگ میں ٹھونسنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجبوری ہے۔ میں یہاں رہ کر کچھ بھی نہیں کر پا رہا ہوں اور اس وقت ویسے بھی آغا جی کی
زدہ آزر کی طرف زیادہ ہے۔ میں آرام سے وہاں کچھ میوزک پر کام کرلوں گا۔"

"دماغ خراب ہے۔ آغا جی نے پوچھا تو کیا جواب دیں گے۔"

"یہاں رہ کر پڑھائی نہیں ہوتی ایگزامز نزدیک ہیں۔" اس نے گٹار پر کور چڑھاتے ہوئے
آرام سے کہا۔ "ویسے بھی انہیں امی رام کرلیں گی۔"

"تم نے ان کو بتا دیا ہے۔" وہ بیگ کندھے پر چڑھا کر دوسرے ہاتھ میں گٹار سنبھالتے
ہوئے اس کے قریب رکا۔

"انہیں تم بتاؤ گی۔" وہ مزے سے بولا۔ "میرے جانے کے بعد۔ ورنہ وہ مجھے روک لیں
گی۔"

"تم بالکل پاگل ہو۔" وہ بھنا کر بولی۔

"ہاں مگر تمہارا۔" وہ ذرا سا جھک کر بولا۔ جگنو ٹپٹا کر کچھ بھی نہ کہہ پائی اور وہ سائیڈ سے
نکلتا چلا گیا اور اب بڑی امی پریشان تھیں کہ آغا کو کیا بتائیں گی۔

"اور وہ اس سے بے خبر کوئی نیا گیت تخلیق کر رہا ہوگا۔" جگنو نے سر جھٹک کر سوچا اور بڑی
امی اپنا غصہ آزر کے سامنے نکال رہی تھیں۔

"سب جانتی ہوں اس کی پڑھائیوں کو۔ وہ نگوڑا گٹار کندھے سے اترے تو کتاب نظر
آئے۔ ہر پل تو گانے سوجھتے ہیں۔ کسی میراثی کی اولاد نہ ہو تو۔"

جگنو منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ آزر نے بمشکل مسکراہٹ کا گلا گھونٹا امی اور پھپھو انہیں
تسلیاں دینے لگیں۔

"کسی دن باپ کے ہتھے چڑھ گیا تو ناک کے راستے نکلیں گے سارے گانے۔" وہ حد
درجے غصے میں تھیں۔

"بڑی امی! ذرا سوچیں تو جب ضرغام بھائی ٹی وی پر آئیں گے تو کتنا مزا آئے گا۔" کرسی

پرا ونگھتی سمیرا ان کی آواز پر ہوشیار ہوئی۔

''رہنے دو۔ ٹی وی پر بندروں کی طرح اچھل اچھل کر گانے گائے گا۔ میراثیوں والے کپڑے پہنے گا اور خاندان بھر میں ناک کٹوائے گا۔'' انہوں نے ٹی وی پر شاید علی عظمت کا گانا سن لیا تھا۔

''بڑی امی وہ ویسے نہیں گاتا۔ بہت سوبر طریقے سے گاتا ہے۔'' جگنو نے وضاحت کی۔

''اب رہنے بھی دو۔ تم ہی لوگوں نے اسے سر پر چڑھایا۔ ارے کچھ کرنا ہے تو باپ کے ساتھ ہاتھ بٹائے وہ تنہا کیا کیا دیکھیں۔''

''دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی اور ہم ابھی تک۔'' سمیرا بڑبڑائی۔ وہ چڑ کر بولیں۔

''دنیا کہیں نہیں گئی۔ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی ہے۔ ایک ہمارے بچے کو آفت آگئی ہے۔''

کوئی چارہ نہ دیکھ کر جگنو نے پودینہ اٹھایا اور کچن میں چلی گئی۔ آزر نے ایک بازو ان کے کندھے پر پھیلایا اور تسلیاں دینے لگا۔

''فکر کیوں کرتی ہیں۔ آغا جی اکیلے تو نہیں ہیں۔ میں ہوں نا ان کے پاس سب سنبھالوں گا۔''

* * *

ضرغام کو گئے بہت دن گزر گئے تھے۔ بس ایک ہی بار اس کا فون آیا تھا وہ بری طرح اپنی البم میں گم تھا۔ ان ہی دنوں سمیرا کا پرپوزل آیا۔ عنبرین کے منگیتر کو جاب ملی تو وہ لوگ شادی کا تقاضا کرنے لگے۔ آغا جی کسی کام سے لاہور گئے تو وہیں سے ضرغام سے ملنے ہاسٹل چلے گئے اور وہاں انہوں نے ضرغام کے کمرے میں انسٹرومنٹس پڑے دیکھے۔ ضرغام خود انہیں اپنے سامنے دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔ آغا جی آگ بگولہ ہوگئے۔

انسٹرومنٹس کو تو ٹوٹنا ہی تھا۔ اس کے دوستوں کی بھی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کی اور اسے لے کر گھر آگئے۔ گھر میں گویا قیامت آگئی تھی۔ سب لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں دبک گئیں۔ انہوں نے ضرغام کے ساتھ ساتھ تائی امی کو بھی رگید ڈالا کہ وہ بیٹے کے کرتوتوں پر پردہ ڈالتی رہی تھیں۔ ضرغام نے کچھ بولنا چاہا تو خضر اور غزنی اس کو کھینچ لے گئے۔ اس وقت اس کا بولنا قیامت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ آزر نے بمشکل آغا جی کو ٹھنڈا کیا۔ مگر انہوں نے صاف کہہ دیا۔

وہ اپنی خاندانی شرافت ونجابت پر یہ دھبہ برداشت نہیں کرسکتے۔ اگر ضرغام کو یہی سب کرنا ہے تو بس ختم سمجھے اپنی پڑھائی اور میرے ساتھ زمینیں سنبھالے۔

''یہ ناممکن ہے۔'' ضرغام کو تاؤ آگیا۔

''چپ کر کے بیٹھو۔ اسی دن کیلئے تو ڈرتی تھی میں۔'' بڑی امی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اسے بری طرح جھڑک دیا۔

''تم نے کرنا ہی تھا تو کوئی ڈھنگ کا کام ڈھونڈ لیتے۔'' امی نے سر پر ہاتھ مار کر گویا اس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔

''اس میں کیا برائی ہے۔ چوری نہیں کرتا ہوں' ڈاکہ نہیں ڈال رہا۔ فقط اک گانا ہی تو گا رہا ہوں۔'' وہ تنک کر بولا۔

''لو میراثیوں والا کام۔'' پھپھو بڑبڑائیں۔

''کچھ بھی ہو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔''

''افوہ کم از کم اس وقت تو چپ کر جاؤ۔ آغا جی کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو پھر کچھ سوچیں گے۔'' جگنو جھنجھلا کر بولی۔ ''بس تم اتنے دن تک کہیں نہیں جاؤ۔''

وہ دھپ دھپ کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اگلے کئی دن تک گھر میں ٹینشن رہی۔ آغا جی تو ضرغام کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ کم از کم تب تک جب تک اس کے دماغ سے یہ میراثیوں اور بھانڈوں والا شوق اتر نہیں جاتا تھا۔

''خواہ اس کیلئے مجھے اس کے ہاتھ پاؤں کیوں نہ توڑنے پڑیں۔'' انہوں نے با آواز بلند اعلان کیا تھا۔

''ہاں' ایسا ہی آسان ہے نا۔'' وہ اپنے کمرے میں تنتناتا رہا۔ پھر پرعزم لہجے میں بولا تھا۔

''ہاں توڑ دیں ہاتھ پاؤں۔ گانا تو میں نے زبان سے ہے۔''

* * *

''آخر میں کب تک یوں گھر میں بیٹھا رہوں۔ آپ بات کریں آغا جی سے۔'' ضرغام حد درجے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں ماں سے مخاطب تھا۔

''بس تم چپ ہی رہو۔'' وہ حد درجے بیزار بیٹھی تھیں۔

''کیوں چپ رہوں۔ میں کوئی مذاق کر رہا ہوں آپ کے ساتھ۔'' وہ تڑخ کر بولا۔

''تو پھر میں کیا کروں۔ بیٹا ہے تو مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے' ادھر باپ ہے تو مجھ پر الزام دھر رہا ہے۔'' ان کی جان الگ عذاب میں تھی۔

''بیٹا! چھوڑو تم۔ کیا رکھا ہے ان کاموں میں۔ اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ پھر ہم تمہاری شادی کردیں گے۔''

پھپھو نے گویا اسے لالچ دیا۔ ضرغام نے ایک نظر چپ بیٹھی جگنو پر ڈالی۔ وہ چپ تھی کیونکہ جانتی تھی کہ ضرغام میوزک نہیں چھوڑے گا۔

"سوری میں نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر آپ کو آغا جی سے بات نہیں کرنی تو مت کریں میں خود کرلوں گا۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

"اب یہ نیا فساد برپا کرے گا۔" بڑی امی سر تھام کر رہ گئیں۔

"کتنا دل چاہتا ہے۔ ہمارے بھائی بھی ٹی وی پر نظر آئیں۔ لوگ آٹوگراف لینے کیلئے ان کے آگے پیچھے پھریں۔ عنبرین وہ ابرارالحق سے زیادہ اچھا گا لیتے ہیں نا۔" سمیرا نے عنبرین سے تصدیق چاہی۔

"ہاں تو اور کیا؟" اس نے جھٹ مہر لگا دی۔

"ایک تو ان لڑکیوں کو ابرارالحق کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔" پھپھو بیزار ہو کر اٹھیں۔

"جب اس کا گانا آتا ہے تو سب سے پہلے تو آپ ہی ٹی وی کے سامنے براجمان ہوتی ہیں۔" سمیرا نے معصومیت سے کہا تھا۔ جواباً جو کچھ اسے سننا پڑا کہ وہ تو وہ باقی سب بھی وہاں سے کھسک لیں۔

"میں صبح جاؤں آغا جی۔" ضرغام کا انداز مؤدب تھا۔ سب کے دل دھک سے رہ گئے۔

"کہاں؟" اس نے مدد طلب نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے لقمہ دیا۔

"جو پڑھائی پہلے کر رہا تھا اس پڑھائی کا۔" ان کا لہجہ گہرا طنز لئے ہوئے تھا۔ آزر نے ایک نظر لب کاٹتے ضرغام پر ڈالی۔ پھر بات ٹالنے والے انداز میں بولا تھا۔

"جانے دیں نا آغا جی! اب نہیں کرے گا۔"

ضرغام نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ آزر نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ضرغام نے ایک نظر آغا جی کے چہرے پر ڈالی پھر دونوں ہاتھ ٹیبل کے کنارے ٹکا کر آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔

"میں میوزک نہیں چھوڑ سکتا آغا جی۔"

"گھر چھوڑ سکتے ہو۔" آغا جی کا لہجہ پرسکون تھا۔

"ضرغام نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ پھر جھٹکے سے پلٹ کر واپس نکل گیا۔

"یہ کیا کیا آپ نے۔" بڑی امی نے دہائی دی۔

"اسے سمجھا دو اگر اسے اس گھر میں رہنا ہے تو یہ شوق چھوڑنا پڑے گا۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ اب ہمارے لڑکے بھانڈوں کی طرح محفلوں میں گائیں گے۔" وہ غضب ناک لہجے میں

بولے تھے۔

اگلے دن جگنو اسے ناشتے کیلئے بلانے گئی تو کمرہ خالی تھا۔ ہر چیز یونہی پڑی تھی۔ بس اک گٹار غائب تھا۔ وہ چلا گیا تھا چپ چاپ۔

* * *

وہ کیا گیا درودیوار کو اک نامعلوم سے سناٹے نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کتنے دن گزر گئے تھے اور اس کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی۔

آغا جی اس کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر بہت غصے میں تھے۔

"آجائے گا دھکے کھا کر۔"

بڑی امی چھپ چھپ کر روتیں تو پھپھو کی پلکیں بھی نم ہو جاتیں۔ انہوں نے بیٹے کی جدائی کا دکھ سہا تھا۔ امی ان کو تسلیاں دیتیں اور رات گئے تک نوافل پڑھ کر دعا کرتیں۔ ضرغام کے ساتھ ان کی بیٹی کا مستقبل وابستہ تھا۔

"میں اسے ڈھونڈ لاتا ہوں۔" آزر بھائی نے کہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" آغا جی گرجے تھے۔ "اس کے ہوش ٹھکانے آنے دو۔"

انہوں نے بڑی امی کی ملتجی نگاہیں نظرانداز کر دیں۔ خضر' غزنی' عنبرین' ثمینہ سب اسے بہت یاد کرتے۔ سمیرا کا تو وہ بھائی تھا۔ وہ چھپ چھپ کر روتی اور اس کی کامیابی کی دعائیں مانگتی۔

چھمک چھلو آہیں بھرا کرتی۔

"اب میں بار بار کس کی فرمائش پر سکنجبین بنایا کروں گی۔" وہ کتنا چڑتی تھی اس کے یوں بار بار فرمائش کرنے پر۔

ان سب کے دلوں میں خوف سا کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اگر وہ لوٹا تو سب جانتے تھے۔ وہ کتنا ضدی ہے۔ آغا جی کا صحیح جانشین۔

جگنو گم صم تھی۔ اسے یقین تھا وہ آئے گا۔ مگر تب جب سب کچھ اس کے قدموں میں ہوگا۔ وہ اب کبھی بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹے گا۔ مگر وہ یہاں سے خالی ہاتھ گیا تھا۔ جگنو نے خضر کے ذریعے چپکے سے پتا کروایا تھا۔ وہ ہاسٹل نہیں گیا تھا۔

"کہاں دھکے کھا رہے ہوگے ضرغام! تمہارے پاس تو ایک وقت کے کھانے کے پیسے بھی نہیں تھے۔"

فون کی ہر ہر بیل پر ان کے دل دھڑک دھڑک جاتے۔ ہر ہر آہٹ پر اس کا گمان ہوتا۔

"کیا پتا لوٹ ہی آیا ہو۔"

مگر ہر نگاہ رد ہو کر' مسترد ہو کر پلٹ آتی۔

"آپ کتنے آرام سے بیٹھے ہیں آزر بھائی!" اس دن نجانے کیوں وہ آزر بھائی سے الجھ پڑی تھی۔ وہ ابھی ابھی آغا جی کے کسی کام سے واپس لوٹا تھا اور اس وقت ریلیکس موڈ میں صوفے پر نیم دراز ٹی وی پر سپورٹس چینل دیکھ رہا تھا۔ قدرے حیرت سے اسے دیکھنے لگا جو گرین لان کے کرتے دوپٹے میں ملبوس الجھی الجھی سی دونوں ہاتھ مسلتی ہوئی شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا جگنو؟"

"آپ ضرغام کو ڈھونڈتے کیوں نہیں۔"

"وہ کوئی بچہ تو نہیں جو کھو گیا ہو۔ اپنی مرضی سے گیا ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ جگنو بے بسی سے لب کاٹنے لگی۔

"پھر بھی۔"

"مگر میں اسے کیوں ڈھونڈوں؟" وہ جگنو کی بات کاٹ کر بولا۔ جگنو نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"جب وہ یہاں تھا تو پورا گھر اک ٹینشن میں تھا اب......"

"سکھ میں تو اب بھی نہیں ہیں۔" وہ برجستہ بولی۔ آزر نے اسے دیکھا' پھر سیدھا ہو کر ریموٹ کنٹرول انگلیوں میں گھماتے ہوئے عام سے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم کیوں اتنی پریشان ہو؟"

"تو کیا بہت خوش ہوں۔ وہ میرا کزن ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔" جگنو تنک کر بولی۔ "نجانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔"

"گھر چھوڑ کر جانے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔" اس نے گویا یاددہانی کرائی۔ جگنو کی نگاہوں میں بے یقینی کی لہر ابھری۔ وہ ہولے ہولے سر جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔

"پتا نہیں کیوں آزر بھائی مجھے لگتا ہے۔ آپ ضرغام کے جانے پر خوش ہوئے ہیں۔"

"کچھ ایسا ناخوش بھی نہیں ہوں۔" وہ کٹھور لہجے میں برجستہ بولا تھا۔ جگنو کچھ لمحے اس پر نظریں جمائے کھڑی رہی' پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ جبکہ اس نے جھنجھلا کر ریموٹ کنٹرول صوفے پر دے مارا تھا۔

* * *

وہ کب سے قدرے نیم تاریک گوشے میں کھڑا بقعہ نور بنے لان کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اندر جائے یا نہیں' اس کے قریب ہی گاڑیاں رکتی تھیں اور خوشبوؤں میں بسے مہمان اندر جا رہے تھے۔ چھوٹی سی آبشار کے بہتے پانیوں میں ست رنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ان کے پاس کھڑے فہد اور رضا آنے والے مہمانوں کو ریسیو کر رہے تھے۔ ضرغام کو خبر نہیں تھی۔ آج ان کے گھر کوئی فنکشن تھا۔ وہ کئی دنوں سے ہاسٹل نہیں گیا تھا۔ اگر وہاں ہوتا تو ضرور وہ لوگ اسے بھی انوائیٹ کرتے۔

تب ہی رضا کسی مہمان کو ریسیو کرنے اس طرف آیا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس سیدھی ضرغام پر پڑیں۔

"ارے ضرغام تم۔" وہ لپک کر اس کے قریب آیا اور گرمجوشی سے اس سے ملنے لگا۔

"کہاں غائب تھے یار اتنے دنوں سے۔ مگر اچھا ہوا عین وقت پر آئے ہو۔ پاپا نے بہت بڑی پارٹی ارینج کی ہے۔ اک زبردست سا گیت ہو جائے گا۔ میں نے بہت تعریف کی ہے تمہاری۔ مگر تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔ اندر کیوں نہیں آئے۔" وہ بولتا چلا گیا۔

"رضا۔" ضرغام نے کچھ کہنا چاہا۔ تب ہی رضا کی نظر اس کے حلیے پر پڑی۔ وہ عام سے گھریلو شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔

"یہ تم نے حلیہ کیا بنایا ہے یار! اتنے بڑے بڑے لوگ آئے ہیں یہاں۔ اچھا چلو بیک سائیڈ سے چلتے ہیں۔ تم کوئی میرا ڈریس پہن لو۔"

ایک ہی رات نے کل اور آج کے ضرغام میں فرق ڈال دیا تھا۔

"نہیں رضا! میں تو یہاں صرف حماد کا پوچھنے آیا تھا۔" ضرغام نے یونہی بات بنائی ورنہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ حماد اپنے چھوٹے سے کمرے میں پنکھا چلائے آدھی نیند لے چکا ہوگا۔

"نہیں وہ یہاں تو نہیں آیا۔" رضا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تمہیں تو معلوم ہے وہ اس قسم کے فنکشنز میں نہیں آتا۔ وہی کلاس کمپلیکس حالانکہ۔"

"اوکے میں چلتا ہوں پھر ملیں گے۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"ارے وہ گانا۔" رضا عقب سے چلایا۔ ضرغام نے یونہی ہاتھ ہلا دیا اور چکر کاٹ کر سڑک کی طرف نکل گیا۔ چاندنی چٹک رہی تھی۔

فضا میں پھولوں کی مہک بسی تھی۔ اکا دکا گاڑی سڑک پر کبھی کبھی زن سے نکل جاتی۔ وہ یونہی چلتا رہا۔ اس کا کل اثاثہ اس کے دائیں کندھے پر لٹک رہا تھا۔ اس کا محبوب۔ اس کا گٹار۔

اس کے قدم بے سمت راستوں پر بھٹک رہے تھے۔ ماضی سے ہاتھ چھڑا کر آیا تھا اور

مستقبل کی کچھ خبر نہ تھی۔ مگر وہ ناامید نہیں تھا۔

ابھی حوصلے جوان تھے۔ منزل پر نگاہ تھی اور من میں کچھ بننے کی لگن کروٹیں لے رہی تھی۔

پھر یونہی چلتے چلتے پاؤں سے تھکن لپٹنے لگی۔ نیند اور بھوک وجود پر حاوی ہونے لگی تھی۔

اس نے درخت سے ٹیک لگا کر گٹار کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لیا دور کوئی شخص دھیمے قدموں سے رات کی تاریکی میں معدوم ہو رہا تھا۔ اس کا سایہ پول کی روشنی میں ترچھا ہو کر سڑک پر لرز رہا تھا۔ تب ہی ضرغام کی نظر بھٹک کر فون بوتھ پر پڑی۔

"سب لوگ کیا کر رہے ہوں گے۔" اس نے ایک لمحے کو ان سب کی سرگرمیاں یاد کیں۔ آغا جی شدید غصے میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ امی شاید رو رہی ہوں۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں ملال سا ابھرا پھر اس نے سر جھٹک دیا۔

سمیرا بہت اداس رہی ہوگی اور اس وقت سوگئی ہوگی اور جگنو......

جگنو کیا کر رہی ہوگی۔" اس نے سوچا۔ "بہت خفا ہوگی۔ آج پہلی بار میں اسے بغیر بتائے آیا ہوں۔"

ضرغام کا ہاتھ آہستگی سے اپنی جیب میں رینگ گیا۔ اس کی جیب میں چند ہی روپے تھے۔ اس نے پلٹ کر اس تاریکی میں گم ہوتے شخص کو دیکھا اور اس سے قبل کہ وہ مکمل طور پر تاریکی کا حصہ بن جاتا۔ وہ گٹار سمیت اس کے پیچھے بھاگا۔

"ایکسکیوزمی سر! کیا آپ کے پاس کچھ سکے ہوں گے۔"

اس نے غصے بھری نگاہ ضرغام پر ڈالی۔ مگر کچھ سکے نکال کر اس کی ہتھیلی پر دھرے اور چل دیا۔ ضرغام نے دو قدم آگے بڑھ کر روپے اس کی شرٹ میں ٹھونسے اور اس کے دونوں کندھوں پر دباؤ ڈال کر گرمجوشی سے مسکرایا۔

"تھینک یو سر۔ تھینک یو سو مچ۔"

نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس نے زیر لب دعا مانگی تھی اور دوسری بیل پر ہی اس کی آواز سنائی دی۔ وہ خاموش ہی رہا۔ جگنو کچھ لمحے ہیلو ہیلو کرتی رہی پھر ایک دم خاموش ہوگئی۔

"ضرغام!" اس کی سرگوشی ابھری۔

"مجھے معلوم تھا تم پہچان جاؤ گی۔"

"تم ہو کہاں؟"

ضرغام نے ایک لمحے کو پچھلے پہر کے سناٹے میں بھیگی خاموش سڑک، چپ کھڑے درختوں، پورے چاند اور پھر پول کی زرد روشنی میں بیٹھی سفید لاغری بلی کو دیکھا اور ہنس دیا۔

"ضرغام! پلیز گھر آجاؤ۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"تو پھر کیوں ستا رہے ہو۔" جگنو کی آواز بھیگ گئی۔

"تم جانتی ہو جگنو! میوزک میری اولین چاہت ہے۔"

"اور میں؟" جگنو نے اچانک پوچھا۔

"تم۔" وہ ایک لمحے کو یوں سوچ میں ڈوبا جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"جگنو! اگر میں کبھی لوٹا تو وجہ صرف تم ہوگی۔ مگر میں واپس تب ہی آؤں گا تب میں آغا جی کے نام سے نہیں۔ آغا جان میرے نام سے پہچانے جائیں۔"

"تم بہت خودغرض ہوگئے ہو۔ تم نے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا۔ بڑی امی اور سمیرا کیا کریں گی تمہارے بغیر اور آغا جی وہ تم سے محبت کرتے ہیں ضرغام وہ۔"

لائن کٹ گئی تھی۔ ضرغام نے تھکے تھکے انداز میں ریسیور واپس رکھا اور پھر بہت سوچ کر وہ حماد کی طرف آیا تھا۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد حماد باہر آیا تھا۔ اسے اس وقت دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔"

"کیوں؟" حماد کی ساری نیند اڑن چھو ہوگئی۔

"کیا یہ ممکن ہے تم اس وقت کچھ نہ پوچھو۔"

"ہاں...... ہاں تم اندر آؤ۔"

چھوٹے سے کمرے میں ایک پلنگ تھا۔ حماد کچھ شرمندہ ہوگیا۔

"تم یہاں سو جاؤ۔ میں نیچے سو جاؤں گا۔" اس نے تیزی سے اک کھیس جھاڑ کر نیچے بچھائی اور اپنا تکیہ کھینچ کر نیچے رکھا۔ تو ضرغام جوتے اتار کر کھیس پر بیٹھ گیا۔

"تم اوپر سو جاؤ۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں ضرغام اچھا نہیں لگتا۔"

"پلیز۔"

"تم نے کھانا کھایا؟"

"ضرغام نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ مگر وہ اس وقت حماد کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو اثبات میں سر ہلا دیا۔ حماد نے دراز کھول کر بسکٹ کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"پھر بھی اگر بھوک ہو تو یہ کھا لینا۔"

ضرغام نے چپ چاپ پیکٹ تھام لیا تھا۔

* * *

وہ اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ سمیرا نے اسے بتایا تھا کہ وہ اسے باغ میں ملے گی۔

وہ نرم مخملیں گھاس پر بیٹھی دونوں ہاتھ گود میں دھرے ندی کنارے اگے خود رو پھولوں پر اڑتی تتلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے پتا چلا تھا۔ جب تم کہیں نہیں ہوتی ہو تو یہاں ہوتی ہو۔'' آزر نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔ جگنو نے ایک بے معنی سی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر سے تتلیاں گننے لگی۔

آزر نے سنجیدگی سے اس کا چہرہ کھوجا جو خفگی کا عنوان بنا ہوا تھا۔

''تم خفا ہو مجھ سے۔''

''میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔''

''مجھ سے ہو۔'' اس نے یقین سے کہا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

''جگنو پلیز۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ بے بسی سے بول اٹھا۔ جگنو نے پشت پر ہاتھ باندھ کر سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ آزر کی نگاہوں کی زد میں سیاہ اسٹریپ والی سادہ سی چپل میں مقید گلابی پاؤں تھے۔ وہ آج بھی سفید چوڑی دار پائجامے پنک کڑھائی والے کرتے پیلا دوپٹا مفلر کی طرح گلے میں آگے کی سمت ڈالے کھڑی تھی۔ سیاہ بال بینڈ کی قید میں تھے۔ میک اپ سے مبرا چہرے پر سنجیدگی' خفگی اور متانت تھی۔

آزر کو وہ ہمیشہ کی طرح سب سے منفرد اور انوکھی سی لگی۔

''میں جانتی ہوں آپ کا کیا مطلب تھا۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ یہاں سے چلا گیا ہے تو ہم اسے یاد بھی نہ کریں' اس کی بات نہ کریں۔ اسے سوچیں نہیں۔'' وہ صاف اور دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔

''لیکن آزر صاحب! وہ یہاں سے خفا ہو کر گیا ہے اور بہت مجبور ہو کر کبھی کبھی انسان کا شوق اس کا جنون بن جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں میوزک اس کی زندگی ہے۔ دریا کی طرح بہتی ہے موسیقی اس کے اندر' جس میں وقفے وقفے سے لہریں اٹھتی ہیں۔ اس سے یہ چھن گیا تو وہ ادھورا رہ جائے گا۔ اور پھر آزر صاحب وہ ہمارا ڈیئر کزن ہے۔ ہم اس کے بارے میں بات بھی کریں گے۔ اس کی باتیں بھی کریں گے۔ اسے سوچیں گے بھی اور اس کی واپسی کی دعائیں بھی کریں گے۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر پھر سے بولی ''اور اگر ہو سکا تو اسے ڈھونڈیں گے بھی۔''

''جگنو! وہ میرا بھی کزن تھا۔ مجھے بھی بہت عزیز تھا۔''

''تھا؟'' اس نے اچانک پوچھا۔ آزر گڑبڑا سا گیا ہے۔

جگنو کے لبوں کو استہزائیہ سی مسکراہٹ نے چھوا۔ کم از کم آزر کو تو وہ مسکراہٹ استہزائیہ ہی لگی تھی۔ چند لمحے خاموش اس مسکراہٹ کو دیکھتا رہا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔

''میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔''

''رہنے دیں۔''

''کیوں؟''

''میں جانتی ہوں اب وہ یوں واپس نہیں آئے گا۔'' اسے رات اس کا آنے والا فون یاد آ گیا۔ آزر نے اس سے یہ نہیں پوچھا۔ ضرغام سے متعلق ہر بات اتنے یقین سے کیوں کہتی ہے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ ہی گھر لوٹے تھے۔

بڑی امی گم صم سی بیٹھی تھیں۔

''اسے گئے ابھی بس دو دن ہوئے ہیں اور اس گھر کی فضا ہی بدل گئی۔''

آزر نے تحیر سے سوچا۔ جگنو بڑی امی کے پاس بیٹھ کر دونوں بازو ان کے گلے میں حمائل کر کے تسلیاں دینے لگی۔

''پتا نہیں۔ وہ کہاں اور کس حال میں ہو گا۔'' تائی اماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کا دل کسی صورت نہیں سنبھل رہا تھا۔'' باپ بیٹے نے عزت وانا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ پتا نہیں کہاں دھکے کھا رہا ہو گا۔''

''بڑی اماں! آپ فکر مت کریں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ رات کو اس کا فون آیا تھا۔'' جگنو کا خیال تھا' وہ نہیں بتائے کہ ضرغام نے کب اسے کوئی ڈھنگ کی بات بتائی تھی مگر اب اس کی خیریت سے مطلع کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

''کب؟'' بڑی امی اچھل پڑیں۔ اندر آتا آزر بھی پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

''بہت رات گئے۔ مجھے نیند آ رہی تھی تو میں ٹی وی کھولے بیٹھی تھی۔''

''وہ کہاں ہے؟'' سمیرا بے تاب ہوئی۔

''یہ تو اس نے نہیں بتایا۔'' جگنو کی آواز مدھم ہوئی۔ پھر جلدی سے بولی۔

''مگر وہ بالکل ٹھیک ہے اپنے کسی دوست کے پاس ہے۔'' اس نے بات بنائی۔

''آ کب رہا ہے۔''

''آ جائے گا۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ اب تو کچھ کر کے ہی آئے گا اور بہت جلد آئے

گا۔ اب آپ اٹھیں اور کھانا کھائیں۔ مجھے یقین ہے آپ نے کھانا نہیں کھایا۔"
وہ انہیں اٹھا کر کچن میں لے گئی جبکہ آزر نجانے وہاں کھڑا کیا سوچتا رہا تھا۔

* * *

"تم نے کیا سوچا ہے ضرغام۔"
باہر دھوپ پوری طرح پھیل گئی تھی۔ کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ میں سے گزر کر فرش پر زاویہ سا کھینچ گئی تھی۔ جس میں دھول کے ذرے چمک رہے تھے۔ وہ دونوں فرش پر آمنے سامنے بیٹھے چائے میں رس ڈبو کر کھا رہے تھے۔ حماد کا تو یہ معمول تھا مگر ضرغام کو یہ ناشتہ کچھ پسند نہیں آیا تھا۔ سو اس کے انداز میں بدلی تھی۔ ایک ہی رس کھا کر اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔
"آج جمعہ ہے۔ گھر میں حلوہ پوری بنی ہوگی۔"
"کیا سوچ رہے ہو؟"
"کچھ نہیں بس یہ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" وہ ایک طویل سانس لے کر سیدھا ہوا۔
"رضا اور ضیا۔"
"نہیں یار! وہ میری مدد تو کریں گے۔ مگر مجھے ان سے مدد نہیں لینی۔" ضرغام نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "ہاں تم اگر کچھ دن مجھے یہاں رکھ سکو تو۔"
"مجھ سے مدد لینا منظور ہے۔" حماد مسکرایا۔
"ہاں تمہاری بات اور ہے۔" اس نے کچھ خاموشی کے بعد جواب دیا۔
"میری بات اور ہے۔" حماد نے زیر لب کہا پھر ہنس دیا۔ "تو جان من! یہ ایک کمرہ ہے میرے پاس اور یہ ایک عدد باتھ روم۔ کھانا پینا سب ہوٹل آئی مین چھپر ہوٹل سے پڑا ہوں میں بھی۔ تم بھی رہ جاؤ۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔" ضرغام نے ایک نظر کمرے کی حالت پر ڈالی۔ نجانے کب سے صفائی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ حماد شرمندہ سا ہو کر کان کھجانے لگا۔
"صفائی میں خود ہی کرتا ہوں۔"
ضرغام نے اس کی بات نہیں سنی وہ اپنی ہی کسی سوچ میں الجھ گیا تھا۔
"وہ گروپ جو تم نے جوائن کیا تھا۔"
"گیا تھا میں ان کی طرف۔ انہیں کوئی اور سنگر مل گیا ہے۔" پھر قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہرا یرا غیرا اٹھ کر موسیقی سمجھنے اور سنگر ہونے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ خواہ آواز ہو یا نہ ہو۔"

"تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔" حماد نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔
"شٹ اپ! سردست میرا مسئلہ روزگار ہے کوئی بھی چھوٹی موٹی جاب۔"
"جاب...... جاب ہے تو مگر شاید تم اسے کرنا نہیں چاہو۔ وہ تمہارے اسٹینڈرڈ کی نہیں ہے۔" حماد نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔
"میرا اب کوئی اسٹینڈرڈ نہیں رہا۔ میں اس وقت سڑک پر چنے بھی بیچ سکتا ہوں۔ تم بتاؤ کیا ہے؟" ضرغام نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ چند دنوں نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔
"میں جس آئس کریم پارلر میں کام کرتا ہوں۔ بہت بڑا پارلر ہے دوسرا لڑکا کام چھوڑ گیا ہے۔ اگر میں مالک سے بات کروں تو وہ یقیناً مان جائے گا۔ اتنی تنخواہ تو نہیں ہے مگر جب تک فارغ ہو۔"
"تم پارٹ ٹائم جاب بھی کرتے ہو۔" ضرغام نے قدرے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔ چچا جو پیسہ بھجواتے ہیں وہ بس کالج کی فیس میں نکل جاتا ہے باقی اخراجات کیلئے ہاتھ پاؤں تو مارنا ہی پڑتا ہے۔"
ضرغام تاسف سے سر جھٹک کر رہ گیا۔ حماد اس کا دوست تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا اس کے حالات کیا ہیں۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ اس کے والدین نہیں ہیں' اک چچا ہیں جو لندن میں مقیم ہیں اور اس کا خرچہ اٹھاتے ہیں۔ مگر اسے یہ خبر نہ تھی کہ اس کا دوست زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کیلئے پارٹ ٹائم جابز کرتا ہے اور اس چھوٹے اور غلیظ علاقے کے ڈربہ نما کمرے میں رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ان لوگوں کے پروگرامز میں شریک نہیں ہوتا تھا۔
"تو پھر میں بات کروں؟" اسے خاموش دیکھ کر حماد نے پوچھا۔
"ہاں کرو۔ اب کچھ تو کرنا ہی ہے۔"
"کسی ریکارڈنگ ایجنسی سے بات کرتے ہیں تمہارے البم کیلئے۔ ایک بار تمہارا البم کیسٹ مارکیٹ میں آجائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" حماد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"اس کیلئے پیسہ چاہیے۔"
"اللہ دے گا۔" حماد نے برجستہ کہا۔ ضرغام نے تیزی سے چھت کی طرف دیکھا۔
"کیا ہوا؟"
"میں دیکھ رہا تھا چھپر تو نہیں پھٹ گیا۔"
"چھپر بھی پھٹ جائے گا میری جان تم فکر مت کرو۔ بس صبر کرو۔" حماد نے اس کے

کندھے پر ہاتھ مارا۔

* * *

کئی جمعے گزر گئے۔ گھر میں حلوہ پوری نہیں بنی تھی۔ اور یہ جمعہ تو اور بھی عجیب تھا۔ سمیرا کے سسرال والے رسم کرنا چاہ رہے تھے اور آغا جی نے کہا تھا وہ رسم کر دیں۔ بڑی امی اور سمیرا کا رو رو کر برا حال تھا۔ بھلا ضرغام کے بغیر یہ رسم کیسے ہو سکتی ہے۔

"جن کے بھائی نہیں ہوتے کیا ان کی منگنیاں نہیں ہوتیں۔ پھر آزر ہے نا۔" آغا جی نے سنگ دلی کی انتہا کر دی۔ سمیرا صبح سے اپنے کمرے میں گھسی تھی۔

آنکھیں سرخ، ناک سوجی ہوئی، عنبرین اور جگنو اسے تسلیاں دینے لگیں۔

"آغا جی ایسے تو نہ تھے۔"

انہیں غصہ ہے بہت زیادہ۔ ضرغام لاکھ ان کا لاڈلا تھا۔ کبھی ان کا حکم نہیں ٹالا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ضرغام یوں گھر چھوڑ جائے گا۔ وہ اپنی جگہ ٹھیک۔ غلط آغا جی بھی نہیں۔ برسوں کے بنائے ریت رواج بدلنا آسان تو نہیں۔ صدیوں سے ہمارے خاندان میں گانا بجانا محض بھانڈ اور میراثیوں کا کام رہا ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ بزرگ اسے کیسے آسانی سے ایک باعزت پیشہ تصور کر لیں۔ تبدیلی آئے گی مگر آہستہ آہستہ ذہن بدلیں گے۔ مگر سست روی کے ساتھ۔ یہ کوئی فلم تو نہیں کہ سین بدلے اور سب ٹھیک ہو جائے۔"

جگنو انہیں ساتھ لگائے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھی۔

"اور پھر منگنی ہی تو ہے۔ کون سا شادی ہو رہی ہے۔" عنبرین نے کہا۔ پھر جگنو سے بولی "آ جاؤ اب کچن دیکھ لیں۔"

وہ کچن میں آئیں جہاں ثمینہ ثابت مرغ رکھے قدرے پریشان کھڑی تھی۔

"سنو! اس کا کیا کروں؟" اس نے مرغ ٹانگ سے پکڑ کر لہرایا۔

"اس کو بھرنا ہے۔" جگنو نے بتایا۔

"مگر یہ تو پہلے ہی سے بھرا ہے۔" ثمینہ پریشانی سے بولی۔ عنبرین کا دل الٹ گیا۔ "چھمک چھلو کو بلاؤ اسے اندر سے صاف کرے۔"

جگنو چھوٹے چھوٹے آلو اور مٹر تلنے لگی ان کے اندر بھرنے کیلئے۔ ثمینہ چھمک چھلو کو بلانے چلی گئی۔

"عنبرین! تم سمیرا کا سوٹ پریس کر دو۔ میں یہ دیکھ لوں گی۔" جگنو نے کہا تو وہ سر ہلا کر چلی گئی۔

"کہاں ہو ضرغام۔ تمہارے بغیر یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہے۔"

"آپی جگنو! خضر اندر آیا تھا۔

"کیا بات ہے۔ باہر تو سب انتظام ٹھیک ہے نا۔ کرسیاں اسی ترتیب سے لگائی ہیں جیسے میں نے بتایا ہے۔"

"آزر بھائی کر رہے ہیں۔" وہ الجھا الجھا سا تھا۔

"تو تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے محبت سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

"آپی! میں نے کل ضرغام بھائی کو دیکھا تھا۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔ جگنو پوری کی پوری اس کی طرف گھوم گئی۔

"کہاں؟"

"آئس کریم پارلر پر۔"

"اچھا تو یہ عیش ہیں۔" وہ عجیب سی ہنس دی۔ "اور یہاں سب پریشان ہیں کہ وہ۔"

"وہ وہاں کام کر رہے تھے۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔ جگنو سن سی ہو گئی۔ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم ملے تھے اس سے۔" اس نے بمشکل اپنا لہجہ قابو میں کیا۔ کبھی نہ ہل کر پانی پینے والا۔ اپنے شوق کے ہاتھوں یوں خوار ہو رہا تھا۔

"نہیں۔ میرے ساتھ دوست تھے۔ پھر میں نے سوچا کہیں وہ شرمندگی نہ محسوس کریں انہوں نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔"

ایک لمحے کو جگنو کو اس کی بے وقوفی پر غصہ آ گیا۔ پھر وہ غصہ ضبط کر کے پوچھنے لگی۔

"تم نے کسی اور کو تو نہیں بتایا۔ میرا مطلب بڑی امی وغیرہ کو۔"

"نہیں میں نے سوچا۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔"

"ہاں یہ پہلی عقل مندی کی ہے تم نے۔ کسی کو کچھ مت بتانا۔ اب جاؤ تم کام وغیرہ کرواؤ۔"

خضر چلا گیا۔ وہ یونہی بے معنی سے سوچوں میں گھری رہی اور فنکشن کے درمیان بھی اس کی بے خیالی سب نے محسوس کی تھی۔ آزر بھی اسے الجھا الجھا دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ نے ایک دو بار پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئی۔

"کیا فائدہ۔ آغا جی کا غصہ تو ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔"

اگلے دن جب خضر اور غزنی واپس ہاسٹل جانے لگے۔ ان کا گھر اور فارم شہر سے دور تھا۔ سو بالآخر بچوں نے تعلیم ہوسٹل میں رہ کر پوری کی تھی۔ جگنو نے اپنی ساری جمع پونجی خضر کو چپکے سے

تھمائی تھی کہ وہ ضرغام کو دے دے۔ یہ کہہ کر کہ بڑی امی نے بھجوائے ہیں۔

''اگر انہوں نے نہ لئے۔''

''بڑی امی کا کہو گے تو وہ لے لے گا اور اس سے اس کا ایڈریس لے کر آنا۔''

اور خضر نے اگلے دن ہی اسے فون پر مایوسی سے بتایا تھا۔

''ضرغام بھائی کا دکان کے مالک سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ نوکری چھوڑ گئے۔ انہیں ضرغام بھائی کا پتا بھی نہیں معلوم تھا۔'' یہ محض اتفاق تھا کہ خضر کو حماد بھی نہ ملا۔ ورنہ شاید ضرغام کا ایڈریس ہی مل جاتا۔

''میں نے وہ پیسے سنبھال کر رکھ لئے ہیں آپی۔ واپسی پر۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ تم خرچ کر لینا۔'' جگنو نے بے حد خاموشی سے کریڈل پر ریسیور رکھا تھا۔

* * *

خوشگوار موسم کی
خوشگوار یادیں ہیں
تیرے سنگ بیتی ہوئی
بے شمار شامیں ہیں
وقت اڑتا پنچھی ہے
ہاتھ میں نہیں آتا
خوشگوار لمحوں کی
بے قرار یادیں ہیں
دن کی روشنی ہو گی
صبح ہم بھی دیکھیں گے
ابھی میری آنکھوں میں
بے شمار راتیں ہیں

مہکتی ہوئی خوشگوار ڈھلتی رات کے سائے چاندنی میں نہائے تھے۔ فوارے کے چمکدار پانی میں رنگ گھل مل رہے تھے۔ خوش رنگ پیراہن' چمکتے بے فکر چہرے۔ خوشبوئیں' اور اس کی آواز کا فسوں سارے ماحول پر حاوی تھا۔

کاش کوئی لمحے تو
...

میرے پاس آ بیٹھو
جھانک لو سمندر میں
گفتگو کا فن سیکھو
آنسوؤں کے در پردہ
سو ہزار باتیں ہیں

''خوب بہت خوب۔'' بے ساختہ تعریف پر اس کے لبوں پر ایک لمحے کو بھرپور مسکراہٹ ابھری اور آنکھیں دھندلا گئیں۔ چپکے سے اٹھ کر وہ کونے میں کھڑے حماد کے پاس آ بیٹھا۔ ویٹر نے اس کے ہاتھ میں بھی مشروب کا گلاس تھما گیا۔ وہ یونہی ہاتھ میں گلاس تھامے اندھیرے کونوں میں جھانکتا رہا۔

''اداس ہو؟''

ضرغام نے سر جھکا لیا۔ شاید اپنی نم پلکیں اسے نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

''تم پہلے سے زیادہ اچھا گانے لگے ہو۔''

''اچھا۔'' اس کا لہجہ بے یقین تھا۔

''ہاں۔'' حماد ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''پہلے تمہارے گیتوں میں صرف جدائی کے رنگ تھے۔ اب ان میں ہلکی سی دکھ کی آنچ سلگنے لگی ہے۔''

''یہ میری منزل نہیں تھی۔'' اس کا لہجہ سلگ رہا تھا۔ حماد نے اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر اسے قریب کیا۔

''جانتا ہوں۔''

پچھلے کئی دنوں بلکہ مہینوں سے کتنا خوار ہوئے تھے۔ کئی ریکارڈنگ کمپنیز کے کئی کئی چکر کاٹے تھے۔ مگر ہر بار ناکامی کے منحوس پنجے اس کے خوابوں کے سینے میں گڑے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ خون کرتے ہوئے ایسے ایسے لوگ بے نقاب ہوئے تھے کہ وہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔

''تم اپنے گیت مجھے دے دو۔'' یہ مکروہ چہرے والا اک غلیظ شخص تھا۔ خوابوں کا سوداگر۔

''کیا مطلب؟'' وہ اناڑی تھے' انجان اور بھولے۔

''میاں! بہت سیدھی سی بات ہے۔ تم مجھے کچھ گیت دو میں تمہیں اس کے اچھے پیسے دوں گا۔'' وہ خریدار بن کر آیا تھا۔ قدردان نہیں۔ ضرغام کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

''صاحب! ہم خواب نہیں بیچتے۔'' حماد نے بڑے ضبط سے جواب دیا تھا۔

''اچھا۔'' اس کی آنکھوں میں حقارت سی ابھر آئی۔ جس کے عقب میں کتنے سپنے بلک

رہے تھے۔سسک رہے تھے۔

''خواب بیچنا اور خریدنا۔کس قدر غلیظ کام ہے یہ اور اسے کرنے والے۔''

''یہ کارڈ ہے۔اگر کبھی۔'' حماد نے وہ کارڈ تھام کر پرزے پرزے کر دیا۔

''تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے حماد۔'' وہ بدستور گلاس پر نظریں جمائے تھا۔انگلیاں گلاس پر یوں جمی تھیں کہ پوریں سفید ہوگئی تھیں۔گلاس چیخ جاتا مگر حماد نے دھیرے سے تھام لیا۔

''میں بہت دور تک تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔'' حماد کے چچا اسے اپنے پاس بلا رہے تھے اور وہ انکاری تھا۔

''نہیں حماد! اب یہ ممکن نہیں۔وقت مجھے کہاں تک گھسیٹے گا۔میں نہیں جانتا۔''

''مگر تم کیوں......؟''

''یہ نظم تمہاری تھی؟'' وہ ہمیشہ کی طرح پہلو بچا گیا۔

''ہاں۔'' وہ روشنی میں کسی حسین چہرے پر نگاہ جما کر وہ مسکرایا اور پھر اداس ہوگیا۔یہ پہلا گیت تھا۔جو اس نے جس کیلئے لکھا اسے سنا نہ سکا' دل چاہا اس سے بات کرے۔اس کی آواز سنے۔

''مگر کیا کہوں گا اس سے۔''

سینہ فلک پر جگمگاتا چاند بدلیوں میں جا چھپا۔اس نے بہت چپکے سے اس تنہا آنسو کو بہنے سے روکا تھا۔

* * *

موسموں کا الٹ پھیر جاری رہا اور پورا ایک سال بیت گیا۔

بڑی امی آدھی بھی نہیں رہی تھیں اور آغا جان' جگنو کو وہ بھی بہت چپ چپ اور گم صم سے دکھائی دیتے۔ایک بیکراں سی سوچ ہمہ وقت ان کے چہرے کا احاطہ کئے رکھتی۔امی متفکر سی پھرتیں۔

اور جگنو' جگنو کو غصہ آنے لگتا۔

''کیوں کر رہا ہے وہ اس طرح۔کیوں سزا دے رہا ہے ہم سب کو۔اپنی خیریت کی اطلاع دینے پر تو کسی نے پابندی نہیں لگائی۔''

عنبرین' ثمینہ اور سمیرا کا شوق جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔اسے ابرارالحق کی طرح ٹی وی پر گاتے سننے کا۔وہ سرشام ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتیں۔شاید کبھی اس کا کوئی گانا کوئی جھلک بھی دکھائی دی جائے۔پھر یہ شوق بھی ختم ہوا اب ایک بار لوٹ آئیں۔پھر کبھی نہیں جانے دیں گے۔

جگنو نے کئی بار خضر سے پوچھا۔

''وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔'' خضر بس مایوسی سے کندھے اچکا کر رہ جاتا۔

''اگر میں کبھی لوٹا تو وجہ صرف تم ہوگی۔''

''میری خاطر لوٹ آؤ ضرغام۔'' وہ ہواؤں کے ہاتھ سندیسہ بھجواتی۔

* * *

آزر کب سے کرسی پر نیم دراز کھڑکی سے باہر دھوپ میں چمکتے نیلے آسمان پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔

اک بے نام سی سوچ کا عکس اس کے چہرے پر لہرا رہا تھا۔آج کل نجانے کون سی جنگ اس کے اندر چھڑی تھی کہ وہ خود سے بھی لڑتا دکھائی دیتا۔

اک مسلسل کشمکش تھی جو اس کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔

اک بے نام سی الجھن' جو ہمہ وقت چہرے پر چھلکتی۔اک فیصلہ تھا جو ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق تھا۔

پھپھو نے کئی بار بیٹے کو یونہی چپ کچھ سوچتے پایا تھا۔

عنبرین رسالہ پڑھ رہی تھی مگر اس کی توجہ بھی آزر کی طرف تھی جبکہ ثمینہ اپنے سوٹ کی کٹنگ میں مصروف تھی۔تب ہی عنبرین رسالہ رکھ کر ماں کی طرف جھکی۔

''امی بھائی کی شادی کر دیں۔''

''ہوں۔'' وہ چونکیں۔''کیا کہہ رہی ہو۔''

''امی! ہم بھائی کی شادی کر دیتے ہیں۔آپ دیکھتی نہیں آج کل وہ کتنے عجیب اور چڑچڑے سے ہوتے جا رہے ہیں۔اصولاً تو ان کی شادی ہو جانی چاہئے تھی۔''

''ہاں میں بھی سوچ رہی ہوں۔'' وہ اک طویل سانس لے کر سیدھی ہوئیں۔

''تو پھر ہم لڑکی دیکھیں۔'' عنبرین پرجوش لہجے میں بولی۔

''ہاں لڑکی تو ڈھونڈنی پڑے گی۔خاندان میں تو اس کے جوڑ کی کوئی لڑکی نہیں۔''

''پہلے بھائی سے تو پوچھ لیں ان کی کوئی پسند تو نہیں۔'' ثمینہ نے طعنہ دیا۔

''ہاں! یہ زیادہ بہتر ہے۔'' پھپھو نے کہا۔

''امی! یہ زیادہ بہتر ہے۔'' پھپھو نے کہا۔

''امی! آپ پوچھیں۔ابھی۔'' عنبرین نے جلد بازی دکھائی۔

''آزر! انہوں نے پکارا تو اپنی سوچوں میں الجھتا آزر چونکا۔

''جی امی۔''

''ادھر میرے پاس آؤ بیٹا۔'' انہوں نے پیار سے پکارا تو وہ الجھے بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتا ان کے پاس آبیٹھا۔

''کیا سوچتے رہتے ہو۔'' انہوں نے پیار سے اس کے ماتھے پر بکھرنے بال سمیٹے۔

''کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ نظریں چرا گیا۔

''اب تو ماں کے پاس بیٹھنے کا وقت بھی نہیں تمہارے پاس۔'' انہوں نے شکوہ کیا۔

''امی! آپ تو جانتی ہیں۔ آغا جی کا سارا کام۔''

''امی مطلب کی بات کریں۔'' ثمینہ بے تاب ہوئی۔ آزر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''تمہاری بہنیں اب بھابی لانا چاہتی ہیں۔''

آزر کی نگاہوں میں ایک ہی شبیہ اتری تھی۔ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''بیٹا! تمہاری اگر کوئی پسند ہے تو بتا دو۔''

''ورنہ ہم خود بھابی ڈھونڈ لیں گے۔'' ثمینہ نے کہا۔

''ہاں۔ پھر اعتراض مت کیجئے گا۔'' عنبرین نے فٹ سے کہا۔

''امی! میں......'' فیصلہ نوک زباں پر آکر اٹک گیا تھا۔

''بتاؤ نا۔ بس لڑکی پڑھی لکھی اور سلیقہ مند ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔''

''امی! میں' میں جگنو سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

عنبرین کے ہاتھ سے رسالہ' ثمینہ کے ہاتھ سے قینچی چھوٹ گئی تھی اور پھپھو ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

* * *

''یہاں ایک صاحب تھے۔ احمد مرتضیٰ صاحب۔'' اس نے کوئی چوتھی بار پوچھا تھا۔ ٹی وی اسٹیشن کے چھوٹے سے کمرے میں بھانت بھانت کے لوگ بھرے تھے۔ وہ کب سے ایک کونے میں کھڑا کمرہ خالی ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

''وہ آگئی ہیں ثریا بیگم۔'' انہوں نے چوتھی بار بھی اس کا سوال نظر انداز کیا تھا۔

''جی سر جی۔''

''بس ریہرسل شروع کرواؤ۔ میں آ رہا ہوں اور یہ کمرہ خالی کرواؤ۔''

''سر! وہ یہاں......''

''ان کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا ہے اب کہو۔'' کان میں تیلی چلاتے ہوئے انہوں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ضرغام کا دل دھک سے رہ گیا۔

''وہ' وہ پھر کب آئیں گے۔''

ان صاحب نے غور سے اسے اور پھر اس کے گٹار کو دیکھا۔

''گانا گانے آئے ہو۔''

''جی سر! ان کے سیاہی مائل لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھری۔

''بچے آواز اچھی ہو جانے سے گانا گانا نہیں آجاتا۔ اس کیلئے ریاضت چاہئے ریاضت۔''

''سر! انہوں نے میرا آڈیشن لیا تھا۔'' اس نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔

''اچھا۔'' انہوں نے غور سے اسے دیکھا۔

''سر! انہوں نے مجھے چانس دینے کا وعدہ کیا تھا۔''

''سر جی! سب کچھ ریڈی ہے۔''

''اچھا میاں دیکھو! اس وقت تو میں مصروف ہوں ایسا کرو تم صبح آجانا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے تھے۔

''صبح۔'' ضرغام کے لہجے میں مایوسی در آئی۔ ''وہ گیٹ کیپر تو اندر گھسنے ہی نہیں دیتا۔''

انہوں نے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف اچھالا۔ ''یہ لے جاؤ اور کل آجانا اور سنو دس ہزار روپے ہوں گے تمہارے پاس۔'' پہلے جب چہروں سے نقاب اترتے تھے تو غصہ آتا تھا۔ سب کچھ تہس نہس کر دینے کی خواہش دل میں ابھرتی تھی۔ وہ حماد کے سامنے اس فیلڈ میں ہونے والی کرپشن پر تقریر جھاڑتا تھا۔ اب...... اب کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بس اک دکھ تھا جو کانٹوں کی طرح دل کو اپنے گھیرے میں لے لیتا تھا۔ وہ خاموشی سے چہرہ جھکا کر وہاں سے نکل آیا۔

حماد رات گئے واپس لوٹا تو وہ ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکتی چاندنی پر نظریں جمائے دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھے لیٹا تھا۔ رات کے پچھلے پہر فضا میں رینگنے والا سناٹا اس کے وجود کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا۔

''کیا بنا؟'' یہ سوال بے معنی تھا اور حماد نے صرف اس کے وجود پر حاوی سناٹے کو توڑنے کیلئے پوچھا تھا۔

''تم کہاں تھے صبح سے؟ وہ اسے اب لحہ بہ لحہ اذیت دیتی کیفیت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے کیا بتاتا کئی مہینے ٹی وی اسٹیشن کی عمارت کے سامنے دھوپ جھلتے اور بارش میں بھیگنے

کے بعد جب وہ اندر گیا تو اس سے کیا کہا گیا۔

وہ تو کہہ دیتا۔

"کرپشن کہاں نہیں ہے۔"

پھر اسے تسلیاں دیتا، کوئی نئی امید زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کرتا۔ مگر اسے اب ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔

حماد نے خاموش سی نظر اس پر ڈالی اور الماری میں نجانے کیا ڈھونڈنے لگا۔

"تمہاری تیاری مکمل ہوگئی۔"

حماد نے شاکی نظروں سے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور چاندنی اس کے آدھے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ وقت نے اسے کتنا بدل دیا تھا۔

"تمہیں میری ضرورت ہے ضرغام۔"

"نہیں مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ تم انگلینڈ چلے جاؤ اپنے چچا کے پاس۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور کروٹ بدل لی۔ حماد نے اسے جارحانہ انداز میں اپنی طرف کھینچا۔

"اور تم۔"

"میں تمہارا مسئلہ نہیں۔" ضرغام کا لہجہ بہت کٹھور اور بیگانہ تھا۔ حماد نے لب کھینچ کر اسے دیکھا۔

ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

* * *

جگنو کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔ آزر یہ کہہ سکتا ہے۔ شاید وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

"کیا ایسا سوچا بھی جا سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی جس کے عقب میں جھانکتا دکھ محسوس کر کے عنبرین افسردہ ہوگئی۔

"مجھے خود حیرت ہے آزر بھائی نے ایسا کیوں کہا۔"

"وہ بچے تو نہیں۔"

"شاید وہ ضرغام اور جگنو کے درمیان کوئی دوسرا تعلق محسوس ہی نہ کر پائے ہوں۔" عنبرین نے بھائی کا دفاع کرنا چاہا۔ جگنو کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ ثمینہ چڑ گئی۔

"فضول بات مت کرو۔ آزر بھائی بچے نہیں ہیں کہ وہ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد

ان دونوں کی آنکھوں میں چھلکتے جذبوں کو محسوس نہ کر پائے ہوں۔ محبت خوشبو ہوتی ہے۔ سب دیکھتے ہیں جانتے ہیں۔ ضرغام نے کبھی میرا اور تمہارا اتنا خیال نہیں رکھا۔ زندگی کی معمولی سے معمولی بات وہ سب سے پہلے جگنو سے شیئر کرتا ہے۔ اس کیلئے گیت لکھتا ہے۔ ضرغام جگنو کو چاہتا ہے یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں۔"

"ضرغام یہاں نہیں ہے۔" عنبرین نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"لو کیا وہ کبھی لوٹے گا بھی نہیں۔ جگنو میرے بھائی کی امانت ہے۔" سیمرا جگنو کا ہاتھ کھینچ کر بولی تھی۔ جگنو نے تسلی آمیز انداز میں اس کا ہاتھ دبا دیا۔

"تم لوگ اک بے بنیاد بات پر جھگڑ رہے ہو۔"

"ہاں تو اور کیا۔ جتنا ہمیں آزر بھائی عزیز ہیں اس سے کہیں زیادہ ضرغام سے پیار کرتے ہیں۔ آزر بھائی کی بات کا کوئی سر پیر نہیں۔ ایک فضول سا خیال سمایا ہے ان کے ذہن میں۔ نکل جائے گا۔ اسی لئے تو امی نے ابھی تک یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ وہ جانتی ہیں بڑی امی جگنو کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔" ثمینہ نے تسلی دی۔ وہ سب اپنے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔ جگنو چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔

"تو یہ وجہ تھی۔" آئیوی کی بیل کے پاس کھڑے ہو کر اس نے سوچا تھا۔

"جگنو۔" آزر اس کے عین پیچھے آن کھڑا ہوا۔ وہ پلٹی نہیں یونہی آئیوی کے پتے نوچ کر مسلتی رہی۔

"جگنو! میں......"

"میں ہمیشہ سوچتی تھی آزر بھائی۔ آپ کو ضرغام سے کیا پرخاش ہے آج سمجھ میں آیا۔ مگر آزر بھائی۔ جو آپ سوچتے ہیں وہ کبھی نہیں ہوگا۔ کبھی بھی نہیں۔"

وہ سختی سے کہہ کر پلٹ گئی تھی۔ آزر لب بھینچے نجانے کیا سوچنے لگا۔

* * *

اجنبی شہر کے اجنبی راستے میری تنہائی پر مسکراتے رہے۔ میں بہت دیر تک یونہی چلتا رہا تم بہت دیر تک یاد آتے رہے۔ ضرغام نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔

حماد انگلینڈ چلا گیا اور اسے جانا ہی تھا۔ بہت خفا تھا اس سے مگر جاتے جاتے اس کے گلے لگ کر بولا تھا۔

"سنو! جب تم لندن کنسرٹ کرنے آؤ گے تو میرے پاس ٹھہرا کرنا۔"

"میں...... میں لندن آؤں گا اور وہ بھی کنسرٹ کیلئے واٹ جوک" وہ خود پر ہنس رہا تھا۔

حماد سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ڈیئر فرینڈ! اب تو دل چاہتا ہے خواب دیکھنا چھوڑ دوں۔''

''مر جاؤ گے۔''

''مر تو گیا ہوں۔ کیا پایا میں نے جدائی' دکھ' دھکے' زخمی خواب' ادھوری تعلیم میں کسی کو کچھ نہ دے پایا۔ نہ خود کو اور نہ ہی۔''

وہ دور کھڑے پی آئی اے کے طیارے کو دیکھ رہا تھا۔

''تم ایسی باتیں کرو گے تو میں نہیں جاؤں گا۔''

''نہیں تم جاؤ' میں آؤں گا تمہارے پاس لندن۔ کنسرٹ کے سلسلے میں۔'' آخر میں وہ خود ہی ہنس دیا۔ اک مجروح و مغموم ہنسی۔

حماد نے تب بہت شاکی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر پر یقین لہجے میں بولا۔

''تمہیں آنا ہے۔ میں انتظار کروں گا۔'' اور اب وہ سوچ رہا تھا کیا وہ واپس لوٹ جائے۔

چھوٹی موٹی محفلوں میں گانا' کبھی کبھار سٹیج پر موقع مل جانا۔ وہ دھیرے دھیرے خود کو ضائع کر رہا تھا۔ اس کے سارے گیت اس کے اندر کہیں سسکتے رہتے۔ نئے ٹیلنٹ کو آگے لانے اور حوصلہ افزائی کی باتیں کرنے والوں کے سارے دعوے اوندھے منہ پڑے تھے۔

مایوسی' تنہائی' بیروزگاری اور رویوں نے دھیرے دھیرے اس کے آرزوؤں کے چاند کو گہنا دیا تھا۔ تب ایک دن حد درجے مایوسی کے عالم میں وہ ہارے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں اپنے خواب بیچنا چاہتا ہوں۔''

سننے والے کے وجود پر سناٹا چھا گیا۔ ریکارڈنگ کا بٹن آف کرتے ہوئے وہ اس کی طرف پلٹا۔ سامنے والے کی حالت واقعی ایسی ہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ خواب بیچنے آیا ہے۔ لٹا لٹا اور بکھرا ہوا۔

''خواب بیچے نہیں جاتے دوست۔'' وہ اس کے خالی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا تھا۔ مگر وہ بضد تھا۔

''مجھے بیچنا ہیں۔ ایک اچھی قیمت پر۔'' سیاہ جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس نوجوان کی مسکراتی آنکھوں میں سنجیدگی در آئی۔

''خوابوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی دوست اور یہ بیچے اور خریدے بھی نہیں جاتے یہ پلکوں پر سجتے ہیں۔ محبتوں سے سینچے جاتے ہیں اور محبتوں کے ساتھ بانٹ دیئے جاتے ہیں۔ خواب' محبت'

خلوص اور وفا بانٹنے والے جذبے ہیں خریدنے اور بیچنے والے نہیں۔''

ضرغام نے بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے اسے دیکھا۔

''میرا نام رمح تابش ہے۔ میں نے دو سال قبل یہ ریکارڈنگ کمپنی قائم کی تھی۔ پچھلے سال نجم شیراز کا البم یہیں سے ریلیز ہوا ہے۔''

''مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' ضرغام سپاٹ لہجے میں بولا۔

''مجھے ہے آؤ میرے ساتھ۔''

ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ جب آپ سمجھتے ہیں دنیا آپ کے قدموں تلے ہے یہ دنیا آپ کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لیتی ہے اور جب آپ سمجھتے ہیں یہ زمین کا آخری کنارہ ہے۔ ایک قدم بھی اٹھا تو تب ہاں تب بہت چپکے سے کوئی ہاتھ بڑھتا ہے اور کھینچ لیتا ہے سینے میں بھینچ لیتا ہے اور خوابوں کی تعبیر بن جاتا ہے۔

وہ حماد' یہ رمح تابش۔ یہ سب وہی ہاتھ ہیں۔ چپکے سے کھینچ لینے والے' رستے زخموں پر مرہم رکھ کر زخمی آنکھوں میں نئے خواب بھر دینے والے۔

رمح تابش ابھی ینگ تھا۔ مگر اس کی جوہر شناس نگاہوں نے اس کو پہچان لیا تھا۔ ضرغام خود گیت لکھتا اور خود ہی سروں میں ڈھالتا تھا اور وہ رمح تابش کہتا تھا۔

''ضرغام صاحب تم بہت آگے جاؤ گے۔ بہت آگے۔'' اور وہ مسکرانے لگتا تھا۔ مایوس نگاہوں میں اک نئی جوت جاگنے لگتی۔ وہ دن رات اپنے البم پر کام کر رہا تھا۔

اور جس دن اس کا آخری گیت ریکارڈ ہوا رمح تابش نے اسے گلے لگا لیا تھا۔

''تم دیکھنا۔ ضرغام صاحب! یہ البم سارے ریکارڈ توڑ دے گا۔'' ضرغام کو رمح کی ہر بات پر یقین تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ تم یہ گیت۔ میں تمہارا ساون ہوں' کس کیلئے گاتے ہو؟'' اور ضرغام ہنس دیا تھا بولا کچھ نہیں۔

اور جب اس کا البم ریلیز ہوا رمح کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک تہلکہ مچ گیا تھا۔ ہر جگہ ریکارڈ سیل ہوئی تھی۔ ضرغام اور رمح خود بھی آڈیو سینٹر پر جا کر معلوم کرتے تھے۔

''جب اس کا ویڈیو بنے گا تب دیکھنا۔''

''رمح ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو۔'' ابھی ابھی وہ اک آڈیو سینٹر سے باہر نکلے تھے۔

"اس ویڈیو میں کوئی لڑکی نہیں ہوگی۔"
"واٹ۔ مگر اس کے بغیر۔"
"پلیز۔" میں تمہارا ساون ہوں کا ویڈیو بھی رمح ہی بنا رہا تھا۔
"اچھا میں سمجھا۔ وہ خفا ہو جائے گی نا۔" رمح شرارت سے ہنسا۔
"خفا تو وہ ہوگی۔" اس کی نگاہ فون بوتھ پر پڑی۔
"تمہارے پاس سکے ہوں گے۔" ضرغام نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ رمح نے فون کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔
"میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔" تیسری بیل پر سمیرا نے اٹھایا تھا۔
"سمیرا میں ضرغام۔" اور سمیرا نے چیخ چیخ کر سارا گھر اکٹھا کر لیا تھا۔ وہ سب ایک ساتھ بول رہے تھے، نم پلکوں سے مسکرا رہے تھے۔
"تم لوگوں نے دیکھا سمیرا! میں نے اپنی منزل کو پالیا۔" وہ فرط جوش سے بولا تھا۔ دوسری طرف نجانے کیوں سمیرا ایک لمحے کو خاموش سی ہوگئی۔ پھر بڑی امی نے ریسیور تھام لیا۔ وہ ان کی تسلی کرانے لگا۔ جگنو نجانے کہاں تھی۔
آغا جی اندر داخل ہوئے تو وہ سب فون سے چپٹے تھے۔ سامنے ٹیبل پر ضرغام کا کیسٹ "ساون" پڑا تھا۔ آغا جی نے آہستگی سے اسے اٹھا کر دیکھا۔ ریڈ کلر کی شرٹ پہنے گٹار کے سہارے کھڑا وہ ذرا سا جھکا کیمرے کی آنکھ میں دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اک شوخ سا تبسم نگاہوں سے عیاں تھا۔ بیک گراؤنڈ میں اک درخت اور برستی بارش کا منظر دھندلا سا تھا۔
بڑی امی کہہ رہی تھیں۔
"اب آجاؤ بیٹا! بتاؤ کب آرہے ہو؟"
"امی میں۔" اسپیکر آن تھا۔
"اس سے کہو اب وہ کبھی اس گھر میں قدم مت رکھے۔"
آغا کی سرد آواز پر دونوں طرف مکمل خاموشی چھا گئی تھی اور پھر آہستگی سے رابطہ کٹ گیا۔

* * *

اک بار پلٹ کر دیکھو
میں تمہارا ساون ہوں
بیتا تو لوٹ آؤں گا
اک آشا من میں جگاؤں گا

تیرے من کو بھی مہکاؤں گا
ذرا اپنے حسن میں جھانکو

شنگریلا اور بھوربن میں ویڈیو بنی تھی۔ چھاجوں چھاج برستے مینہ کے پیش منظر میں وہ تھا۔ اپنے مختلف روپ دکھاتا۔ دونوں گانوں میں لڑکی نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے بہت انہماک سے سن رہی تھی۔ لبوں پر اک خوبصورت سی مسکان تھی۔ مگر نگاہوں میں بھوربن کے خوبصورت مناظر نہیں تھے۔ ندی کنارے گزرا ایک لمحہ تھا۔
راستے تو بھیگیں گے
چاہتوں کی بارش میں
تم بھی...... آزر نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر چینل بدل دیا۔ جگنو نے پلٹ کر دیکھا۔ ناگواری کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی۔ آزر کو دوسرے پل ہی اپنی غلط حرکت کا احساس ہوا۔
سوری وہ میں۔" جگنو خاموشی سے اٹھ کر اوپر چلی گئی۔
"کیا ہو جاتا ہے مجھے۔" آزر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رہ گیا اور بہت دیر بعد وہ باہر نکلا تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ سب لوگ خود ساختہ سرگرمیوں میں خود کو الجھائے مصروف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔
"ثمینہ! جگنو کہاں ہے؟" اس نے پاس سے گزرتی ثمینہ کو روکا۔
"اوپر گئی تھی بہت پہلے۔"
وہ اسے ڈھونڈتا ہوا ضرغام کے کمرے میں آگیا۔ کھلی کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے وہ برستی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے وسیع و عریض کھیتوں پر بارش کا غبار چھایا تھا۔ ہوا کھیتوں پر یوں لہریں بنا رہی تھی کہ سبز سمندر کا گماں ہوتا تھا۔ دو بچے کھیتوں کے درمیان گم ہوتی پگڈنڈی پر بھاگے جا رہے تھے۔
آزر جانتا تھا۔ یہ منظر ضرغام کا پسندیدہ منظر تھا۔
اڑتے بال، لہراتا آنچل، کبھی کبھی بارش کی بوچھاڑ اسے بھگو جاتی۔ مگر وہ بے خبر کھڑی تھی۔
جگنو! آئی ایم سوری۔" کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ ٹکا کر اس نے آہستگی سے کہا جگنو نے ذرا کی ذرا نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ اسے قریب کھڑے دیکھ کر اس کے اندر غصے کی لہر سی اٹھی تھی۔ وہ کترا کر نکل گئی اور بے مقصد ہی بیڈ شیٹ جھاڑنے لگی۔
"مجھے نہیں معلوم کبھی کبھی مجھے کیا ہو جاتا ہے۔" دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا کر اس نے باہر جھانکا۔ جگنو نے گویا اسے سنا نہیں۔ چپ چاپ کام کرتی رہی۔ آزر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"تم یہاں کیوں آ گئیں۔" جگنو کا دل چاہتا تھا وہ اس سے خوب لڑے مگر نجانے کیوں ہر بار ضبط کر جاتی۔

"میں یہاں صفائی کرنے آئی ہوں۔"

آزر نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔ پر کارنس پر رکھے گلدان میں کھلے گلاب کے تازہ سجے پھولوں کو اس کی انگلیوں نے دھیرے سے ان کی پتیوں کو چھوا۔

"کیا وہ آنے والا ہے؟" جگنو کو اس کا استفہامیہ لہجہ استہزائیہ لگا۔

اس کا ہاتھ ایک لمحے کو رکا۔ پھر وہ اس کی طرف پلٹی تو اس کی نگاہوں میں بے خوف سی جرأت تھی، اعتماد تھا۔

"وہ یہاں سے کبھی نہیں گیا۔"

آزر کی بے باک نظریں اسکی طرف اٹھیں۔ وہ یونہی جرأت آمیز مسکان لبوں پر سجائے اسے دیکھتی رہی۔ آزر نے نظروں کا زاویہ بدل کر کرسٹل کی ڈانسنگ گرل کو دیکھا۔ جو دونوں بازو ہوا میں پھیلائے منتظر تھی۔ آزر نے بلا ارادہ ہی بٹن پش کر دیا۔ کمرے میں دھیما سا میوزک بکھر گیا اور گڑیا ایک دائرے میں چکرانے لگی۔

"ارمان کرسٹل کی گڑیا نہیں ہوتا آزر! آپ کبھی بھی بٹن دبا کر اسے اک دائرے میں گھومنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔" جگنو نے گول گول گھومتی گڑیا پر نظریں جما کر کہا تھا۔ آزر کا رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوا۔

"جگنو! تم اس سے محبت کرتی ہو؟" آزر نے بہت اچانک پوچھا تھا۔ جگنو گھبرائی نہیں۔ بس ایک لمحے کو خاموش ہوئی تھی۔

"تم یہ جانتے ہو، محسوس کرتے ہو اور اسے برداشت بھی نہیں کر سکتے تو سوال کیوں کر رہے ہو۔" وہ چند قدم آگے آ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے آزر میں تم سے شادی کر رہی ہوں مگر تم جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا۔"

آزر نے اپنی دنیا میں مگن گڑیا کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ وہ بلندی سے گری اور چکنا چور ہوگئی۔ جگنو نے بے اختیار جھک کر بکھرے کانچ اٹھانے چاہے تھے۔ آزر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اب تو کچھ بھی نہیں بچا۔" آزر کا لہجہ عجیب سا تھا۔ جگنو نے اس کی سمت دیکھنا چاہا۔ آزر نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ جگنو کی نگاہیں بکھرے کانچ سے الجھ رہی تھیں۔

* * *

اور اب وہ یہاں لندن میں بیٹھا تھا۔ حماد کے فلیٹ میں۔ باہر بارش صنوبر کے سبز پتوں کو بھگو کر سرخ فٹ پاتھ پر بہہ رہی ہے اور وہ دھند میں ڈوبے کلیسا کے غیر واضح خدوخال دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"زندگی میں وہ کون سا مقام ہوتا ہے جب ہم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خود کو خالی خالی سا محسوس کرتے ہیں۔"

"یہی ہاں یہی وہ مقام ہے۔"

جب رخ تابش نے اسے بتایا کہ "پاکستانی فنکاروں کا ایک وفد لندن جا رہا ہے۔ بڑے بڑے فنکار ہیں۔ تم بھی جاؤ گے۔ شہر کے آرگنائزر نے مجھ سے بات کی ہے۔"

تو وہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔

"میں...... میں بھی۔"

"ہاں تم بھی، جانتے ہو پہلا شو لندن کے تاریخی ویمبلے ہال میں ہوگا۔ جہاں بڑے بڑے فنکار پرفارم کرتے ہیں اور دوسرا بریڈفورڈ کے سینٹ جورجز ہال میں۔ اٹس آ گریٹ آنر ٹو یو۔"

وہ رخ تابش تھا جس نے ضرغام صہیب کو انگلی پکڑ کر پھر سے چلنا سکھایا تھا کبھی کبھی وہ سوچتا اگر رخ اسے نہ ملتا تو کیا ہوتا۔

ضرغام نے فوراً حماد کو فون کیا تھا اور وہ چیخ اٹھا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا۔ اب تم میرے پاس ٹھہرو گے جب تک لندن میں ہو۔ اور اب......"

اب وہ حماد کے فلیٹ میں بیٹھا صنوبر کے سبز پتوں کو بھیگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پہلا شو بہت کامیاب ہوا تھا۔ کئی منجھے ہوئے فنکاروں کے درمیان وہ تنہا نیا فنکار تھا۔ مگر لوگوں نے اسے سنا اور بہت محبت سے سنا۔ اس نے پورے ڈھائی گھنٹے پرفارم کیا تھا۔ لوگوں کی بار بار فرمائش پر۔ کچھ لوگوں کی نگاہوں میں اس کیلئے حسد تھا تو کچھ میں رشک' کل انہیں بریڈفورڈ جانا تھا اگلے شو کیلئے۔ اس نے گھر فون کیا تھا۔ اور اب وہ سوچ رہا تھا۔

سب کچھ پا کر میں نے کیا کچھ کھو دیا۔ شہرت کے آسمان پر بیٹھ کر کیا اب کبھی میں کوئی خوشی دیکھ پاؤں گا۔

"آپ نے بہت برا کیا ہے بھائی۔ بہت برا۔ آپ نے شہرت پر محبت کو قربان کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ اتنے اتنے گھٹیا ہوں گے۔ محبت آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی کبھی نہیں۔" سمیرا کی سسکتی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی۔

"برسوں پہلے میں ایک رات جس لمحے سے خوفزدہ ہوا تھا وہ میرے سامنے آ کھڑا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔"

"جنہیں محبت مجرم ٹھہراتی ہے انہیں کہیں پناہ ملتی ہے حماد یا نہیں؟"

برسوں بعد وہ پھر اسی طرح خوفزدہ ہوا تھا۔ حماد متحیر سا اسے دیکھ رہا تھا۔ "حماد! اس نے مجھے روکنا چاہا تھا۔ مگر...... میں نے اس کی بات سنی ہی نہیں اب وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔"

فون کی گھنٹی بلک رہی تھی۔ حماد نے ریسیور اٹھا لیا۔

"بددعاؤں کے حصار میں جینا بہت مشکل ہے حماد اور جب محبت بددعا دیتی ہے تو......"

"لو پاکستان سے فون ہے۔" حماد نے ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔ وہ محض خوفزدہ نظروں سے ریسیور کو دیکھ کر رہ گیا۔

* * *

کھڑکی کے پٹ کھولے وہ کب سے برستے ساون کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"وہ ایک شخص تھا۔ جب عام تھا تو کتنا خاص لگتا تھا۔ اب خاص ہے تو عام بھی نہیں لگتا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔"

"نہیں، میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ اسے بھول جاؤں۔ اسے اپنے اندر سے نکالنے کی اک بے چاری سی کوشش کر رہی ہوں۔" سمیرا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"تو ہوا یہ ضرغام صہیب تم نے اپنی منزل پا لی اور منزل پر پہنچنے والے کبھی پیچھے رہ جانے والوں کو پلٹ کر نہیں دیکھتے۔" اس نے بارش کے زور پر جھک جانے والی آئیوی کی بیل کو دیکھا۔

زندگی موسم کے ادل بدل کا نام ہے یہ ساون......"

اس نے برستی بوندوں کو ہتھیلی میں سمیٹنے کی کوشش کی۔

"یہ ساون صدیوں اس دھرتی پر برسا ہے...... پھر بھی ہر بار نیا لگتا ہے۔ ہر بار اس میں اک نیا رنگ ابھرتا ہے مگر اب کے برس ساون بے رنگ ہے۔ عجیب بیزار اور اکتایا ہوا جیسے برسنا اس کے معمول میں شامل ہو۔

نہ بارش کی پائل چھنکتی ہوئی......

نہ پھولوں کے بدن مہکے...... معطر

نہ بنجر زمین سے سرسبز خوشبو پھوٹی

ہر بوند اک آنسو کی طرح گرتی ہے دھرتی پر

"آج میری منگنی ہے آزر مراد کے ساتھ"

اس نے اک اذیت سی رگ و پے میں اترتی محسوس کی

قصور میرا نہیں، آزر اور ساون کا بھی نہیں، ہاں تقدیر کا کہہ سکتے ہیں۔ مگر نہیں......

کبھی تقدیر ہماری قسمت کی باگ ہمارے ہاتھوں میں دے کر کہتی ہے۔ لو جدھر چاہو رخ موڑ لو۔ تقدیر نے ایسا ہی اک چانس دیا تھا مگر...... مگر ضرغام نے کھو دیا۔ شہرت کا نشہ سا تھا۔ اب دیکھ بھی لیا۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔ میری اولین چاہت میوزک ہے۔

تو پھر میں کہاں تھی۔ شاید کہیں بھی نہیں۔

وہ ایک تلخ سی ہنسی ہنسی پھر چپ ہو کر باہر جھانکنے لگی۔ تبدیلی بہت آہستگی سے آئی تھی۔ پھپھو نے جب آغا جی سے بات کی تو ہنگامہ سا ہو گیا۔ بڑی امی خفا تھیں۔ انہوں نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ مگر آغا جان خاموش تھے وہ ضرغام سے بہت خفا تھے۔ جب اس نے گھر چھوڑا اور پھر اپنی ضد کو منوایا۔ آغا جی نے سوچا تھا وہ عمر بھر ایسی نافرمان اولاد کی شکل نہیں دیکھیں گے۔ پھر وہ مشہور ہو گیا۔ لوگ ان سے کہتے۔

"واہ صاحب واہ! آپ کے بیٹے نے تو کمال کر دیا۔"

آغا جی کو لگتا۔ وہ طنز کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوا نہیں۔ اس نے واقعی کچھ کیا ہے۔ لوگ اس کے پیچھے پاگل ہوتے تھے۔ وہ جہاں سے گزرتے لوگ اشاروں میں کہتے وہ دیکھو ضرغام کے والد ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ جھنجھلاتے۔ شروع شروع میں ٹی وی پر اس کا گانا چلتا وہ گرج کر بند کروا دیتے۔ پھر اگنور کرنے لگے اور وہ وقت آیا جب وہ گاتا تو آغا جی بے خیالی میں ٹکٹکی باندھے اسکرین کو گھورنے لگتے۔

جب آزر کی خواہش کا علم ہوا تو وہ بھی دم بخود رہ گئے تھے۔ جگنو کی امی خاموش تھی۔ ضرغام بہت اچھا تھا تو کم آزر بھی نہ تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ پھپھو نے آغا جی کے سامنے جھولی پھیلا دی۔

"میرا بیٹا سات سال بعد لوٹا ہے۔ وہ چلا گیا تو میں بے موت ماری جاؤں گی۔ پھر ضرغام تین سال سے نہیں لوٹا۔ اپنی یتیم بھتیجی کے مستقبل کا تو سوچیں۔"

بڑی امی نے ان کی اس بات پر ہنگامہ کر دیا تھا۔ تب آغا جان نے فیصلہ کیا تھا۔ "ضرغام کو بلواؤ اگر وہ آ جاتا ہے تو ٹھیک۔ ورنہ میں جگنو کی منگنی آزر کے ساتھ کر دوں گا۔"

تب...... ہاں تب جگنو نے ضرغام کو فون کیا تھا۔ پورے یقین کے ساتھ کہ وہ آ جائے گا۔ ضرغام کو جلدی تھی۔ اسے پہلے اسلام آباد جانا تھا، پھر کراچی، اس نے جگنو کی بات ہی نہیں سنی۔ بس اپنا پروگرام بتاتا رہا۔

"تم میری بات تو سنو۔"

"یار بالکل بھی وقت نہیں۔ باہر گاڑی کھڑی ہے فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔"

''ضرغام وہ میری منگنی کر رہے ہیں۔''

''واٹ؟'' وہ ذرا دیر کو ٹھٹکا۔ پھر ہنس دیا۔

''کم آن یار! اٹس امپاسیبل تم انہیں روک کر رکھو میں پانچ دن بعد آؤں گا۔'' پتا نہیں اس نے جگنو کی بات کو سنجیدہ کیوں نہیں لیا تھا اور ٹھیک پانچ دن بعد جگنو نے فون کیا تو معلوم ہوا وہ لندن چلا گیا ہے پندرہ دنوں کیلئے۔

فیصلے کی گھڑی اس کے ہاتھ سے پھسل گئی تھی۔

* * *

وہ کب سے مسجد کے مینار پر اڑتے بھیگے پروں والے پرندے کو دیکھ رہا تھا۔ نیچے منچلے پانی کے چھینٹے اڑا کر گاتے ہوئے زور زور سے گا رہے تھے۔

''آج میری جگنو کے ساتھ منگنی ہے اور میرا دل گھر جانے کو نہیں چاہتا' جگنو جو میری محبت ہے۔ جس کے چہرے پر پڑنے والی پہلی نظر میری ساری تشنگی کا خاتمہ کر گئی تھی۔ میں نے جگنو کو واقعی چاہا تھا۔ تب ہی جب ضرغام نے وہ گھر چھوڑا تو میرے اندر کمینی سی خوشی ابھری تھی۔''

چپڑاسی اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ گیا تھا اور وہ پھر سے سوچ رہا تھا۔

''جگنو ضرغام کو چاہتی ہے۔ یہ بات میں جانتا تھا۔ مگر میں نے سوچا ضرغام چلا جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ مجھے چاہنے لگے گی۔ آخر کمی کیا تھی مجھ میں۔ مگر میں یہ بھول گیا۔ ضرغام اور جگنو کی محبت ایک لمحے کا نتیجہ تو نہیں جو ایک پل میں معدوم ہو جائے۔ وہ اس کے ساتھ پل کر جوان ہوئی ہے۔ پھر بھی مجھے بہت برا لگتا۔ ضرغام چلا گیا تھا اور وہ...... وہ پھر بھی میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی۔ میں کہاں ہوں اسے معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا نکاح کا بندھن ہمیں ایک محبت بھری ڈور میں باندھ دے گا۔ (عجب بچکانہ واحمقانہ سی سوچ تھی)

مگر اس دن جب جگنو نے مجھ سے پوچھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا تو بہت اچانک کرسٹل کی گڑیا میرا ہاتھ لگنے سے گر کے چکنا چور ہو گئی۔ وہ بے اختیار اس کانچ کو اپنے ہاتھ میں بھرنے لگی تھی۔ میں جانتا تھا یہ گڑیا جگنو نے ضرغام کو گفٹ کی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ انجام تو میرے سامنے تھا۔

میں نے ان آنکھوں کے کانچ ٹوٹ کر بکھرتے دیکھے تھے۔ تب ہاں تب میں نے ضرغام کو فون کیا تھا لندن۔

گلاس ونڈو کے شیشے دھندلا گئے تھے۔ سامنے مینار پر اترا پرندہ بارش میں راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔

''میں نے اس سے بس اتنا کہا تھا۔ ضرغام تمہیں چند لمحے دے رہا ہوں فیصلہ کر لو۔ تمہاری

[...]ین چاہت میوزک ہے یا جگنو۔''

''اور آج میری جگنو کے ساتھ منگنی ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ ضرغام نے شہرت اور محبت میں [...]س کا انتخاب کیا۔ نجانے اس کہانی کا انجام کیا ہوگا۔''

* * *

''بارش ہے کہ برسے چلے جا رہی ہے لگتا ہے سارا ساون آج ہی برسے گا۔'' سمیرا حد [...]ے جھنجھلائی ہوئی تھی۔ پھر جگنو کو کھڑکی میں کھڑا دیکھ کر تپ کر بولی۔

''بند کرو یہ کھڑکی۔ جس کی راہ تکتی ہو۔ اسے اب نہیں آنا۔''

جگنو نے پلٹ کر شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ سمیرا جھنجھلائی ہوئی تھی۔ اپنے بھائی سے خفا [...]ی اور جگنو کیلئے پریشان۔

''کپڑے بدل لو۔ آزر بھائی آتے ہوں گے۔'' اسے یوں دیکھتا پا کر وہ نظریں چرا گئی اور [...]ر نکل گئی۔ جگنو کپڑے بدلنے کے بجائے اوپر گئی۔ بڑی امی اسے گلے لگ کر رونے لگیں۔

''مجھے ضرغام سے یہ امید نہیں تھی۔

''مجھے بھی نہیں تھی۔''

''وہ پچھتائے گا۔''

''خدا نہ کرے۔'' وہ بے اختیار بولی۔ ''ایسی باتیں مت کریں بڑی امی۔ یہ تقدیر کا فیصلہ ہے۔''

مگر ان کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ وہ کچھ بے زار سی ہو کر نیچے آ گئی۔

سب لوگ نجانے کن سرگرمیوں میں مصروف تھے آزر ابھی آفس سے نہیں آیا تھا۔ وہ [...]سان کاریڈور میں ٹہلتی رہی۔ بارش رک گئی تھی۔

''تم نے تو کہا تھا۔ واپس آؤں گا تو وجہ تم ہو گی جگنو۔''

سوچ کے زاویے پھر بھٹک کر اس پر جا رکے تھے۔ وہ اکتا کر باغ کی طرف نکل آئی۔ سونو [...]جانے کہاں تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنے لگی۔

تب ہی بھیگی رت میں مدھم سر بکھرے تھے۔ وہ ٹھٹک گئی۔

وہ آہستگی سے چلتی ہوئی ندی کنارے آئی۔ چھوٹے چھوٹے پھول نہا کر کچھ اور نکھر آئے [...]تھے۔ درختوں کی شاخوں سے پانی کے قطرے پھسل پھسل کر پانی میں گر رہے تھے۔ وہیں درخت [...]کے پاس ٹیک لگائے ایک گھٹنا موڑے اس پر گٹار ٹکائے گاتا ضرغام ایک لمحے کو تو اسے وہم ہی [...]ا۔ وہ قدم قدم چلتی اس کے سامنے آئی۔ یہ خواب ہے یا حقیقت۔

''تم کب آئے؟'' کچھ لمحے اس کی بند آنکھوں کو دیکھنے کے بعد اس نے آہستگی سے

پوچھا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

''میں گیا کب تھا۔ میں صدیوں سے یہیں ہوں تمہارے پاس۔''

''پہلے اعتبار کر لیتی تھی ان باتوں کا'' وہ افسردگی سے مسکرائی۔

''اب' اب کیوں نہیں؟'' ضرغام کے لہجے میں بے تابی در آئی۔

''اعتبار کوئی شیشے کا گلاس نہیں جو ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو اور سب کو نظر آئے کبھی کبھی ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا اور۔'' وہ بدگمان تھی۔

''تم نے مجھے اپنی منگنی پر نہیں بلایا۔'' اس نے اچانک سوال کیا تھا۔ جگنو لب کاٹ کر رہ گئی۔

(یا خدا یہ شخص اب کیوں لوٹا ہے)

''آزر نے بلایا ہے مجھے۔'' وہ اس کے مضمحل سراپے کو نگاہوں کی گرفت میں لے کر بولا۔

جگنو نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر پلٹ گئی۔

''جانتی ہو اس نے کیا کہا تھا۔'' وہ وہیں کھڑا تھا۔

''اس نے کہا تھا محبت اور شہرت مین سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ تب میں نے' میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ میری اولین چاہت کون ہے؟'' وہ ایک لمحے کو ساکت ہوئی پھر پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

''فیصلہ کیا ہوا؟''

''کیا میرا یہاں آنا فیصلہ نہیں۔ برسوں پہلے ایک رات محض تمہیں کھو دینے کا احساس ہوا تھا اور مجھے لگا میری زندگی ختم ہوگئی۔ تمہیں کھو دیتا تو زندہ کیسے رہتا۔'' وہ آنکھوں میں محبت کی قندیلیں جلائے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم۔'' وہ بے اختیار دونوں میں چہرہ ڈھانپ کر آنسو روکنے کی سعی کرنے لگی۔

''جگنو خفا ہونا مجھ سے۔'' وہ اس کے قریب آیا۔ دھیرے سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔

''ہاں تم نے میرے بہت سے گیت پہلے دوسروں کو سنا دیئے۔'' اس نے ساتھ ہی وجہ بتائی۔ اندر کہیں اطمینان اور سکون کی بارش ہوئی تھی۔

''وہ تمہارے لئے نہیں تھے۔ آؤ تمہیں تمہارا گیت سناؤں۔''

ساون رت مہک رہی تھی۔ وہ اسے نئے گیت سنا رہا تھا جو خاص اس کیلئے لکھے گئے تھے اور وہ پھول چنتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ آزر نے دیکھا تو ایمانداری سے سوچا تھا۔

اس کہانی کا انجام یہی ہونا چاہئے تھا۔

وہ اس کا ساون تھا۔ کسی اور دھرتی پر کیسے برس جاتا۔

* * *